مجموعہ خطبات

اجزائے ایمان

مکمّل

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ادارہ منہاج القرآن

۳۶۵/ ایم، ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

Marfat.com

مجموعۂ خطبات

اجزائے ایمان

(مکمّل)

جمیل احمد شرقپوری نقشبندی مجددی
لاہور پاکستان

پروفیسر ڈاکٹر محمّد طاہرُالقادِری

ادارہ منہاج القرآن
۳۶۵ - ایم ماڈل ٹاؤن - لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

87354

نام کتاب ______ اجزائے ایمان (مکمل)
خطبات ______ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین ______ جاوید القادری، حافظ محمد خان قادری
صفحات ______ ۴۸۰
اشاعتِ اوّل ______ اپریل ۱۹۸۵ء
اشاعتِ دوم ______ اپریل ۱۹۸۶ء
اشاعتِ سوم ______ فروری ۱۹۸۷ء
طابع ______ المطبعۃ العربیۃ، لاہور
قیمت ______ ۶۰ روپے

نوٹ : پروفیسر صاحب کی تمام تصانیف اور خطابات و تقاریر کے ریکارڈ شدہ کیسٹوں سے حاصل ہونیوالی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے ادارہ منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

جاوید القادری
ناظم شعبہ نشر و اشاعت

Marfat.com

ذخیرہ
جمیل احمد شرقپوری نقشبندی
لاہور پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ
مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْكَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ
وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

Marfat.com

حکومت پنجاب کے مراسلہ نمبر

NO. S-O. (P.I.) 4-1/80. P-IV. 31st July 1984

کے مطابق ہماری تمام کتب پنجاب کے سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کیلئے

سرکاری طور پر منظور شدہ ہیں -

Marfat.com

حصّہ اوّل

(ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، ایمان بالآخرۃ)

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مضامین

Marfat.com

Marfat.com

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	نابغۂ عصر	۱۵
	ایمان باللہ	۴۲
	باب اوّل ـــــ ایمان باللہ اور اسکے تقاضے	۴۵
	ایمان باللہ کا مفہوم	۴۸
	ایمان باللہ کے تقاضے	۴۸
	ایمان باللہ کا پہلا تقاضا ـــــ محبتِ الٰہی	۴۹
	شرائطِ محبت	۵۴
	پہلی شرط ـــــ کثرتِ ذکرِ محبوب	۵۴
	دوسری شرط ـــــ آزمائش پر صبر	۵۸
	تیسری شرط ـــــ انقطاع از ماسوئی المحبوب	۶۱
	جوابِ محبت	۶۳
	مُحب اور محبوب میں فرق	۶۵
	ایمان باللہ کا دوسرا تقاضا ـــــ اطاعتِ الٰہی	۶۸
	محبت اور اطاعت کا باہمی ربط	۶۸
	محبوب کی اطاعت ہی کامل محبت کی دلیل ہوتی ہے۔	۶۹

Marfat.com

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	مقصدِ نزولِ احکام	۷۱
	عائلی زندگی	۷۲
	ایفائے عہد	۷۲
	اکلِ حلال کا حکم	۷۳
	فضلِ خداوندی کی تلاش	۷۴
	قائم اللیل اور صائم النہار کو حضورؐ کا حکم	۷۵
	عمل میں ترجیحات کے تعین کا فلسفہ	۷۷
	اسلام کا تصورِ عبادت	۷۷
	ایک مغالطے کا ازالہ	۷۸
	یقین کا اصل مفہوم	۷۸
	یقین کا آخری نقطہ	۷۸
	رہبانیت کی نفی	۸۰
	آیۂ مبارکہ کا صحیح مفہوم	۸۱
	اصلی اور حقیقی عبادت کیا ہے ؟	۸۲
	حاکم کی سب سے بڑی عبادت	۸۳
	اطاعتِ الٰہی کا ثمر	۸۷
	شیخ محمد شربینی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۸۷
	سیدّنا شیخ عبدالقادر جیلانی کا قول	۸۹
	● ایمان باللہ کا تیسرا تقاضا ـــــ توکّل علی اللہ	۹۲

Marfat.com

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۹۴	**توکل کی حقیقت**	
۹۵	ربِّ کائنات کا مفہوم	
۹۸	ارتقائے کائنات کا قرآنی نظریہ	
۹۸	وکیل کا مفہوم	
۱۰۰	متوکلین کا درجہ	
۱۰۳	توکل کے غلط تصورات اور ان کے غلط نتائج	
۱۰۴	جدوجہد کی تلقین	
۱۰۵	ایک سائل اور حضرت عمر فاروق رض	
۱۰۷	مولانا روم ؒ کی بیان کردہ ایک تمثیل	
۱۱۰	انبیاء علیہم السلام اور طلبِ اسباب	
۱۱۴	شیخ عبدالقادر جیلانی ؒ اور خلیفہ مستنجد باللہ	
۱۱۹	**ایمان بالرسالت**	
۱۲۱	باب دوم —— نظامِ رسالت اور اسکی ضرورت	۲
۱۲۳	ایمان بالرسالت کے سلسلے میں دو بنیادی مباحث	
۱۲۳	۱۔ اسلام کا تصورِ رسالت	
۱۲۵	عمومیتِ رسالت	
۱۲۵	ایک نبی ایک قوم	
۱۲۷	ایک نبی اور کل کائنات	

Marfat.com

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۲۹	ب۔ ضرورتِ رسالت	
۱۲۹	ضرورتِ رسالت کی چار جہتیں	
۱۲۹	(۱) انسان کا مقصدِ تخلیق اور ضرورتِ رسالت	
۱۳۲	سائنس اور اسلام	
۱۳۲	مقصدِ تخلیقِ کائنات	
۱۳۳	مقصدِ تخلیق اور رسالت	
۱۳۵	(۲) نسلِ انسانی کی جوابدہی کا تصور اور ضرورتِ رسالت	
۱۳۵	تکمیلِ حوائج	
۱۳۹	(۳) انسانی علم کی کم مائیگی اور ضرورتِ رسالت	
۱۴۰	ذرائع علم کی اقسام	
۱۴۰	ا۔ حواسِ خمسہ ظاہری	
۱۴۱	حواسِ خمسہ کا ایک دوسرے کی جگہ لینا محال ہے	
۱۴۲	حواسِ ظاہری کا دائرہ محدود ہے	
۱۴۳	مولانا روم کا بیان کردہ واقعہ	
۱۴۴	انسانی جسم میں عقل کی حیثیت	
۱۴۵	تحصیلِ علم میں عقل کا کردار	
۱۴۶	ب۔ حواسِ خمسہ باطنی	
۱۴۶	۱۔ حسِ مشترک	
۱۴۷	۲۔ حسِ خیال	

Marfat.com

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۴۷	۳۔ حس واہمہ	
۱۴۷	۴۔ حس حافظہ	
۱۴۷	۵۔ حس متصرفہ	
۱۴۹	انسان اور اس کی بساطِ علم	
۱۵۱	ج۔ وجدان اور اس کے لطائف	
۱۵۲	علومِ نبوت کا فیضان	
۱۵۳	مقصدِ رسالت و نبوت	
۱۵۴	ذرائع انسانی سے حاصل شدہ علم میں غلطی کا امکان	
۱۵۵	سائنسی علوم و اکتشافات کی حقیقت	
۱۵۶	سائنس اور مذہب کی مطابقت	
۱۵۸	خلاصۂ کلام	
۱۵۹	مسلمان سائنس دانوں کے لیے لمحۂ فکریہ	
۱۵۹	(۴) انسانی عمل کی تکمیل اور ضرورتِ رسالت	
۱۶۰	علومِ نبوت کے عطا کیے جانے کی غرض و غایت	
۱۶۲	بعثتِ انبیاء کی غرض و غایت	
۱۶۳	اطاعت و اتباع میں امتیاز	
۱۶۴	لفظِ اتباع کے مفہوم میں مغالطہ	
۱۶۵	صرف اتباعِ رسول کیوں ؟	
۱۶۸	حکم اور اس کا مفہوم	

Marfat.com

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۷۰	ایک لطیف علمی نکتہ	
۱۷۳	صلوٰۃ بمعنیٰ دُعا	
۱۷۴	زمانۂ جاہلیت کی نماز	
۱۷۴	حج کا حکم اور طریقِ رسالت	
۱۷۵	نماز کی رکعتیں بھول جانے کا واقعہ	
۱۷۶	نماز میں بھول جانے کا مسئلہ	
۱۷۷	نماز میں حضورؐ کے بلانے کا مسئلہ	
۱۷۸	*سنتِ مصطفویؐ کی روشنی میں منشاء ایزدی کی تکمیل کی عملی مثالیں	
۱۷۸	عدل بین الازواج کا حکم اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل	
۱۷۹	مخلوق پر رحم کرنے کا حکم اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل	
۱۸۰	سچ بولنے کا حکم اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل	
۱۸۰	ایفائے عہد کا حکم اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل	
۱۸۱	سادہ زندگی کا حکم اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل	
۱۸۲	محنت و مساوات کا حکم اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل	
۱۸۵	**باب سوئم —— ایمان بالرسالت کے تقاضے**	۳
۱۸۷	ایمان بالرسالت کے چار تقاضے	
۱۸۹	۱۔ محبتِ رسول صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	
۱۹۲	۲۔ تعظیمِ رسول صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	

Marfat.com

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۹۶	۳۔ نصرتِ رسول صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	
۱۹۷	۴۔ اطاعتِ رسول صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	
۱۹۹	**ایمان بالآخرت**	
۲۰۱	**باب چہارم —— ایمان بالآخرت اور اسکی حقیقت**	۴
۲۰۳	ایمان بالآخرت کی حقیقت	
۲۰۵	دو موتیں	
۲۰۵	دو زندگیاں	
۲۰۶	ایمان بالآخرت اور اس کے اجزا	
۲۰۶	۱۔ بعث بعد الموت	
۲۰۷	۲۔ شعورِ عینیت	
۲۰۷	۳۔ جواب دہی اور جرم وسزا	
۲۰۷	ایمان بالآخرت کے اجزا اور قرآنی استدلال	
۲۰۷	۱۔ بعث بعد الموت اور قرآنی استدلال	
۲۰۸	۲۔ شعورِ عینیت اور قرآنی استدلال	
۲۱۱	۳۔ جزا و سزا کا تصور اور قرآنی استدلال	
۲۱۲	ایمان بالآخرت کی اہمیت	
۲۱۳	اُخروی زندگی کے بارے میں چند اشکالات	
۲۱۵	ازالۂ شبہات اور شعورِ عینیت کا تصور	

Marfat.com

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۲۱۶	شعورِ عینیت کی ایک مثال	
۲۱۷	قبر میں دفنائے جانے والے شخص کی حالت	
۲۱۸	قبر اور برزخ کا حقیقی مفہوم	
۲۱۹	شعورِ عینیت کی انسانی زندگی میں اہمیت	
۲۲۰	اعمال نامے تھمائے جانے کا تصور	
۲۲۱	اسی جسم سے زندہ کیا جانا	
۲۲۳	**بابِ پنجم —— ایمان بالآخرت اور قرآنی استدلال**	۵
۲۲۵	ارتقائے حیات کا قرآنی تصور اور عقیدۂ آخرت	
۲۲۶	کائنات کے تخلیقی مراحل	
۲۲۶	حرفِ کُن سے پہلے کیا تھا	
۲۲۷	اس اشکال کا صحیح جواب	
۲۲۸	سائنس کا نظریہ	
۲۳۱	عالمِ غیر نامی سے عالمِ نامی کی طرف	
۲۳۱	عالمِ نامی کے اوصاف	
۲۳۲	عالمِ حیوانات کی تخلیق	
۲۳۳	عالمِ انسانی کی تخلیق	
۲۳۴	انسانی زندگی میں پیش آنے والے مرحلے	
۲۳۶	حیاتِ کائنات معرضِ ارتقاء میں ہے	

Marfat.com

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۲۳۸	• نظامِ کائنات کی بقا اور تصورِ آخرت	
۲۴۳	• قانون مکافاتِ عمل اور عقیدۂ آخرت	
۲۴۶	ایک لطیف علمی نکتہ	
۲۴۷	حیات بعد الموت کی خصوصیت	
۲۴۹	زندگی کی طرح موت کی بھی تخلیق ہوئی ہے۔	
۲۴۹	عقیدۂ آخرت کا انسانی سیرت پر اثر	
۲۵۰	یقین کے معنی و مقصود	
۲۵۱	انسان کے اخلاقی کمال کی تکمیل	

Marfat.com

Marfat.com

نابغۂ عصر

Marfat.com

87354

~~60859~~

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک شخصیت جس نے تمام متداولہ دینی علوم و فنون مثلاً قرآن و حدیث، فقہ و اصول، منطق و فلسفہ، تصوف و طریقت، طب مغربی اور طب مشرقی اور عربی، فارسی اور اردو ادب کی تکمیل کے لیے دُور دراز کے سفر کیے۔ اسے تحصیل علم و عرفان کا ذوق جھنگ سے لکھنؤ، حیدر آباد دکن، دلی، شام، شرق اردن، بغداد اور مدینہ منورہ تک لے گیا۔ اس کے دل و دماغ پر اُمتِ مسلمہ کے سیاسی، مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی زوال و ابتلا کا گہرا اثر تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اُمت کے عروقِ مردہ میں نئی زندگی پیدا ہو، اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام دنیا میں برگ و بار پیدا کرے اور قرآنی تعلیمات کے ذریعے فکری و عملی انقلاب کی ایسی راہ ہموار کی جائے جس کے اثرات انمٹ ہوں اور برکات لامتناہی۔

اس شخصیت نے ملی منفعت کو ذاتی معاملات پر ہمیشہ مقدم رکھا تھا اور خواہشات کا سائبان ہمیشہ اجتماعی پہلو کے لیے تانا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو دین کی تبلیغ اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ چنانچہ جب اس عظیم شخصیت نے مقامِ ملتزم (خانہ کعبہ) پر کھڑے ہو کر زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ذات کے حوالے سے کچھ مانگا تو اُس میں بھی دنیائے اسلام ہی کی بہتری کا خیال کارفرما تھا۔ اس نے بارگاہ خداوندی میں اپنا درد پیش کیا تو اس کے علاج میں بھی مسلمانوں کے اجتماعی دُکھوں کا مداوا چاہا۔ اس نے اپنی خواہش کو زبان دی تو وہ بھی اسلام ہی کے احیاء و فروغ کی دُعا بن گئی۔ یہ تھے حضرت ڈاکٹر فرید الدین قادریؒ جنہیں ۱۹۴۸ء میں سرزمین بغداد و نجف کی زیارت کے بعد حرمِ کعبہ اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری کا پہلا موقع نصیب ہوا تھا۔ رات کے پچھلے پہر میں طوافِ کعبہ کے بعد مقامِ ملتزم پر غلافِ کعبہ کو تھامتے ہوئے آنسوؤں کی برسات میں ان کی زبان سے یہ دُعا نکل رہی تھی۔

"باری تعالیٰ ایسا بچہ عطا کر، جو تیری اور تیرے دین کی معرفت کا حامل ہو، جو دنیا اور آخرت میں تیری بے پناہ عطا و رضا کا حقدار ٹھہرے اور فیضانِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بہرہ ور ہو کر دُنیائے اسلام میں ایسے علمی و فکری اور اخلاقی و روحانی انقلاب کا داعی ہو، جس سے ایک عالم متمتع ہو سکے۔"

Marfat.com

دل کی گہرائیوں سے برآمد ہونے والی اس دُعا کے نتیجے میں خود فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے طاہر کے تولد کی بشارت دی۔ حضورؐ کا کرم تو ان پر پہلی بار نہیں ہُوا تھا مگر کرم کی یہ صورت بے نظیر تھی کہ قبولیتِ دُعا کی خوشخبری دی اور نام بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تجویز فرمایا۔ اس لطف و عنایت پر سائل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا کہ "طاہر جونہی سن شعور کو پہنچے گا اسے آپ کی خدمت پیش کروں گا۔"

والدِ گرامی حضرت علامہ فریدالدین قادریؒ ۱۹۱۸ء میں جھنگ میں پیدا ہُوئے۔ ابتدائی تعلیم پہلے جھنگ میں اور بعد میں سیالکوٹ میں حاصل کی۔ دین و ادب اور طب کی ساری تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ طبیہ کالج لکھنؤ میں شفاء الملک حکیم عبدالحلیم لکھنوی اور دہلی میں حکیم نابینا انصاری سے تلمذ رہا۔ لکھنؤ، حیدر آباد دکن اور دہلی سے طبِ یُونانی میں تخصص کیا۔ لکھنؤ میں ہی شکیل مینائی سے اُردو ادب اور شاعری میں استفادہ کرتے رہے۔ اور دینی علوم کی تکمیل دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ سے کی۔

ڈاکٹر صاحبؒ عدیم المثال خطیب، بلند پایہ عالم دین اور جلیل القدر طبیب تھے۔ تصوّف اور روحانیت سے خصوصی شغف تھا۔ بغداد شریف میں نقیب الاشراف سیدنا شیخ ابراہیم سیف الدین الگیلانیؒ سے روحانی فیض حاصل کیا۔ برصغیر میں فقیہہ اعظم مولانا محمد یوسف سیالکوٹی، شیخ الحدیث حضرت مولانا سردار احمد محدث لائلپوری اور حضرت مولانا ابوالبرکات سید احمد قادری (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے اکتساب علم کیا۔ علاوہ ازیں بغداد اور دمشق (شام) کے جلیل القدر علماء سے بھی کسبِ فیض کیا۔ بالخصوص شیخ محمد المکی الکتانیؒ رئیس رابطہ علماء شام سے شیخ اکبر کی فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کا درس لیا۔ مدینہ طیبہ میں مولانا عبدالشکور المہاجر المدنیؒ سے آپ کو حدیث میں خصوصی تلمذ تھا۔ آپ کی وفات ۲ نومبر ۱۹۷۴ء کو جھنگ صدر میں ہوئی۔

علامہ فریدالدین قادریؒ کو منامِ محترم پر جو بشارت دی گئی تھی ۱۹ فروری ۱۹۵۱ء کو اس کی عملی شکل نے جنم لیا۔ آپ کے ہاں لڑکا پیدا ہُوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "طاہر" فرمایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کا اضافہ کرکے "محمد طاہر" نام رکھا۔

تعلیمی زندگی محمد طاہر نے اپنی تعلیمی زندگی کا آغاز سیکرڈ ہارٹ سکول جھنگ صدر سے کیا۔ سکول، کالج اور یونیورسٹی کے تمام امتحانات اعلیٰ فرسٹ ڈویژن میں پاس کئے۔ ایم اے (اسلامیات) میں پنجاب یونیورسٹی میں اوّل آئے۔ اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ان کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا تو علامہ فریدالدین قادری نے خصوصی توجہات کے ساتھ بے پناہ شفقت کے زیر اثر تربیت کی۔ ۱۹۷۴ء میں تمام دینی اور دُنیوی علوم کی تکمیل ہوگئی۔ تربیت کی بنیادی جہتیں مکمل ہوگئیں تو ۲ نومبر ۱۹۷۴ء کو والدِ گرامی کا وصال ہوگیا۔ محمد طاہر جو ۱۹۶۶ء میں حضرت سیدنا الشیخ طاہر علاؤالدین الگیلانی القادری مدظلہ سے رُوحانی نسبت کے باعث محمد طاہر القادری ہوگئے تھے، ان کی عملی زندگی اُن کے والدِ گرامی نہ دیکھ سکے۔

جناب محمد طاہر القادری نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (اسلامیات) کے بعد ایل ایل بی کیا۔ پنجاب

Marfat.com

پبلک سروس کمیشن سے منتخب ہوکر ۱۹۷۴ء کے اواخر میں گورنمنٹ کالج عیسیٰ خیل (ضلع میانوالی) میں اسلامیات کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس سے پہلے گورنمنٹ کالج جھنگ میں چھ ماہ تک علوم اسلامیہ کے عارضی استاد کی حیثیت سے پڑھاتے رہے تھے۔

دو چھوٹے بھائیوں اور ہمشیرگان کی موجودگی میں تمام گھریلو ذمہ داریاں آپ کے سر آ پڑی تھیں۔ آپ نے جھنگ یا گرد و نواح میں ٹرانسفر کی کوشش کی تو اس مقصد کے لیے رشوت طلب کی گئی جو آپ کے مزاج کے منافی اور تربیت کے خلاف تھی۔ چنانچہ آپ محکمہ تعلیم کی ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور دو سال تک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے جھنگ میں پریکٹس کرتے رہے۔

محترم محمد طاہر القادری شروع سے ہی جس مقصد کو متاعِ حیات سمجھتے تھے وہ ایسا ہمہ گیر اسلامی انقلاب ہے جس سے پورا عالمِ اسلام متحد اور منظم ہوکر "مسلم بلاک" کی صورت اختیار کرے اور حق کی خاطر طاغوتی اور استحصالی طاقتوں سے ٹکرا کر اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرا سکے۔ آپ کے چھوٹے بھائی محمد جاوید قادری نے قرآن پاک پر حلف اٹھایا تھا کہ اس مقصد میں اپنے بھائی کے دست و بازو بنیں گے۔ مگر انہوں نے اپنے جلیل القدر والد کے ارتحال کے ڈیڑھ سال بعد بطور ایسوسی ایٹ انجینئر اپنی تعلیم مکمل کی ہی تھی کہ نتیجے سے پہلے ان کا وصال ہوگیا۔ محمد طاہر القادری آج تک راہِ حق کی منزلوں میں بادیہ پیمائی کے دوران اس پرعزم بھائی کی کمی محسوس کرتے ہیں۔

تمام گھریلو معاملات اور ہمشیرگان کی شادیوں سے فراغت کے بعد اپریل ۱۹۷۸ء میں آپ اسلامک لاء کے لیکچرار کے طور پر یونیورسٹی لاء کالج لاہور کے ساتھ منسلک ہوگئے اور طلبا کو اپنی خداداد صلاحیتوں اور علم و دانش سے مستفید کرنے لگے۔ آپ کی باقاعدہ تعلیمی تکمیل کا آخری مرحلہ اسلامک لاء میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) تھا جس کا تحقیقی کام آپ نے
"PUNISHMENTS IN ISLAM, THEIR CLASSIFICATION AND PHILOSOPHY"
کے زیر عنوان پنجاب یونیورسٹی کو پیش کیا۔ جس پر یونیورسٹی نے اپریل ۱۹۸۶ء میں آپ کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دے دی ہے۔

بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری

جناب محمد طاہر القادری آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے کہ والدین کی معیت میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے۔ حرمین شریفین کی یہ حاضری معمولی حاضری نہ تھی بلکہ سرکار دوجہاں نے خود ان کے والد گرامی کو خواب میں حکم دیا تھا کہ طاہر کو ہمارے پاس لاؤ۔ اس ارشاد کی تعمیل میں ۱۹۶۳ء میں انہیں بارگاہِ رسالت مآب میں پیش کیا گیا اور اس طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں خود بلا کر اپنے لطف و کرم اور خصوصی فیضان سے نوازا۔

محمد طاہر نامی اس تیرہ سالہ نوجوان کی بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ حاضری کس قدر عجیب تھی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بلانے کا مقصد پورا ہونے کی بشارت بھی خود ہی مرحمت فرما دی۔

"محمد طاہر کو دودھ کا بھرا ہوا ایک مٹکا عطا کیا اور اسے ہر ایک میں تقسیم کرنے کا حکم صادر فرمایا"

Marfat.com

یہ حاضری کی مکمل قبولیت اور اپنی خصوصی عنایات و نوازشات کی خوشخبری تھی۔

دینی تعلیم

مدینہ طیبہ کے زمانۂ قیام میں جناب محمد طاہر القادری کو عالمِ اسلام کی معروف رُوحانی شخصیت جناب مولانا ضیاء الدین قادری مہاجر مدنی علیہ الرحمۃ کی خدمت میں تبرکاً زانوئے تلمذ تہ کرنے کا موقع ملا اور وہیں سے آپ کی دینی تعلیم کا آغاز ہُوا۔ آپ نے صَرف، نحو، فقہ، اصُول فقہ، منطق، فلسفہ، معانی اور عربی ادب کی ابتدائی کتب اپنے والدِ محترم سے پڑھیں۔ اس کے بعد جامعہ قطبیہ رضویہ جھنگ میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک مختلف اوقات میں استاذ العلماء حضرت علامہ عبدالرشید رضوی مدظلہ سے اکتسابِ علم کیا۔ مولانا عبدالرشید رضوی دوپہر اور عصر کے مختصر وقفوں کے ساتھ صبح تین بجے سے رات گیارہ بجے تک آپ کو پڑھاتے تھے۔ محمد طاہر القادری کی تعلیم و تدریس کے دوران وہ تمام دوسرے طلباء کے اسباق معطل اور دیگر مصروفیات ترک کر دیتے تھے۔ روزانہ ۸، ۹ فنون کے اسباق ہوتے تھے۔

موقوف علیہ تک فقہ، حدیث، تفسیر اور معقولات و منقولات کے جملہ فنون میں درسِ نظامی کی تعلیم کے بعد علوم دینیہ متداولہ کی تکمیل اور دورۂ حدیث آپ نے اپنے والدِ معظم سے کیا۔ درسیات کے جملہ فنون انہی دونوں گرامی قدر اساتذہ سے پڑھے۔ مدینہ طیبہ میں کے قیام کے دوران میں مدرسۃ العلوم الشرعیہ میں والدِ گرامی کی معرفت بھی کچھ اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا۔ بعد ازاں لاہور کے زمانۂ قیام میں حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری کے درسِ حدیث میں بھی شریک ہوتے رہے۔ پاکستان کے نامور عالمِ دین "غزالیٔ دوراں" حضرت سید احمد سعید کاظمی مدظلہ نے پروفیسر صاحب کی دینی قابلیت اور علمی استعداد و بصیرت کے پیشِ نظر طریقۂ محدثین پر آپ کو سندِ حدیث عطا کی۔ آپ نے اسلامی فلسفہ مفکرِ اسلام حضرت ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مدظلہ سے پڑھا۔ اُن سے خصوصی تلمذ اور اکتسابِ فیض نے آپ کی فکری اور نظریاتی جہتوں کے تعین میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔

روحانی فیض

مسنون استخارے کے نتیجے میں جناب محمد طاہر القادری نے حضور سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کی روحانی ہدایت پر ۱۹۶۶ء میں حضرت سیدنا الشیخ طاہر علاؤ الدین الگیلانی القادری مدظلہ (جو سیدنا غوثِ اعظم کی اولادِ اطہار کے نقباء بغداد میں سے ہیں) سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت کی اور حضرت کی بے پایاں نوازشات اور توجہات سے اپنی روحانی تکمیل کا سامان کیا۔ آپ کو اپنے گرامی منزلت مُرشد سے جتنی عقیدت ہے اُس کے مظاہرے آپ کے ملنے والے بخوبی واقف ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دینی، علمی اور رُوحانی زندگی میں آپ کے شیخ طریقت مدظلہ العالی کی بے پایاں شفقت و عنایت اور خصوصی توجہات کا بڑا دخل ہے۔ بچپن سے آپ کے والدِ گرامی نے آپ کی تربیت ہی اس نہج پر کی تھی کہ بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور سرکارِ غوثیت مآبؓ سے آپ کا قلبی تعلق اور روحانی نسبت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جائے چنانچہ آپ ہمیشہ تشکر و امتنان کے طور پر اس امر کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ مجھے اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور لطف و احسان کے جس قدر بھی مظاہر دکھائی دیتے ہیں بلاشک و شبہ انہی نسبتوں کا صدقہ ہیں۔

Marfat.com

قومی وملی خدمات

پنجاب یونیورسٹی لا کالج سے منسلک ہونے کے بعد آپ بہت جلد یونیورسٹی سنڈیکیٹ سینیٹ اور اکیڈمک کونسل کے ممبر منتخب ہوگئے۔ اس طرح آپ نے ان اداروں میں بھی یونیورسٹی کے اساتذہ طلباء اور انتظامی عملے کے دلوں میں نمایاں جگہ پیدا کرلی اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔

اسی اثنا میں مرکزی وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے آپ کو قومی کمیٹی برائے نصابات اسلامی میں بطور ایکسپرٹ EXPERT نامزد کیا۔ جس میں آپ تاحال خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کو وفاقی شرعی عدالت پاکستان کا مشیر JURIS CONSULT بھی مقرر کیا۔ چنانچہ یہ عدالت بڑے اہم اور نازک مسائل میں آپ سے رہنمائی حاصل کر رہی ہے۔ جب وفاقی شرعی عدالت پاکستان نے ۱۹۸۱ء میں رجم کے حد ہونے سے انکار پر مبنی فیصلہ دیا تو حکومت پاکستان نے نظر ثانی کی اپیل کی۔ اس مرحلے پر پروفیسر محمد طاہر القادری نے مسلسل تین دن تک اس موضوع پر نہایت مدلل بحث کی اور سینکڑوں دلائل کے ساتھ رجم کا حد ہونا ثابت کیا۔ نتیجۃً وفاقی شرعی عدالت نے مورخہ ۲۰ جون ۱۹۸۲ء کو اپنا فیصلہ واپس لیتے ہوئے رجم کو حد تسلیم کرلیا۔ عدالت کا تفصیلی فیصلہ پی ایل ڈی ۱۹۸۳ء وفاقی شرعی عدالت صفحہ ۲۵۵ تا ۴۸۰ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ عدالت کے فاضل جج صاحبان نے اپنے فیصلے میں متعدد مقامات پر پروفیسر صاحب کی قابل قدر معاونت پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

اسی طرح جولائی اگست ۱۹۸۴ء میں حکومت پاکستان کے خلاف قادیانیوں کی طرف سے دائر کردہ درخواست کی سماعت کے دوران اسلام میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق اور ان کی مذہبی آزادی کی حدود کے موضوع پر قرآن و سنت کے بے شمار دلائل پر مشتمل آپ کی شاندار علمی بحث بھی تاریخی اہمیت کی حامل تھی جس کے نتیجے میں وفاقی شرعی عدالت پاکستان نے قادیانیوں کی درخواست مورخہ ۱۲/۸/۸۴ کو خارج کر دی اور فلسفہ ختم نبوت کی قانونی اہمیت روز روشن کی طرح آشکار ہوگئی۔ فاضل عدالت کے فیصلے کی تفصیلات پی ایل ڈی ۱۹۸۵ء وفاقی شرعی عدالت صفحات ۸ تا ۱۲۰ ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

مزید برآں نومبر ۱۹۸۵ء میں وفاقی شرعی عدالت پاکستان میں توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتکب کیلئے سزا کے تعین کے انتہائی نازک اور اہم قانونی مسئلے پر پروفیسر صاحب نے ۱۴ نومبر تا ۱۷ نومبر ۱۹۸۵ء مسلسل تین روز تک عدالت میں دلائل دیئے۔ جس میں آپ نے قرآن و سنت کے واضح دلائل سے یہ ثابت کیا کہ توہین رسالت کے مرتکب کی سزا موت ہے۔ اور یہ سزا بطور حد واجب ہوگی۔ توہین رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارتکاب ایسا بدترین جرم ہے جسے بالواسطہ یا بلاواسطہ ارادی یا غیر ارادی طور پر کسی صورت اور کسی درجے میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا یہاں تک کہ گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی توبہ بھی اسے سزائے موت کے نفاذ سے مستثنیٰ نہیں کرسکتی۔ پروفیسر صاحب نے سینکڑوں دلائل کے ذریعے اس امر پر زور دیا کہ اسلامی ریاست کے قانون میں کوئی ایسی گنجائش نہیں رہنے دی جانی چاہیئے جس سے کسی سطح پر بھی گستاخی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا رجحان راہ پا سکے۔ عظمت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

کے دفاع میں پروفیسر صاحب نے جس دل سوزی، کمال وارفتگی اور عشق مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مملو عدالت میں اپنے باطل شکن اور ایمان افروز دلائل پیش کئے ان کی یاد سے عدالت کے در و دیوار صدیوں معمور رہیں گے۔

۱۹۸۲ء کے اوائل میں حکومت پاکستان نے "اپیلیٹ شریعت بنچ سپریم کورٹ آف پاکستان قائم کیا۔ پروفیسر محمد طاہر القادری کو اس میں بھی مشیر فقہ JURIS CONSULT مقرر کیا گیا۔ آپ دیگر مصروفیات کے باوجود تاحال ان امور میں قومی اور ملی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

آپ کی ان قومی و ملی خدمات کے اعتراف کے طور پر کئی قومی اداروں اور تنظیموں نے آپ کو اعزازی تمغے بھی پیش کئے۔ شلاعیتہ کالج لاہور کی طرف سے "قریشی گولڈ میڈل" اور ادارۂ ثقافت پاکستان کی طرف سے تمغۂ ثقافت وغیرہ۔ یاد رہے کہ آپ کو زمانۂ طالب علمی میں بھی نمایاں علمی تحقیقی اور تقریری خدمات کے اعتراف میں طلائی تمغے ملتے رہے ہیں جن میں پنجاب یونیورسٹی گولڈ میڈل" اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پاکستان کی طرف سے طلائی تمغۂ قائداعظم" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یوں تو پروفیسر صاحب اندرون اور بیرون ملک عالمی سطح کی متعدد کانفرنسوں اور کانگرسوں میں شرکت کر چکے ہیں لیکن ماہ نومبر ۸۵ء میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے زیر اہتمام انٹرنیشنل قرآن کانگریس اور وفاقی حکومت کے تحت ہونے والی انٹرنیشنل سیرت کانفرنس اسلام آباد میں شرکت کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے تحت ہونے والی انٹرنیشنل قرآن کانگریس میں دنیا بھر سے دانشور اور علماء شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے پروفیسر صاحب نے اپنے انگریزی خطاب میں قرآنی تصور ہدایت (QURANIC CONCEPT OF GUIDANCE) پر گفتگو کی جس سے پورے ایوان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور جب خطاب ختم ہوا تو تمام مندوبین (جن میں سے ہر شخص عالمی شہرت کا حامل دانشور تھا) والہانہ طور پر پروفیسر صاحب سے ملے۔ انھوں نے انتہائی محبت بھرے انداز میں داد و تحسین پیش کی اور قرآن فہمی میں پاکستان کے نمایاں مقام کا اعتراف کیا۔ قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ امریکہ سے آئے ہوئے ایک وفد کے سربراہ اور مصری محقق پروفیسر عبدہٗ الخولی جو NORTHERN ILLINOIS UNIVERSITY میں سوشیالوجی کے پروفیسر ہیں، پروفیسر صاحب کے پاس آئے اور انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ میں قرآن کے تصور احسان پر ایک عرصہ سے تحقیق کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں میں نے عالم اسلام کے نامور علماء اور محققین سے رابطہ قائم کیا ہے لیکن آج تک مطمئن نہیں ہو سکا تھا۔ آج اللہ کا شکر ہے کہ آپ کے خطاب سے مجھ پر قرآن کا تصور احسان منکشف ہو گیا ہے اور میری زندگی بھر کی پیاس بجھ گئی ہے۔ یہ کہتے ہوئے موصوف نے پروفیسر صاحب کو "NORTHERN ILLINOIS UNIVERSITY" کی طرف سے فل پروفیسر شپ کی پیشکش کر دی اور کہا کہ یہ ہمارے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگا اگر آپ ہماری پیشکش قبول کریں۔ پروفیسر صاحب نے ان پر واضح کر دیا کہ

Marfat.com

وہ احیائے اسلام کے عالمگیر مشن کے لیے معروف عمل ہیں لہٰذا وہ اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک اس نوعیت کی کوئی مستقل پیشکش قبول نہیں کر سکتے۔ اس پر انھوں نے کہا کہ پھر ایک سال کے عرصے کے لیے ہی ہمارے پاس آ جائیے تاکہ ہماری یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہو جائے کہ آپ جیسے مقام و مرتبہ کا سکالر یہاں کے سٹاف میں شامل رہا ہے پروفیسر صاحب نے اس پر بھی اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اُن کے مسلسل اصرار پر بالآخر یہ طے پایا کہ پروفیسر صاحب کسی وقت مختصر دورانیے کے لیے امریکہ تشریف لے جائیں گے اور مذکورہ یونیورسٹی کے VISITING LECTURER کے طور پر لیکچر دیں گے۔ اس سے زیادہ وقت نکالنا ممکن نہیں۔

★ **ادارہ منہاج القرآن کا قیام** پروفیسر محمد طاہر القادری نے ۱۹۷۹ء میں محاذِ حریت کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اُن دنوں آپ جھنگ ڈسٹرکٹ کورٹ میں وکالت کر رہے تھے۔ اس تنظیم کے تحت دو سال تک سہ روزہ درسِ قرآن، نوجوانوں کی فکری اور نظریاتی تربیت اور علمی و فکری مجالس کا انعقاد ہوتا رہا اور محاذِ حریت کے چیئرمین جناب محمد طاہر القادری مختلف دینی موضوعات پر خطاب فرماتے رہے۔ ۱۹۸۰ء میں محاذ کے ارکان نے فیصلہ کیا کہ قرآن و سنت پر مبنی انقلابی فکر کی وسیع تر اشاعت کے لیے قادری صاحب لاہور منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ آپ لاہور منتقل ہو کر پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے بطور لیکچرار منسلک ہو گئے۔ کوئٹہ سے پشاور اور کراچی سے آزاد کشمیر تک تبلیغی دورے کیے۔ لوگوں کے دلوں کو عشقِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی لگن سے بہرہ ور کیا۔ اسلام کے احیاء کے لیے اذہان و قلوب کی زمین کو ہموار کرنا شروع کیا اور اسلام کے فکری اور عملی انقلاب کی جدوجہد کو عوام و خواص کی طلب بنا دینے کی فصل بو دی۔ اس ابتدائی کام کے بعد غلبۂ دینِ حق کی بحالی اور اُمتِ مسلمہ کے احیاء و اتحاد کے لیے اسلامی انقلاب کی عالمگیر جدوجہد کی خاطر آپ نے بعض دوستوں کے تعاون سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو ادارہ منہاج القرآن کی بنیاد رکھی، ہر سطح پر باطل طاغوتی استحصالی قوتوں اور ان کے اثر و نفوذ کے خاتمے کے لیے تگ و دو اس ادارے کا بنیادی مقصد قرار پائی۔

یہاں تحدیثِ نعمت کے طور پر ایک اور حقیقت کا تذکرہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ادارہ منہاج القرآن کے سیکرٹریٹ میں جب سے دفتری کام کا آغاز ہوا ہے اس میں زیرِ تکمیل لائبریری سے استفادے کا آغاز ہی عظمتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور ناموسِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تحفظ کے سلسلے میں ورق گردانی سے ہوا ہے جس کی ضرورت مذکورہ بالا وفاقی شرعی عدالت کے مقدمہ کے سلسلے میں پیش آئی اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ ادارے کے قیام کا مقصد ہی عظمتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا تحفظ اور عشق و اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج و اشاعت ہے۔ خود پروفیسر صاحب کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بھی اسی عظیم مقصد کے لیے وقف ہے۔

جب سے آپ نے لاہور اور کراچی تا پشاور پورے ملک میں اپنے دروس و خطابات کے ذریعے عشق و اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فروغ کی تحریک کا آغاز کیا ہے لاکھوں افراد کے بدلتے ہوئے حال دینی مجالس و محافل کی بحال ہوتی ہوئی رونقیں، جذب و شوق اور کیف و مستی کی لوٹتی ہوئی یادیں روشن دن

Marfat.com

کی طرح اس حقیقت کی مکمل تصدیق کر رہی ہیں۔ ہر آنکھ اس امر کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ ہر کان اس آواز کو سن رہا ہے اور ہر دل اس کیفیت کو محسوس کر رہا ہے۔ کوئی اس انقلاب کی آمد آمد کو پسند کرے یا ناپسند لیکن بفضلہٖ تعالیٰ صورتِ حال اب اتنی نکھر چکی ہے کہ اس واقعہ کا انکار ممکن نہیں رہا۔ بقول شخصے ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

اللہ رب العزت کا شکر ہے کہ ماضی کی اس یادِ رفتہ کو تازہ کرنا بھی ادارہ منہاج القرآن ہی کا مقدر ٹھہرا۔ بے شک یہی اس کا نعرہ ہے۔

؎ قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اُجالا کر دے

دینی تبلیغی اور علمی خدمات

سلسلۂ درسِ قرآن: مرکزی ادارہ منہاج القرآن کے زیرِ انتظام آپ نے ۱۹۸۰ء کے اواخر میں باقاعدہ سلسلہ وار درسِ قرآن کا آغاز کیا۔ جس میں ہزاروں کی تعداد میں عوام و خواص اور اہلِ علم لاہور بلکہ پنجاب بھر سے شرکت کرتے ہیں۔ اس طرح قرآنی تعلیمات کا پیغام ممکنہ حد تک مخلوقِ خدا تک پہنچ رہا ہے ساتھ ہی "منہاج القرآن" کے نام سے آپ کی زیرِ تالیف تفسیرِ قرآن کی سلسلہ وار اقساط عوام میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ اس طرح وہ بھی اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک شائقین کے علمی استفادہ کا باعث بن رہی ہیں۔

سلسلہ درسِ تصوف: مرکزی ادارہ منہاج القرآن ہی کے زیرِ انتظام آپ نے ۱۹۸۳ء میں باقاعدہ سلسلہ وار درسِ تصوف کا آغاز کیا جس کے ذریعے عوام و خواص، نوجوانانِ ملت، علماء و فضلاء، اساتذہ و مشائخ، تاجر، صنعتکار اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں افراد مستقل طور پر اپنی اخلاقی اور روحانی تربیت کا سامان کر رہے ہیں۔ اس طرح قادری صاحب کا تبلیغی و اصلاحی کام نہ صرف علمی بلکہ عملی اور روحانی اعتبار سے بھی قابلِ دید نتائج پیدا کر رہا ہے۔

سلسلہ خطبہ جمعہ: آپ نے جامع مسجد اتفاق کالونی" ماڈل ٹاؤن لاہور میں ۱۹۸۲ء کے اوائل میں باقاعدگی سے سلسلہ وار خطبۂ جمعہ کا آغاز کیا۔ جس کے فوراً بعد دیکھتے ہی دیکھتے سامعین کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ پنجاب اور مختلف اضلاع بلکہ پاکستان کے مختلف گوشوں سے ہزاروں افراد خطبۂ جمعہ سننے اور اپنے ایمان و عمل کی تازگی کا سامان حاصل کرنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔ اہلِ ذوق کی یہ رونق اللہ کے کرم سے مسلسل روز افزوں ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا ان تینوں مراکز سے ہزاروں فرزندانِ توحید بفضلہٖ تعالیٰ ایمان و استقامت، محبت و خشیتِ الٰہی، عشق و اطاعتِ رسولؐ، درد و سوز، کیف و مستی، عبادات و معاملات کی اصلاح، تزکیۂ نفس، جلائے باطن، تہذیبِ اخلاق، ایثار و قربانی، اخلاص اور حسنِ عمل کی دولت سے خود کو بہرہ ور کر رہے ہیں۔

کثیر تعداد میں افراد کی یہ ذہنی اور عملی تبدیلی کسی وقت ضرور انشاء اللہ معاشرے میں اسلامی اقدار کی بحالی

Marfat.com

کا سبب ثابت ہوگی۔ مزید برآں پاکستان ٹیلیوژن کے ذریعے ان کے درس قرآن کا ملک کے لاکھوں افراد تک پہنچنا، ملک کے دیگر اہم ادارں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری و غیر سرکاری دفاتر و مراکز میں آپ کے ایمان پرور اور انقلاب انگیز خطابات کا سلسلہ بھی آپ کے دینی و تبلیغی مشن کا حصّہ ہے۔

کراچی، پشاور، اسلام آباد اور کوئٹہ میں درس قرآن کا آغاز: الحمدللہ مارچ ۸۴ء سے کراچی، مئی ۱۹۸۵ء سے اسلام آباد، دسمبر ۱۹۸۵ء سے پشاور اور جولائی ۱۹۸۶ء سے کوئٹہ میں بھی سلسلہ وار درس قرآن کے مراکز کا قیام عمل میں آچکا ہے جہاں آپ کی محافل درس میں ان شہروں کے علاوہ دُور دراز سے لوگ جوق در جوق شریک ہوتے ہیں۔ یوں قرآنی فکر کے انوار ملک کے طول و عرض کو روشن کر رہے ہیں۔ اسی طرح آئندہ آپ کے پیشِ نظر آزاد کشمیر میں بھی ایسے ہی علمی تبلیغی اور تربیتی مراکز قائم کرنے کا منصوبہ ہے جس کا انشاء اللہ جلد ہی آغاز ہو جائے گا۔

خواتین کے مرکز درس کا قیام: معاشرے میں خواتین کے کردار کی اہمیت کے پیشِ نظر آپ نے ان کے لیے لاہور میں ایک الگ سلسلہ وار درس قرآن کا مرکز قائم کیا ہے جہاں کثرت کے ساتھ خواتین اسلامی تعلیمات سے اکتساب فیض کر کے اپنی ذہنی اور عملی تربیت کا سامان کرتی ہیں۔

جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن کا قیام: جنوری ۱۹۸۲ء میں آپ نے اتفاق برادرز (پاکستان) کے تعاون سے ایچ بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور میں اسلامی اور عصری تعلیمات کے فروغ کے لیے "اتفاق اسلامک اکیڈمی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس میں میٹرک پاس طلبہ کے لیے چھ سالہ کورس کے ذریعے گریجوایشن اور قدیم و جدید تقاضوں کے مطابق درسیات (درس نظامی) کی تکمیل کا کام کیا جاتا رہا ہے۔ اب بفضلہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کا یہ عظیم مرکز ماہ اگست ۱۹۸۶ء سے جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن کے نام سے ادارہ منہاج القرآن کے تحت منتقل کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں منہاج القرآن یونیورسٹی کے منصوبے پر عملدرآمد کا آغاز بھی ہو چکا ہے جس کے لیے ابتداءً تقریباً دو سو کنال رقبے پر مشتمل قطعہ اراضی حاصل کیا جا چکا ہے۔

بیرونی ممالک میں تبلیغی خدمات

۱ **دورۂ ایران:** ۱۹۸۲ء میں آپ حکومت ایران کی دعوت پر ہفتہ وحدت کی تقریبات میں شمولیت کیلئے ایران تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے تہران، قم اور مشہد مقدس میں مختلف مقامات پر خطاب کیا۔ جناب آیۃ اللہ خمینی، آیۃ اللہ منتظری، آیۃ اللہ مرعشی، آیۃ اللہ گل پائیگانی، وزیراعظم، صدر مملکت، حکومت ایران کے وزراء اور کئی دیگر اہم مذہبی و سیاسی رہنماؤں سے ملاقات کی اور مختلف علمی اور ملی موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا۔

۲ **دورۂ یورپ:** بیرون ملک تبلیغی خدمات کے سلسلے میں آپ کا ۱۹۸۴ء کا دورۂ یورپ نمایاں طور پر قابلِ ذکر ہے۔ آپ ناروے (اوسلو) میں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس (منعقدہ

Marfat.com

جولائی ۱۹۸۴ء میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے جہاں آپ نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے مشترکہ اجتماع میں اسلام اور عیسائیت کے موضوع پر ایک مبسوط، مدلل اور تقابلی خطاب کیا جس سے بڑے بڑے عیسائی عالم اور مبلغ صامت و ساقط ہو گئے۔ یہ تاریخی تقریر یورپ میں دعوت و فروغ اسلام کے لیے نہایت مؤثر ثابت ہوئی جس کے نتیجے میں آپ کو ڈنمارک کے مسلمانوں نے اپنی زیرِ نگرانی ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی دعوت دی اور یہ منصوبہ اب جنوری ۱۹۸۶ء میں بحمد للہ مکمل ہو گیا ہے۔

۳۔ متحدہ عرب امارات میں ادارہ منہاج القرآن کا قیام آپ نے ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۵ء میں ابوظہبی دوبئی، شارجہ اور دیگر عرب خلیجی ریاستوں کے بھرپور تبلیغی دورے کئے۔ جن کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے عرب امارات میں ادارہ منہاج القرآن کی بہت بڑی شاخ قائم ہو گئی ہے جو وہاں نہایت مؤثر طریقے سے احیائے اسلام اور اتحاد امت کے مشن کو آگے بڑھا رہی ہے

۴۔ ڈنمارک میں ادارہ منہاج القرآن کا قیام جنوری ۱۹۸۶ء میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ڈنمارک میں بھی ادارہ منہاج القرآن کی شاخ قائم ہو گئی ہے۔ جس کا افتتاح پروفیسر صاحب نے ۲۵ جنوری کو کوپن ہیگن کے مقام پر کیا۔ کوپن ہیگن میں ادارہ منہاج القرآن کے تحت ایک اسلامک سنٹر کا قیام بھی عمل میں لایا جا چکا ہے جس میں مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی فکری و عملی تربیت کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ جنوری ۱۹۸۶ء میں مذکورہ اسلامک سنٹر میں داخلہ لینے والے بچوں کی تعداد ۱۵۰ کے قریب پہنچ گئی ہے جس میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

۵ انگلستان میں مشن کا فروغ پروفیسر صاحب نے انگلستان کا پہلا تبلیغی دورہ مئی ۱۹۸۵ء اور دوسرا جنوری ۱۹۸۶ء میں کیا۔ ان دوروں میں آپ نے لندن، مانچسٹر، برمنگھم اور بوسٹن وغیرہ میں عظیم الشان اجتماعات سے خطاب کئے۔

امریکہ میں مشن کا فروغ اسی طرح پروفیسر صاحب نے اپریل ۸۶ء میں امریکہ کا دورہ کیا جہاں انہوں نے واشنگٹن، نیویارک، شکاگو اور دیگر مقامات پر خطاب کیے جو امریکہ میں ادارے کے فروغ کے سلسلے میں انتہائی اہم ثابت ہوئے ہیں

ایسے تمام بیرونی ممالک میں آپ کے خطبات، وڈیو کیسٹ، تصانیف اور تبلیغی لٹریچر مسلمانوں کے استفادہ کے لیے بدستور پہنچ رہا ہے اور اس سلسلے میں بیرونِ ملک رہنے والے احباب کا ادارے سے باقاعدہ رابطہ رہتا ہے

فکری ارتقاء پروفیسر صاحب کے زمانۂ طالب علمی کی تحریری یادداشتوں کی ورق گردانی سے آپ کے فکری رجحانات اور ان کی نشوونما کے بارے میں جو مفید معلومات سامنے آئی ہیں ان کا تذکرہ کئے بغیر آپ کا تعارف مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب یونیورسٹی کے زمانۂ طالب علمی میں جب آپ نے قومی مذہبی، معاشرتی سیاسی اور معاشی حالات پر نظر ڈالی تو ہر طرف بے یقینی، زوال، انتشار، بے انصافی اور ظلم و استحصال کا دور دورہ پایا۔ آپ نے معاشرے کی عملی زندگی میں کارفرما خود غرضانہ ذہنیت اور مفاد پرستانہ رجحانات کے

Marfat.com

کے اسباب و علل کا کھوج لگانا چاہا۔ یہ سوال ہر وقت آپ کے ذہن کو پریشان کرتا رہتا کہ ہم ذاتی مفاد کے تنگ حصار سے باہر کیوں نہیں نکلتے اور رویّہ خود غرضی ترک کیوں نہیں کرتے۔ قومی سطح پر بے حسی کا عالم یہ ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ بھی ذاتی اور گروہی وفاداریوں کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہماری درسگاہوں کی فضا اس قابل کیوں نہیں کہ وہ طلبہ کو فکری بلند پروازی عطا کر سکے۔ ہمارے نوجوان مذہبی و ملی تشخص اور انفرادیت کی اہمیت سے کیوں ناواقف ہیں۔ ان میں اپنے فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کو بین الاقوامی سطح پر فروغ دینے کی تڑپ کیوں نہیں!

اُمتِ مسلمہ اجتماعی سطح پر بے مقصدی اور عیش کوشی کا شکار کیوں ہے۔ آج مسلمان اپنے اندر باطل طاغوتی اور استحصالی طاقتوں سے ٹکر لینے کی جرأت کیوں نہیں رکھتے۔ وہ غالب مغربی اقوام کی اسلام دشمنی کے منظم منصوبوں اور عالمِ اسلام کو ذلیل و رسوا کرنے کی سازشوں سے بے خبر کیوں ہیں!؟

ملتِ اسلامیہ کے موجودہ عالمگیر زوال کو از سر نو عزت و عظمت میں کیونکر بدلا جا سکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

غرضیکہ اس نوعیت کے ان گنت سوالات تھے جو پروفیسر صاحب کے ذہن رسا کو ہمہ وقت اپنی جانب متوجہ کرتے رہتے تھے۔ ملتِ اسلامیہ کے احیا اور دینِ حق کی نشاۃ ثانیہ کی اس تڑپ نے آپ کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ جس معاشرے میں اسلامی اقدار اور اخلاقی فضائل کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہو وہاں ہر فرد اپنے جائز مفادات کو بھی خود غرضانہ اور منفی طرزِ عمل سے پورا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے لہٰذا جب تک سارا نظامِ معاشرت یکسر بدل کر اس نہج پر نہ آ جائے کہ خود غرضی اور بددیانتی کے ترک کرنے سے ہر فرد کے جائز حقوق اور مفادات از خود پورے ہونے لگیں اور دیانتداری زندگی کی دوڑ میں ناکامی کا باعث نہ رہے۔ اس وقت تک کوئی بھی ذاتی مفاد کے تنگ حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔ بصورتِ دیگر اس خود غرضانہ معاشرے میں کسی کو کسی سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ کوئی شخص ایثار و قربانی اور نفع بخشی و فیض رسانی کا رویّہ اپنانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ نتیجۃً معاشرے میں ہمیشہ اخوت و محبت کا یونہی فقدان رہے گا۔ معاشرہ غیر فطری حد تک معاشی تفاوت کا شکار رہے گا۔ اخلاقی قدریں مٹتی رہیں گی۔ بلکہ زندگی میں منفی اور غیر اخلاقی قدروں کو رفتہ رفتہ تقویت اور فروغ ملتا رہے گا۔ جب دینی اور رُوحانی اقدار کی گرفت زندگی پر باقی نہ رہے گی تو کچھ لوگ عیش و عشرت کے باعث اخلاق و مذہب سے دور ہو جائیں گے۔ کچھ معاشی پریشانیوں کے باعث اور کچھ آزاد روی و آزاد خیالی کے باعث۔ یوں معاشرہ مکمل طور پر لادینیت کی لپیٹ میں چلا جائے گا۔

آپ نے محسوس کیا کہ مذکورہ بالا منطقی عمل ہمارے معاشرے میں گزشتہ کئی برس سے جاری ہے اور بدقسمتی سے ہماری قیادت ان تباہ کن رجحانات سے جنگ کے لیے تیار نہیں ہے جب کہ یہ کام ایک ہمہ گیر انقلاب کے بغیر ممکن نہیں۔

چنانچہ آپ نے اسلام کا ایک ہمہ گیر انقلابی تحریک کی حیثیت سے مطالعہ شروع کیا۔ اس نقطۂ نظر سے جب آپ نے اسلامی لٹریچر کو کھنگالا تو یہ دیکھ کر از حد تعجب ہوا کہ بیشک اسلام کو ایک جامع اور مکمل نظامِ حیات کے طور پر تو شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے لیکن دین کے انقلابی اور تحریکی پہلو پر زیادہ غور و خوض نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان گزشتہ ادوار میں اسلام عالمگیر سطح پر غالب و فائق رہا اور اس کے عالمگیر احیا کے لیے خود اس

Marfat.com

کا ایک انقلابی تحریک ہونا بطور مضمون کے کبھی موضوع تحقیق نہیں بن سکا اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ جب آپ درس نظامی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایم اے کے سلسلے میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں داخل ہوئے تو برصغیر کے معروف مسلم فلسفی اور مفکر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ جن کی زیر تربیت آپ کے انقلابی فکر کی آبیاری ہوئی چنانچہ آپ ان فکری اعلگوں کے ساتھ بطور خاص امام غزالیؒ، مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے انقلابی افکار کی طرف متوجہ ہوتے دور جدید کے رہنماؤں میں سے جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، حسن البنا، علامہ رشید رضا اور مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہم کے انقلابی رجحانات اور تحریکات کا مطالعہ کیا۔ غیر مسلم مفکرین اور داعیان انقلاب میں سے کارل مارکس، فریڈرک اینجلز، لینن، سٹالن اور ماؤزے تنگ وغیرہ کی تصانیف کا بھی مطالعہ کیا۔ ان غیر مسلم اشتراکی داعیان انقلاب کے افکار کے مطالعہ سے آپ پر یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ ان کی تحریروں میں اپنے افکار اور فلسفۂ انقلاب کی جو خود اعتمادی، عزم کی پختگی نظریاتی خاصیت اور نتیجہ خیزی کا یقین پایا جاتا ہے عصر حاضر کے بیشتر اسلامی داعیان انقلاب کی تحریروں میں وہ بھی نظر نہیں آتا بلکہ اس تقابلی مشاہدے نے آپ کو مزید پریشان کیا کہ آج باطل کے مقابلے میں حق کے علمبردار اس قدر مایوسی، بے یقینی، نظریاتی التباس، فکری مرعوبیت اور ذہنی شکست خوردگی کا شکار ہو چکے ہیں کہ ان کی تمام تر مساعی کے نتائج اب صرف عقیدۂ آخرت میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور باطل سے دنیوی زندگی میں کامیاب ٹکر لینے کا تصور ناامیدی کی نذر ہو گیا ہے۔ اس فکری تناظر میں آپ نے ملت مصطفوی کی عظمت و سطوت اور اسلام کی پارینہ شان و شوکت کو بحال کرنے کے لیے عالمی انقلاب کو اپنا مطمح نظر اور مقصد زیست بنا لیا۔

فکری ارتقاء و نشو و نما کے اس سفر میں مولانا احمد رضا خانؒ اور علامہ اقبال کے افکار و خیالات نے آپ کو امت مسلمہ کے دینی و ملی تشخص اور اس کی بقا کے لیے نسبت مصطفوی کی پختگی کا درس دیا۔ آپ نے انقلابی زاویہ نگاہ سے قرآن و سنت کا از سر نو عمیق مطالعہ کیا اور قرآن مجید کا ایک منتخب انقلابی نصاب تیار کیا۔ اس انداز میں مطالعۂ قرآن سے آپ کے عزائم و بصیرت اور خیالات کو قوی و ملی سطح پر عالمگیر وسعت نصیب ہوئی جب کہ سنت و سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سے احیائے اسلام کی انقلابی جدوجہد کے لیے صحیح اور بے خطا خدوخال سامنے آئے۔

قرآن مجید نے بالآخر غلبہ دین حق کی بحالی کی حتمی و قطعی ضمانت مہیا کر دی اور یوں آپ نے احیائے اسلام کے لیے عالمگیر اور ہمہ گیر جدوجہد کا عزم کر لیا۔

چنانچہ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۷۲ء بمطابق ۱۴ جمادی الثانی ۱۳۹۲ھ بمقام دربار غوثیہ شارع الگیلانی کوئٹہ آپ نے زندگی کو وقف انقلاب کرنے کا حلف قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین القادری الگیلانی البغدادی مدظلہ العالی کے دست اقدس پر بصورت بیعت اٹھایا۔

Marfat.com

یوں آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ عملاً وقفِ انقلاب ہو گیا۔ اب یہی آپ کی زندگی کا مشن ہے اور یہی مقصدِ زیست۔

ذہنی و طبعی رُجحانات

پروفیسر محمد طاہر القادری راسخ العقیدہ حنفی المذہب ہونے کے باوجود جدید قانونی اقتصادی سیاسی اور بین الاقوامی مسائل میں قرآن و سنت کی روشنی میں اجتہاد کے قائل ہیں۔ آپ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ آئمہ متقدمین و متاخرین کی فقہی آراء کی روشنی میں اجتہادی کاوشیں جاری رہنی چاہئیں اگر تمام معاملات پر محض تقلیدہی مکمل طور پر حاوی و طاری رہی تو مسلمانوں کی علمی صلاحیتیں زنگ آلود ہو کر ناکارہ ہو جائیں گی۔ ملت کے احیاء اور اُمت کے عروقِ مردہ میں تازہ زندگی پیدا کرنے کے لیے اسلافِ اُمت اور آئمہ اسلام کی پیروی میں ان کے وضع کردہ اصولوں کے مطابق اجتہادی اور تخلیقی انداز میں علمی ارتقاء کا سلسلہ قائم رہنا چاہیے۔ پروفیسر محمد طاہر القادری کی قرآنی فکر اور فقہی و علمی سوچ کی نہج یہی ہے اور آپ اپنی تمام صلاحیتیں اسی مقصد کے حصول میں صرف کر رہے ہیں۔ آپ اُمتِ مسلمہ کے اتحاد کی سخت ضرورت محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ گروہی مسلکی یا فرقہ وارانہ نزاعات سے بلند ہوئے بغیر اسلام کے ہمہ گیر احیاء کا کام ممکن نہیں۔

آپ کا خیال ہے کہ مسلکی اور فقہی اختلافات عملاً ختم نہیں کئے جا سکتے لیکن انھیں وجہ نزاع بنانا درست نہیں۔ مزید برآں ہر شخص کو اپنے اپنے عقیدہ و مسلک پر سختی سے قائم رہنے کا پورا حق حاصل ہے۔ تاہم متفقہ امور میں اتحاد کر کے وسیع تر مقصد اور بلند تر نصب العین کے لیے کام کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں آپ شخصی زندگی میں اصلاحِ احوال تزکیۂ نفس اور تطہیرِ باطن کے لیے اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کے طریق کار کے بہت بڑے حامی اور مؤید ہیں۔ آپ کو اسلامی تصوف و طریقت کی اُن حقیقی اور عملی تعلیمات سے بے پناہ شغف اور طبعی رغبت ہے جن کے بغیر انسان حُبِّ دُنیا، حُبِّ جاہ و منصب، حسد، بُغض و عناد، کبر و ریا، نفاق و منافرت، آفاتِ نفس اور رذائلِ اخلاق سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ آپ جس تصوف و روحانیت کے قائل اور مبلغ ہیں وہ عملی تصوف ہے جو جمود و تعطل سے بہت دُور، سراسر حرکت و انقلاب ہے اور براہِ راست سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ماخوذ ہے۔ جس کی تائید و تبلیغ ہمیشہ اکابر صوفیاء نے کی اور جس کے سبب سے اُمت کے ادوارِ زوال میں بھی احیاءِ اسلام کی شمع فروزاں ہوتی رہی۔

آپ کے نزدیک آج بھی مذہبی اور اخلاقی و رُوحانی زندگی کے زوال و انتشار کا خاتمہ صرف اسی مثالی خانقاہی نظام کی بحالی سے ممکن ہے جس کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحابِ صُفہ کے گروہ کی صورت میں رکھی تھی۔ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک عُلماء و مبلغین میں واقعتہً عشقِ الٰہی، محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، درد و سوز، دردِ دل، صدق و اخلاص، حسنِ نیت و عمل، للٰہیت، رضائے الٰہی، تقویٰ و طہارت، زہد و ورع اور نورِ عبادت و ریاضت جیسے فضائل پیدا نہیں ہو جاتے ان کی تبلیغ سے احوالِ زمانہ کا رُخ نہیں بدلا جا سکتا۔ آپ کے نزدیک انہی فضائل کی برکت سے انشراحِ صدر کی دولت نصیب ہوتی ہے اور سینہ و دل معارفِ دین اور فیضانِ نبوت کے قابل ہوتے ہیں۔ آپ قرآنی تعلیمات کی ایسی ترویج و اشاعت چاہتے ہیں جو عالمِ اسلام میں عظیم فکری اور عملی انقلاب کی بنیاد ثابت ہو جس سے انسانیت

Marfat.com

کو درپیش مسائل و مشکلات کا یقینی اور قابلِ عمل حل میسر آئے۔ اسلام کی عالمگیر فتح اور غلبۂ دینِ حق کی بحالی کے لیے قرآن و سنت کے فکر پر مبنی عظیم عالمی انقلاب کو اپنا مقصدِ زندگی بنا لینے والا ہر شخص آپ کا رفیق ہے اور خود آپ کی زندگی کا ہر لمحہ اسی مقصدِ وحید کے لیے وقف ہے۔

پروفیسر صاحب کی تمام دینی خدمات وقف فی سبیل اللہ ہیں

پروفیسر صاحب کی نجی اور تبشیری زندگی کا یہ پہلو قابلِ مطالعہ ہے کہ آپ کی تمام تر دینی و علمی خدمات جن میں آپ کی جملہ تصانیف، تقاریر، خطابات کے ریکارڈ شدہ کیسٹس، دروسِ قرآن اور جامع مسجد اتفاق کالونی لاہور کے خطباتِ جمعہ وغیرہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے دین اور حضور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی خدمت کے لیے فی سبیل اللہ وقف ہیں۔ آپ ان میں سے کسی شے کا بھی کوئی معاوضہ، مشاہرہ، تنخواہ، کمیشن یا رائلٹی وغیرہ نہیں لیتے —— ادارہ منہاج القرآن اور اتفاق اسلامک اکیڈمی کی سرپرستی بھی اسی طرح آپ کی فی سبیل اللہ خدمات ہی کا حصہ ہیں۔

مزید برآں آپ کے اندرونِ ملک کراچی سے پشاور تک تمام تبلیغی اور تنظیمی دورے، مختلف مقامات پر دروسِ قرآن کے مراکز اور ادارہ منہاج القرآن کی تنظیمی شاخوں کے قیام کے سلسلہ میں جس قدر بھی مساعی ہیں وہ سب کی سب بلا معاوضہ و مشاہرہ صرف اور صرف رضائے الٰہی کے لیے وقف ہیں۔ اسی طرح آپ کے بیرونِ ملک عالمِ اسلام اور یورپ تک کے وقتاً فوقتاً ہونے والے تبلیغی دورے بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ آپ نے آج تک مذکورہ بالا جملہ دینی، علمی، تحقیقی، تقریری، تحریری اور تنظیمی سرگرمیوں پر ایک پائی تک کا معاوضہ بھی کسی جماعت، طبقے، تنظیم، خاندان یا فرد سے وصول نہیں کیا بلکہ آپ نے خدمتِ دین کے ضمن میں معاوضوں اور مشاہروں کو اپنے اوپر کلیتہً حرام کر لیا ہوا ہے۔

یہ پہلو اس لیے حق کے متلاشیوں کے لیے بڑا حوصلہ افزا اور ایمان افروز ہے کہ آج کے دور میں بھی اگر کوئی شخص اپنا تن من دھن سب کچھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وقف کرتے ہوئے ہر قسم کے دنیوی مفاد و منفعت اور حرص و لالچ سے بالاتر ہو کر اخلاص کے ساتھ جدوجہد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اس کے مشن میں اس طرح شاملِ حال رہتی ہے کہ اس کے راستے کی سب رکاوٹیں از خود دُور ہوتی چلی جاتی ہیں اور خلقِ خدا بہ دل و جاں اُس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہے۔

اسی طرح آپ نے ادارہ منہاج القرآن اور کاروانِ اسلام کے نام پر دینی احیاء کی جس عالمگیر تحریک کا آغاز کیا ہے وہ بھی کسی مخصوص فرد، جماعت یا تنظیم کی مالی معاونت کی نہ محتاج ہے نہ ہوگی۔ ادارہ منہاج القرآن اور کاروانِ اسلام کے جملہ مالی وسائل کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

۱۔ پروفیسر صاحب کی تصانیف کی جملہ آمدنی اسی مشن کے لیے وقف ہے۔ جس میں سے وہ خود ایک پائی بھی وصول نہیں کرتے۔

Marfat.com

۲۔ پروفیسر صاحب کی تقاریر و خطابات کے ریکارڈ شدہ کیسٹس کی جملہ آمدنی بھی مشن ہی کے لیے وقف ہے اور اس میں سے بھی وہ ایک پائی تک وصول نہیں کرتے۔

نوٹ: (واضح رہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے پروفیسر صاحب کی تصانیف اور خطبات کی ریکارڈ شدہ کیسٹوں کی سالانہ سیل لاکھوں روپے کے حساب تک متجاوز ہے جس میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے)

۳۔ ادارے کے رفقاء کا ماہانہ چندہ۔

۴۔ ادارے کے رفقاء اور وابستگان کے خصوصی عطیات جس سے ادارے کی تعمیرات کے اخراجات کی کفالت ہو رہی ہے۔ واضح رہے کہ تعمیرات کا یہ منصوبہ بھی محض رفقاء ادارہ کے اجتماعی تعاون کا نتیجہ ہے۔

یہاں یہ پہلو دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پروفیسر صاحب نے اپنی زندگی کو اسی دن سے ہی کلیتہً دنیوی منفعت و معاوضہ کے تصور سے بالاتر ہو کر محض رضائے الٰہی کے لیے وقف کر دیا تھا جس دن سے آپ نے احیائے اسلام کے عالمگیر انقلاب کے لیے حلف کی صورت میں خود کو بارگہ ایزدی اور بارگہ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا۔

۱۹۷۴ء میں جب آپ کے والد گرامی حضرت علامہ ڈاکٹر فریدالدین قادریؒ کا وصال ہو گیا تو اس کے بعد جھنگ کے زمانہ قیام میں گھریلو ذمہ داریوں کی کفالت کا سارا بوجھ آپ کے کندھوں پر آن پڑا۔ بحمداللہ تعالیٰ آپ نے لاہور منتقل ہونے سے پہلے کم و بیش اس چار سالہ دور کو محض اللہ کے فضل و احسان سے کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ اسی دور سے آپ نے مشنری جدوجہد کا بھی آغاز کر دیا تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسی دور کے ابتدائی زمانہ میں آپ گورنمنٹ کالج میں بطور لیکچرار تعینات تھے اور بعد ازاں جھنگ ڈسٹرکٹ کورٹس میں بطور ایڈووکیٹ پریکٹس کرتے رہے۔ اس دور میں طرح طرح کی مالی اور دیگر مشکلات و آلام کی کثرت نے آپ کو بارہا گھیرا لیکن راقم الحروف خود شاہد ہے کہ اللہ کے فضل سے آپ نے یہ زمانہ بھی اللہ کی مدد و نصرت سے پورے صبر و توکل اور استغناء کے ساتھ گزارا۔

بعد ازاں ۱۹۷۸ء میں لاہور منتقل ہوتے ہی آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں ملازمت اختیار کر لی جسے آپ نے ۱۹۸۳ء تک مستقل بنیادوں پر قائم رکھا۔ آپ کے قریبی دوست اس امر سے بخوبی آگاہ ہیں کہ قیام لاہور کا ابتدائی چار سالہ دور بھی آپ نے جس صبر و توکل کے ساتھ بسر کیا ہے اس کی روداد سن کر بھی عام انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے شب و روز کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان احوال سے پورے طور پر تو اللہ تعالیٰ ہی واقف ہے یا ان کے اپنے گھر کے شب و روز۔ لیکن باوجود تمام تر صلاحیتوں اور دنیوی مواقع کی فراوانی کے آپ نے ناجائز اور غیر اخلاقی طور پر مال و سائل پیدا کرنا تو درکنار محض اہل علم کے ہاں متداول طریق کے مطابق اپنی دینی خدمات کو بھی اپنا ذریعہ معاش بنانا گوارا نہ کیا اور جب ادارہ منہاج القرآن کے قیام کے بعد آپ کی دینی، تحقیقی، تصنیفی اور تبلیغی مصروفیات میں اس حد تک اضافہ ہو گیا کہ پنجاب یونیورسٹی کی ملازمت کو بھی مستقل بنیادوں

Marfat.com

پر قائم رکھنا عملاً ممکن نہ رہا تو آپ اس سے بھی مستعفی ہو گئے اور اپنے اہل وعیال کے لیے ضروریات زندگی کی کفالت کا مستقل انتظام کرنے کی خاطر آپ نے اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائیداد میں سے جو کچھ ممکن تھا فروخت کر دیا یہاں تک کہ آپ کے پاس اپنے آبائی وطن جھنگ صدر میں اپنے عارضی قیام کے لیے بھی اب ایک کمرہ تک باقی نہیں رہا اور آپ وہاں کی ساری جائیداد فروخت کر کے لاہور میں آزادانہ بنیادوں پر رزق حلال کی فراہمی پر صرف کر چکے ہیں باوجودیکہ تمام اعزہ و اقارب اور احباب کے منع کرنے کے کہ کم از کم اس مکان کو نہ بیچا جائے جس سے آپ کے بچپن اور جوانی کی پوری تاریخ وابستہ ہے جس سے والدین کی شفقت ومحبت اور لطف ومروت کی حسین یادیں وابستہ ہیں۔ آپ نہ مانے اور کہا یہ زندگی کی جذباتی یادیں اپنی جگہ درست سہی لیکن مجھے لاہور میں اپنے قیام اور ماہانہ گھریلو ضروریات کی کفالت کے لیے بھی کوئی مستقل انتظام کرنا ہے۔

چنانچہ آپ نے اس جائیداد کے علاوہ گھریلو زندگی کی بھی کئی اشیاء اس مقصد کے لیے فروخت کر دیں اور یوں مختلف ذاتی ذرائع سے کچھ سرمایہ فراہم کیا۔ بعض قریبی دوستوں سے ادائیگی کے وعدے پر کچھ قرضہ جات بھی لیے۔ بالآخر اس طرح انہوں نے لاہور میں اپنی رہائش کے لیے مکان خریدا اور گھریلو ضروریات کی کفالت کے لیے کسی دوست کے ساتھ شراکت کی بنا پر ایک چھوٹا سا کاروبار تشکیل دیا۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے "VISITING PROFESSOR" کے طور پر ایل ایل ایم کی کلاسز کی تدریس کی حد تک اپنا تعلق بھی قائم رکھا ہوا ہے جس سے کچھ اعزازیہ بھی ملتا ہے۔ اسی طرح سپریم کورٹ شریعت بنچ، وفاقی شرعی عدالت اور دیگر قومی سطح کے سرکاری اداروں سے بطور مشیر کے جو تھوڑا بہت اعزازیہ ملتا ہے ان تمام ذاتی وسائل سے آپ اپنی ضروریات زندگی کی کفالت بھی کرتے ہیں اور ماہانہ اقساط کی صورت میں قرضہ جات کی ادائیگی بھی۔ مگر جہاں تک آپ کی دینی اور تبلیغی خدمات کا تعلق ہے اس کو آپ نے کسی لحاظ سے بھی اپنا ذریعہ روزگار نہیں بنایا اور نہ ہی اس ضمن میں آپ نے کسی کے زیر بار احسان ہونا گوارا کیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے اپنی لاکھوں روپے کی مالیت کی لائبریری (جو آپ نے اپنے والد ماجد سے وراثتاً پائی تھی) بھی اپنی دیگر تصنیف کردہ کتب اور کیسٹس کے ساتھ ادارہ منہاج القرآن کو وقف کر دی ہے اور یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ میرے بعد میرے خاندان، میری اولاد یا ورثاء میں سے کوئی شخص بھی میری جملہ دینی خدمات سے حاصل ہونے والے سرمائے یا مالی مفاد پر کوئی استحقاق نہ رکھ سکے۔ کیونکہ یہ سب کچھ وقف فی سبیل اللہ ہے۔

پروفیسر صاحب کی زندگی کے اس ذاتی گوشے کی تفصیل سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق اس لیے بیان کر دی گئی ہے کہ کسی کو حالات سے ناواقفیت کے باعث کوئی غلط فہمی نہ ہو بلکہ دین کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے آج بھی ایک عملی مثال سامنے آسکے تاکہ وہ اس سے سامان عزم وہمت حاصل کریں۔ مزید یہ کہ دعوت حق کی ذمہ داری ادا کرنے والوں کی زندگی کا ہر پہلو ہر طور لوگوں کے سامنے ایک کھلی کتاب کی مانند رہنا چاہیے تاکہ لوگوں کو اس کی خلوت وجلوت اندرونی بیرونی اور نجی و سماجی زندگی کے سارے معاملات کا صحیح علم ہو۔ یہی معیار قیادت امت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم اور عمل

Marfat.com

کی صورت میں عطا فرمایا ہے۔
اللّٰہُ یَجْتَبِیْ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ

تصانیف

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی مندرجہ ذیل تصانیف زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

۱۔ تسمیۃ القرآن (تفسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)
۲۔ سورۂ فاتحہ اور تعمیرِ شخصیت
۳۔ اسلامی فلسفۂ زندگی
۴۔ اجزائے ایمان (حصہ اوّل)
۵۔ اجزائے ایمان (حصہ دوم)
۶۔ اجزائے ایمان (مکمل) مجلد
۷۔ ایمان اور اسلام
۸۔ فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
۹۔ مناہج العرفان فی لفظِ القرآن
۱۰۔ بلاسود بنکاری (عبوری خاکہ)
۱۱۔ منافقت اور اس کی علامات
۱۲۔ سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
۱۳۔ معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
۱۴۔ اجتہاد اور اس کا دائرہ کار
۱۵۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفۂ خودی
۱۶۔ تاریخ فقہ میں ہدایہ و صاحبِ ہدایہ کا مقام
۱۷۔ معارفِ اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

۱۸۔ شہادتِ توحید
۱۹۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مصلحِ سیاست
۲۰۔ اقبال اور تصورِ عشق
۲۱۔ تحقیقِ مسائل کا شرعی اسلوب
۲۲۔ حکمتِ استعاذہ (تفسیر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم)
۲۳۔ فلسفۂ تسمیہ (تفسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)
۲۴۔ معارفِ اسم اللہ جل جلالہ
۲۵۔ صفتِ رحمت کا شانِ امتیاز
۲۶۔ عصرِ حاضر اور فلسفۂ اجتہاد
۲۷۔ حصولِ مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی
۲۸۔ پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج
۲۹۔ قرآنی فلسفۂ تبلیغ
۳۰۔ فطرت کا قرآنی تصور
۳۱۔ قرآنی فلسفۂ عروج و زوال
۳۲۔ پیغمبرِ انقلاب اور صحیفۂ انقلاب
۳۳۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم (وقت کی اہم ضرورت)
۳۴۔ علم۔ توجیہی یا تخلیقی
۳۵۔ دینی اور لادینی علوم کے اصلاح طلب پہلو
۳۶۔ مغربی اور اسلامی تصورِ قانون کا تقابلی جائزہ
۳۷۔ نص اور تعبیرِ نص
۳۸۔ قرآن اور شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

۳۹۔ Islam In Various Perspectives
۴۰۔ Quranic Concept of Human Guidance
۴۱۔ Islam and Freedom of Human will
۴۲۔ Islamic Concept of Human Nature
۴۳۔ Quranic Basis of Constitutional Theory
۴۴۔ Philosophy of Ijtihad and the Modern World
۴۵۔ Islamic Concept of Crime ۴۶۔ Islam-The State Religion
۴۷۔ Islamic Philosophy of Punishments
۴۸۔ Islamic Concept of Law ۴۹۔ What Islam is?
۵۰۔ Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)
۵۱۔ Islamic Philosophy of Human Life
۵۲۔ Islam and Christianity
۵۳۔ Islam and Modern Medicine
۵۴۔ Quranic Concept of Benevolence
۵۵۔ Finality of the Prophethood

زیرِ طبع و زیرِ ترتیب تصانیف

۵۶۔ عورت کی دیت کا مسئلہ
۵۷۔ التصوف فی الاسلام
۵۸۔ اسلام کا تصورِ ملکیت
۵۹۔ الاربعین فی فضائل النبی الامین
۶۰۔ فلسفۂ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم
۶۱۔ علم، قانون اور اجتہاد
۶۲۔ تعلیمی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
۶۳۔ حقیقتِ صلوٰۃ
۶۴۔ حقیقتِ صوم
۶۵۔ حقیقتِ حج

Marfat.com

۶۶۔ حقیقتِ زکوٰۃ

۶۷۔ قرآنی فلسفۂ انقلاب

۶۸۔ اسلام اور سائنس

۶۹۔ اسلام اور طبِ جدید

نوٹ: پروفیسر صاحب کی شہرۂ آفاق تفسیر منہاج القرآن کی پہلی جلد بہت جلد منظرِ عام پر آرہی ہے۔ سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور تصوف پر دروس اور خطبات کا ضخیم مجموعہ بھی تیار ہو چکا ہے جن کی ترتیب و تدوین کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔

علاوہ ازیں اسلام کے مختلف علمی و عملی اور روحانی و انقلابی پہلوؤں پر پروفیسر صاحب کے سینکڑوں مسودات ترتیب و تدوین کے مراحل میں ہیں جن پر تیزی سے کام ہو رہا ہے۔

مرتبہ

جاوید القادری

مرکزی ناظم شعبہ نشر و اشاعت

Marfat.com

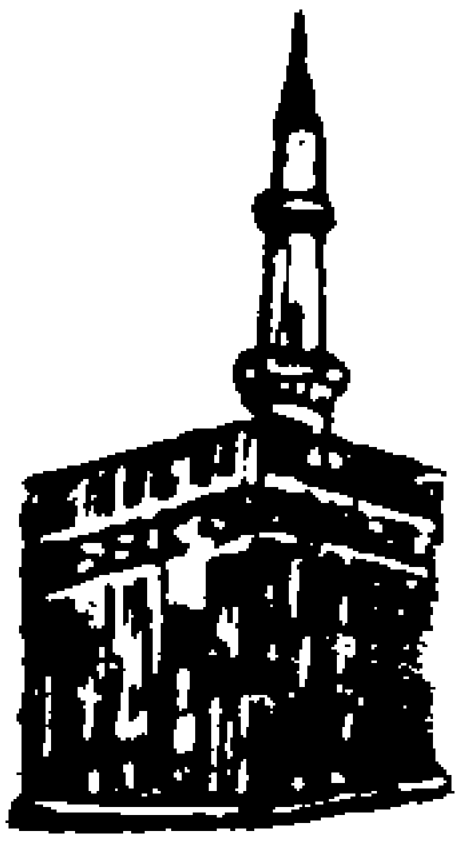

ایمان باللہ

Marfat.com

Marfat.com

باب اوّل

ایمان باللہ

اور

اُس کے تقاضے

Marfat.com

Marfat.com

حدیث جبریل[1] میں (جسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ سمیت بہت سے محدثین نے نقل کیا ہے) سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا[2] ان میں سے پہلی چیز ایمان باللہ ہے۔

---

[1] حدیث جبریلؑ پر تفصیلی گفتگو آئندہ ابواب میں کی جائے گی۔ وہیں پر اس کے تفصیلی مطالب بھی بیان کیے جائیں گے، یہاں صرف اتنا ذہن نشین رہے کہ یہ ذخیرۂ احادیث کی مشہور روایت ہے اور اس میں حضرت جبریلؑ کے انسانی شکل و صورت میں آکر ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے متعلق سوال کرنے کا ذکر ہے۔ یہ بھی مذکور ہے کہ وہ خود ہی سوال کرتے اور خود ہی تصدیق بھی فرماتے تھے جس پر صحابہ کو بڑا تعجب ہوا۔ اس روایت کو حضرت عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، اور بعض دوسرے جلیل القدر صحابہؓ نے روایت کیا ہے۔ (دیکھیے مسلم: الصحیح، کتاب الایمان، ۱: ۴۰ حدیث ۱۰)

[2] یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ کم و بیش انہی باتوں پر ایمان لانے کی تلقین سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۷۷ میں کی گئی ہے۔

Marfat.com

ایمان باللہ کا مفہوم

ایمان زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے (اقرارٌ باللسان وتصدیقٌ بالقلب) بنابریں ایمان باللہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے واحد و یکتا ہونے، اس کے خالق و مالک ہونے، اس کے پروردگار اور حاجت روا ہونے کا زبان سے اعتراف کیا جائے اور دل کی گہرائیوں سے اس کی تصدیق کی جائے۔ اس اقرار و تصدیق کے مجموعے کا نام ایمان باللہ ہے۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ اقرار و تصدیق سے مراد کیا ہے۔ اور اس کا مطلوبہ معیار کیا ہے۔

ایمان باللہ اور اس کے تقاضے

اگر محض زبان سے رب العزت کی الوہیت کا اقرار و اظہار کافی ہوتا تو ایمان کی یہ شرط کفار کو اتنی گراں نہ گزرتی۔ اصل بات یہ ہے کہ اقرار و اظہار کے ساتھ ساتھ ایمان باللہ کے کچھ تقاضے بھی ہیں جن کو پورا کرنے سے تصدیق متحقق ہوتی ہے۔ اگر ان تقاضوں کو ٹھیک ٹھیک پورا کیا جائے تو ایمان کی تکمیل ہو جاتی ہے اور ان کو نظر انداز کر دیا جائے تو ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔

ایمان باللہ کے تقاضوں کو ہم بنیادی طور پر تین اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

- محبت الٰہی
- اطاعت الٰہی
- توکل علی اللہ

Marfat.com

ایمان باللہ کا پہلا تقاضا

محبتِ الٰہی

قاعدہ ہے کہ جس چیز سے انسان کا کوئی تعلق ہو، اس چیز سے ایک گونہ قلبی اور روحانی لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی قلبی لگاؤ کو عرفِ عام میں محبت کہتے ہیں۔ یہ قلبی تعلق جس

ل قرآن کریم میں محبت کا لفظ متعدد جگہ اور متعدد بار استعمال ہوا ہے۔ لفظِ محبت عربی زبان کا لفظ ہے مگر دوسری بہت سی زبانوں میں بھی عام استعمال ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں اس کا استعمال کس مفہوم میں ہوا ہے۔ امام بغوی اپنی تفسیر میں لفظِ محبت کی تعریف یوں لکھتے ہیں،

حب المؤمنون للہ	مومنوں کی خدا تعالیٰ سے محبت اس کے حکم
اتباعہم امرہ اتیانہم	کی اتباع کرنا، اس کی اطاعت بجا لانا اور اس کی
طاعتہ وابتغاءہم مرضاتہ	خوشنودی کی جستجو میں لگے رہنا ہے، جب کہ خدا کی
وحب اللہ للمؤمنین ثناءہ	مومنین سے محبت خدا تعالیٰ کا ان کی تعریف کرنا
علیہم وثوابہ لہم	اور انہیں اکرام و انعام سے نوازنا ہے۔

مگر قاضی محمد ثناء اللہ محدث پانی پتی رح (صاحبِ تفسیر مظہری) فرماتے ہیں کہ یہ محبت کی نہیں بلکہ تقاضائے محبت کی تعریف ہے۔ قاضی بیضاوی نے اپنی تفسیر میں محبت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے،

ان المحبۃ میل	محبت نفس کا کسی چیز کو سمجھ کر اس کی
النفس الی الشی بکمال	طرف اس انداز سے میلان اور جھکاؤ رکھنا

(باقی اگلے صفحے پر)

Marfat.com

نوعیت کا ہو، محبت بھی اسی نوعیت کی ہوتی ہے۔ دنیا اور اس کے رشتے چونکہ فانی ہیں، اس لیے ان سے محبت بھی فانی ہوتی ہے مگر اللہ وحدہٗ لاشریک کی ذات زمان و مکان کی قیود و حدود سے ماوراء ہے اس لیے اس سے انسان کا تعلق بھی لافانی ہوتا ہے۔ بنا بریں اللہ کی ذات سے مومن کی محبت جملہ محبتوں سے برتر و اعلیٰ اور شدید و قوی ہونی چاہیے۔

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

ادراك فيه بحيث يحمله على يقربه اليه — ہے جو نفس کو مطلوبہ چیز کے قرب پر برانگیختہ کرے۔

قاضی ثناء اللہ محدث پانی پتی کے بقول یہ بھی محبت کی ذاتی تعریف نہیں بلکہ صفتی تعریف ہے۔ خود قاضی صاحب نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

حُب عبارت است از اشتغال قلب محب بمحبوب بقسمی کہ باز دارد اُو را از توجہ سوی غیر او و چارہ نباشد او را از توجہ و دوام سوی اُو وھو المعنی من قولھم "العشق نار يحرق ما سوا المحبوب" يعنى يقطع عن قلبه التوجه الى غير المحبوب فيجعله نسياً منسياً كان لم يكن فى الوجود غير محبوبه حتى يسقط عن نظر بصيرته نفسهٗ كما لا يرى غيره۔۔۔"

ترجمہ: محبت دراصل محبت کرنے والے کے دل کا محبوب کے ساتھ اس حد تک مشغول ہو جانا ہے جو اسے اس محبوب کے سوا دوسروں کی طرف توجہ کرنے سے باز رکھے اور اسے محبوب کی طرف ہمیشہ توجہ اور التفات رکھنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ صوفیاء کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے "عشق وہ آگ ہے جو محبوب کے سوا ہر چیز کو فنا کر دیتی ہے" چنانچہ محبت محب کی توجہ غیر سے اس طرح منقطع کر دیتی ہے گویا وہ نسیاً منسیا ہو جاتا ہے اور یوں لگتا ہے کہ محبوب کے سوا کسی کا وجود ہی باقی نہیں رہا، یہاں تک کہ خود محب کا اپنا وجود اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہر طرف محبوب ہی کو جلوہ نما دیکھتا ہے۔

محبت کی یہ تعریف اہلِ دل کے قلبی جذبات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔

Marfat.com

اس سلسلے میں ارشادِ خداوندی ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؎ — اور اہل ایمان اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں۔

گویا اس آیت میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے کی علامت یہ ہے

؎ البقرہ (۲:۱۶۵) ہرچند کہ قرآن میں شدید محبت کے تصور کو ظاہر کرنے کے لیے "عشق" کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ عشق "اشد حبًا" ہی کی تعبیر پیش کرتا ہے۔ اسی بنا پر صوفیاء اور عرفاءِ کاملین نے اللہ اور اس کے رسولؐ سے شدید محبت رکھنے کے لیے عشق کی اصطلاح بار بار اور کثرت سے استعمال کی ہے۔

قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں خدا تعالیٰ کی محبت انسان کو ضبط وتحمل کی تعلیم دیتی ہے، بے صبری اور سکران ومستی کی نہیں۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ منصور محبت خداوندی میں ضبط وتحمل کا دامن کھو بیٹھا تو اس نے نعرہ "انا الحق" بلند کر دیا۔ اس کے برعکس سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی آنکھوں سے محبوب کے جلووں کو بے نقاب دیکھا، سب سے زیادہ ذاتِ حق کا قُرب پایا مگر اپنی زبان سے کہا تو صرف یہ کہا

ما عبدناك حق عبادتك وما عرفناك حق معرفتك — اے اللہ: ہم نے تیری عبادت اور تیری معرفت کا صحیح حق ادا نہیں کیا۔

(کلماتِ طیبات)

لہٰذا "عشق" اور "محبت" کی لفظی بحثوں میں الجھنا دانشمندی نہیں۔ اصل بات تو ذاتِ حق سے غایت درجے کی محبت پیدا کرنا ہے، خواہ اسے عشق کا نام دیں یا محبت کا، دونوں درست ہیں۔

Marfat.com

کہ اہلِ ایمان کے دلوں میں خدا کی ذات سے بے پناہ محبت اور قلبی تعلق پیدا ہو جائے۔

غور کیجیے یہاں یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں، وہ اس سے محبت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس یہاں اہلِ ایمان کے دلوں میں موجود اللہ تعالیٰ کی شدید محبت کے تاثر انگیز اظہار کے لیے ایک منفرد ترکیب اختیار فرمائی گئی جس میں خبریہ انداز بھی ہے اور محبت و شفقت کے جذبات سے مملو بے ساختہ پن بھی۔ اس آیۂ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ رب العزت یہ ارشاد فرماتا ہے کہ میرے اور میرے بندوں کے درمیان درحقیقت جو رشتہ ہے، وہ محبت اور اُلفت کا رشتہ ہے۔ میرے مومن بندے مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں۔ ان کی یہ محبت اس درجے اور اس کیفیت کی ہوتی ہے کہ ان کے قلوب میں میری محبت اور اُلفت کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور ان کی کیفیت بقول کسے یوں ہو جاتی ہے:

ع جدھر دیکھتا ہوں، ادھر تُو ہی تُو ہے

بندۂ مومن میرے سوا کسی اور کی محبت اپنے دل میں نہیں سمو سکتا، کیونکہ جس دل میں خدا تعالیٰ کی محبت سما جاتی ہے، اس دل سے ہر محبت اور ہر تعلق حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتا ہے۔ بیوی بچوں، بہن بھائیوں، رشتہ داروں اور دوستوں کی محبتیں اس عظیم محبت کے تابع اور زیرِ فرمان ہو جاتی ہیں۔ یہ محبت جس محبت کو باقی رکھنا چاہتی ہے وہ باقی رہتی ہے اور جس محبت کو ختم کرنا چاہتی ہے وہ ختم ہو جاتی ہے۔ الغرض حقیقی اور سچی محبت (جس کو صوفیاء کی اصطلاح میں عشقِ حقیقی کہتے ہیں) صرف اور صرف ایک ہی ہے، دوسری سب محبتیں اس بڑی محبت کی فروعات ہیں۔ چنانچہ ارشادِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے۔

من احب للّٰہ و ابغض للّٰہ و اعطی للّٰہ و منع للّٰہ	جس نے اللہ کے لیے دوسروں سے محبت اور دشمنی رکھی، اور اللہ کے لیے کسی کو

Marfat.com

فقد استكمل الايمان [۱] دیا یا نہ دیا تو اس نے اپنے ایمان کو کامل کر لیا۔

محبتِ خداوندی درحقیقت وہ مرکز ہے جس کے گرد سب محبتیں دست بستہ کھڑی ہونی چاہییں، تبھی ایمان مکمل ہوگا۔

جب محبتِ الٰہی قلبِ مومن میں اصل الاصول کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کی ہر چیز اسی دائرے میں سمٹ آتی ہے۔ اسی بنا پر قرآنِ حکیم میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ — اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو
وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا [۲] — اور ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی کے ہو رہو۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ربّ العزت سے محبت اپنی انتہائی بلندیوں کو چھونے لگی تو فرمایا گیا کہ اب آپ اپنی روداد سب کو سنا دیں۔

چنانچہ ارشاد ہوا:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي — (یہ بھی) کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادت
وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ — اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ خدائے
رَبِّ الْعَالَمِينَ [۳] — رب العالمین کے لیے ہے۔

یعنی چند اوقاتِ مقررہ پر مخصوص عبادات بجا لانے ہی سے حقِ عبودیت اور حقِ محبت ادا نہیں ہو جاتا بلکہ حق یہ ہے کہ انسان زندگی اور موت کی تمام قدریں اور ساری متاع اسی ذات جل وعلا پر نچھاور کر دے اور رکھے۔

---

[۱] ابو داؤد، ۵: ۶۰، حدیث ۴۶۸۱، مطبوعہ حمص (شام)، ۱۹۷۴ء
[۲] المزمل (۷۳: ۸) [۳] الانعام (۶: ۱۶۲)

Marfat.com

مَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ
میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ خدائے رب العالمین کے لیے ہے۔

یہ محبت وعبودیت کا سب سے اونچا مقام ہے کہ انسان کی نگاہ میں اپنی شخصیت اور اپنی ذات بھی معدوم ہوجائے اور اس کے قلب وجگر میں صرف ایک ہی ذات، ایک ہی شخصیت اور ایک ہی محبوب کی محبت وعقیدت باقی رہ جائے۔ اسی بنا پر عرفا کا یہ قول ہے کہ:

عشق نار یحرق ماسوا المحبوب
عشق ایسی آگ ہے، جو دل سے محبوب کے سوا سب کچھ جلادیتی ہے۔

شرائطِ محبت

یہ تو محبت کا مفہوم تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بندے اور خالق ومالک کے درمیان جو تعلق ہے وہ محض حاکم ومحکوم کا ہی نہیں ہے بلکہ محب ومحبوب کا بھی ہے۔ اب یہ جان لیجیے کہ محبت کی بھی کچھ شرائط ہیں۔ اگر کسی شخص کی محبت میں وہ شرائط پائی جائیں تو اس کا دعوائے محبت کامل ہوگا ورنہ نہیں۔ یہ شرائط حسب ذیل ہیں:

پہلی شرط ــــ کثرتِ ذکرِ محبوب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

من احب شیئا اکثر ذکرہ
انسان کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر بڑی کثرت سے کرتا ہے۔

یعنی محبت کی پہلی شرط یہ ہے کہ محبوب کا کثرت سے ذکر کیا جائے اور ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس کی یاد سے دل کی دنیا کو آباد رکھا جائے اسی لیے خدا کے بندوں کی شان

Marfat.com

یں کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا [1]

اور وہ جو اپنے پروردگار کے حضور (انتہائی عجز ونیاز سے) سجود وقیام میں راتیں بسر کر دیتے ہیں

نیز فرمایا:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا [2]

ان کے پہلو (شب کے راحت کدوں میں بھی) بچھونوں سے الگ رہتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار کو خوف اور اُمید (کی ملی جلی کیفیت) سے پکارتے ہیں۔

نیز فرمایا گیا:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا [3]

وہ اللہ کو کھڑے اور بیٹھے (ہر حال میں) یاد کرتے رہتے ہیں۔

ان ارشاداتِ خداوندی کا یہ نتیجہ تھا کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی طویل نمازیں ادا فرماتے اور ان میں اتنے طویل سجدے فرماتے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، گمان گزرتا تھا کہ آپ کے جسمِ اطہر سے روح مبارک پرواز کر گئی ہے۔[4] عبادت میں اس انہماک کے علاوہ آپؐ کے دیگر معمولات ہمارے سامنے ہیں جس سے یہ واضح ہوتا ہے

---

[1] الفرقان (۲۵ : ۶۴)

[2] الم السجدہ (۳۲ : ۱۶)

[3] آل عمران (۳ : ۱۹۱)

[4] الترمذی: شمائل وغیرہ

Marfat.com

کہ آپ کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ذکرِ الٰہی سے خالی نہیں ہوتا تھا۔

آپ کے انہی مشاغل کی بنا پر آپ کے متوسلین کے کردار و عمل میں ذکرِ الٰہی اس غایت درجے میں سرایت کر گیا تھا کہ دنیائے عشق و محبت کی تاریخ میں کسی جگہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ جگر گوشۂ رسول حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی نسبت سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ سردیوں کی طویل راتوں میں جب آپ مصلّے پر عبادت کے لیے کھڑی ہوتیں تو ایک ہی سجدے میں تمام رات بیت جاتی۔ آپ اذان سن کر سرِ مبارک اُٹھاتیں اور ایک آہِ سرد کھینچ کر فرماتیں: اے آقا تو نے کتنی چھوٹی راتیں بنائی ہیں کہ جی بھر کے سجدہ بھی ادا نہیں ہو پاتا۔

اسی بنا پر جو گھڑی اور جو لمحہ ذکر و فکرِ الٰہی سے خالی ہو، عرفا اس لمحے کو حالتِ کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک حدیثِ قدسی میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ

میرے بے شمار بندے ایسے ہیں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں، میں اُن سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے مشتاق رہتے ہیں، میں اُن کا مشتاق رہتا ہوں۔ وہ میری ملاقات کے آرزومند رہتے ہیں، میں ان کی ملاقات کا متمنی رہتا ہوں۔ وہ مجھے تکتے رہتے ہیں، میں ان کو تکتا رہتا ہوں۔ عرض کیا گیا ان کی پہچان کیا ہے؟ فرمایا ان کی پہچان یہ ہے کہ وہ راتوں کو دن پر ترجیح دیتے ہیں، اس طرح کہ جب رات کے سائے پھیلنے شروع ہو جاتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ملاقات کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ وہ رات کی طرف اس طرح کشاں کشاں دوڑتے چلے آتے ہیں جس طرح دن کے تھکے ماندے پرندے رات کو اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹتے ہیں یا جس طرح ریوڑ اپنے گھروں کو واپس دوڑتے ہیں۔ جب رات پُرسکون ہو جاتی ہے، وہ آرام چھوڑ کر اور اپنے پہلوؤں کو نرم و گداز بستروں سے محروم کر کے میرے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ تمام شب مجھ سے

Marfat.com

ہم کلام رہتے ہیں، اپنی نگاہ سے مجھے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ میری محبت کا کبھی کوئی گلہ نہیں کرتے۔ وہ کبھی قیام کی حالت میں مجھے پکارتے ہیں تو کبھی سجدے کی حالت میں۔ ان کی ساری رات اسی طرح بسر ہو جاتی ہے۔ میں ایسے انسانوں کو ان کی عبادت کا صلہ کیا دیتا ہوں؛ میں انہیں یہ صلہ دیتا ہوں کہ پھر میں ان کے قریب تر ہو جاتا ہوں اور اپنے نور میں سے ایک نورانی شمع ان کے دل میں روشن کر دیتا ہوں۔ وہ اس نورانی شمع سے مجھے اس طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح میں ان کو پہچان لیتا ہوں۔ میری یاد ان کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ پھر میں انہیں اس محبت کے صلے میں وہ مقام اور وہ متاع عطا کرتا ہوں کہ اگر آسمان سے زمین تک، عرش معلّٰی سے تحت الثریٰ تک ساری کائنات ایک پلڑے میں رکھ دی جائے اور دوسرے پلڑے میں وہ قرب کی دولت رکھ دی جائے جو میرے ساتھ محبت کے صلے میں انہیں نصیب ہوتی ہے تو دوسرا پلڑا جھک جائے گا یعنی محبتِ الٰہی کے حاصل کے مقابلے میں تمام کائنات ہیچ ہے۔ بقول اقبال ؎

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

یہ تو محبت کا دعویٰ کرنے کے بعد اس کی پہلی شرط کو پورا کرنے والوں کا ذکر تھا اسکے برعکس کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو محبتِ خداوندی کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن غفلت کی نیند سوئے رہتے ہیں انکی بابت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كذب من ادعى محبتي اذا جنه الليل نام عني [2]

وہ شخص اپنے دعوائے محبت میں جھوٹا ہے، جو زبان سے محبت کا دعویٰ کرے مگر رات کو خوابِ غفلت میں پڑا رہے۔

---

[1] ابو طالب مکی، قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب، ج ۲، ص ۶۰، مطبوعہ بیروت

[2] ایضاً، ص ۵۵

Marfat.com

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ محبتِ خداوندی کے جذبے کے تحت انسان بستیاں ترک کر کے ویرانوں، غاروں اور کھائیوں میں بسیرا کر لے۔ اسلام اس طریقۂ رہبانیت کا مخالف ہے، وہ انسان کو شیوۂ مردانہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے یعنی یہ کہ دنیا میں رہ کر بھرپور معاشرتی زندگی گزارتے ہوئے اور زندگی کے تمام عملی تقاضے پورے کرتے ہوئے خدا کی یاد سے دلوں کو آباد رکھا جائے اور دنیا میں اس طرح رہا جائے گویا دنیا میں نہیں رہ رہا۔ انسان کا بسیرا دنیا میں ہو اور خدا کی یاد کا بسیرا اس کے دل میں۔

دوسری شرط — آزمائش پر صبر

محبتِ خداوندی کی دوسری شرط یہ ہے کہ اگر انسان کو دنیا میں رہتے ہوئے کسی آزمائش یا پریشانی سے دوچار ہونا پڑے تو وہ اس آزمائش کو مصیبت نہ سمجھے بلکہ اسے اپنے محبوب کی عطا جان کر خندہ پیشانی سے قبول کرے، اس دکھ اور پریشانی میں ایک گونہ راحت اور لذت محسوس کرے۔ لوگ عشقِ مجازی میں اپنے محبوب کی جفا پر اس کے اور زیادہ گرویدہ ہو جاتے ہیں اور انہیں محبوب کی جفا میں ایک طرح کی عطا نظر آتی ہے اور اس پیکرِ جفا کا ہر ناز نہ صرف قابلِ برداشت ہوتا ہے، بلکہ زیادتیٔ محبت کا باعث بھی بنتا ہے۔ خود قرآنِ کریم میں زنانِ مصر کا یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے گورنرِ مصر کی بیوی زلیخا کو استہزا کا نشانہ بنایا تو زلیخا نے ایک کھانے کی مجلس میں ان تمام عورتوں کو مدعو کیا، اور ہر ایک عورت کے ہاتھ میں پھل اور چھری پکڑا دی اور پھر حضرت یوسفؑ سے کہا کہ ان کے سامنے سے گزریں۔ یوسف علیہ السلام جیسے ہی ان کے سامنے سے گزرے، انہوں نے نظارۂ حسن کیا تو بےخودی کے عالم میں ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھریاں خود اُن کے ہاتھوں پر چل گئیں۔ اُنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے مگر اس کے باوجود انہیں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ قرآن کہتا ہے۔

Marfat.com

فَلَمَّا رَأَيْنَهٗ أَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ إِنْ هٰذَآ إِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ [1]

جب ان عورتوں نے ان کو دیکھا تو ان کا رعب (حسن) ان پر (ایسا) چھا گیا کہ (پھل تراشتے تراشتے) اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بے ساختہ بول اُٹھیں! سبحان اللہ (یہ حسن) یہ آدمی نہیں، کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔

یہ کیفیت تو عشقِ مجازی کی تھی۔ جہاں تک عشقِ حقیقی کا تعلق ہے، اس کی حقیقت اس سے کہیں ارفع واعلیٰ ہے۔ وہ عشاق جن کے سامنے اس نورِ مطلق کا حسن بے نقاب ہو، جو ہر گھڑی اس کے صفاتی نظاروں میں منہمک ہوں ـــــ اگر ان کے جسم پر کوئی تکلیف وارد ہو بھی جائے تو انہیں یادِ خداوندی میں فرطِ انہماک کی وجہ سے یہ تکلیف محسوس تک نہیں ہوتی۔ [2]

---

[1] یوسف (۱۲ : ۳۱)

[2] قرآنِ کریم میں حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ متعدد مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ شدید ترین جسمانی تکلیف میں مبتلا تھے مگر کیا مجال کہ ان کے لب پر کبھی حرفِ شکایت آیا ہو۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ تقریباً بارہ سال وہ اس بیماری میں مبتلا رہے۔ ان کی بیوی انہیں کہتیں کہ آپ خدا تعالیٰ سے دعا کیوں نہیں مانگتے کہ وہ آپ کی تکلیف دور کر دے۔ وہ جواب دیتے کہ میں زندگی بھر رب العزت کی نعمتوں سے بہرہ ور رہا ہوں، اب اگر اس کی طرف سے یہ تکلیف آگئی ہے تو مجھے بے صبری کا اظہار کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بارہ سال کے بعد اہلیہ نے زیادہ ہی مجبور کیا تو ہاتھ اُٹھا کر فقط یہ فرمایا:

(بقیہ اگلے صفحے پر)

Marfat.com

کتب سابقہ میں ایک واقعہ یوں مذکور ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے اور وہاں کلام الٰہی سے لطف اندوز ہونے کے بعد رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ (اے خدا میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنا آپ دکھا دے) کی درخواست پیش کی۔ ذات باری نے اپنی تجلی کا ایک پرتو پہاڑ پر ڈالا تو اس کے اثر سے حضرت موسیٰؑ چالیس دن تک بے ہوش رہے۔ اس پرتو تجلی ذات کا اثر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ظاہر پر یہ پڑا کہ کوئی شخص ان کے چہرے کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا تھا اور اگر کوئی دیکھنے کی جرأت کرتا تو اس کی بینائی سلب ہو جاتی۔ چنانچہ اسی بنا پر بائبل کی پہلی کتاب "کتاب پیدائش" میں آج بھی یہ لکھا ہے کہ موسیٰ جو خدا کا بندہ تھا، اپنے چہرے پر نقاب رکھتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی زوجہ نے عرض کیا، میں اس نور مطلق کا بالواسطہ دیدار کرنا چاہتی ہوں، ذرا چہرے سے نقاب اُلٹ دیجیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیری بینائی سلب ہو جائے گی۔ عرض کیا کوئی بات نہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا اور عین اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نقاب اُلٹ دی۔ جس سے ان کی زوجہ کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ اُنہوں نے فوراً دوسری آنکھ پیش کر دی اور کہا خدا کے نام پر دیدار کا ایک اور موقع فراہم کر دیجیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ نقاب اُلٹی جس سے ان کی دوسری آنکھ کی بینائی بھی سلب ہو گئی۔ مگر وہ جذبۂ صادق رکھتی

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گزشتہ)

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء ۲۱ : ۸۳)

اے میرے پروردگار مجھے اذیت ہو رہی ہے اور تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

Marfat.com

نھیں اس لیے کہنے لگیں، اے موسیٰؑ! خدا تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ خدا تعالیٰ مجھے بینکڑوں اور ہزاروں آنکھیں عطا کرے اور میں لذتِ دیدار میں ایک ایک آنکھ گنواتی رہوں اور عمر بھر دیدار کے اس سلسلے کو قائم رکھوں۔ اہلِ محبت محبوب کی یاد میں تکلیف اور اذیت کو اس طرح فراموش کر دیتے ہیں۔

تیسری شرط ـــــ انقطاع از ما سوا المحبوب

محبت اور محبوب کی غیرت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو آنکھ محبوب کی طرف اُٹھتی ہے، جو دل محبوب کے لیے دھڑکتا ہے، اس آنکھ اور دل میں اس کے سوا کسی اور کو نہ بسایا جائے۔ شیخ ابو طالب مکی (م ۳۸۶) سابقہ کتب کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت زلیخا جب مومن ہو گئیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے حبالۂ عقد میں آ گئیں تو اب وہی زلیخا جنھوں نے مسلسل تگ و دو کے بعد اپنے محبوب کو پایا تھا، یکسر بدل گئیں۔ ان کے شب و روز حضرت یوسف علیہ السلام سے دور گوشۂ تنہائی میں گزرنے لگے، تمام رات الگ بیٹھی رہتیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قریب نہ آتیں۔ اس پر ایک دن حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تو پہلے تو میری محبت میں گرفتار تھی اور اب جبکہ تو نے مجھے پا لیا ہے تو مجھ سے گریزاں کیوں ہے۔ حضرت زلیخا نے کہا:

یا یوسف انما کنت	اے یوسف میں اس وقت تک تجھ پر
احبک قبل ان اعرفه فاما	فریفتہ تھی جب اس ذات باری کی محبت سے
اذا عرفته فما ابقت محبته	آشنا نہ تھی اور جب سے میں اس کی ہوئی ہوں
محبة سواه [۱]	اس کی محبت نے میرے دل سے اس کے

---

[۱] ابو طالب المکی: قوت القلوب فی معاملة المحبوب، ج ۲ ص ۵۲، مطبوعہ بیروت۔

Marfat.com

سوا ہر محبت کو مٹا دیا ہے۔

اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کو بتایا کہ محبت یہ نہیں کہ محبوب کے احکام کو بھی نظر انداز کر دیا جائے حقیقتِ محبت تو یہ ہے کہ ہر تن اس کے احکام کی تعمیل کی جائے چنانچہ زلیخا کا تصورِ محبت اطاعت میں بدل گیا اور انہوں نے احکامِ الٰہی کی اطاعت کو زندگی کا شعار بنا لیا۔

الغرض جب دل میں خدا تعالیٰ کی محبت سما جاتی ہے تو انسان کے دل کا ہر اس چیز سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے جو محبتِ الٰہی سے دوری یا اسکی ذات سے بُعد کا سبب بنتی ہو۔ اسی بنا پر ارشادِ خداوندی ہے۔

وَ تَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ؕ[۱] اور ہر طرف سے ٹوٹ کر اسی طرف (دل سے) متوجہ ہو جا۔

اس آیت مبارکہ کے دو معانی ہیں؛

اوّلاً یہ کہ: اے انسان تو خدا سے یوں محبت کر کہ تیرا دل دنیا کی ہر محبت سے مستغنی ہو جائے۔

ثانیاً یہ کہ: تیرے دل میں خدا تعالیٰ سے محبت کا تعلق کچھ اس طرح استوار ہو کہ دنیا کی ہر وہ چیز جو خدا سے دور لے جانے والی ہے تو اس سے دور ہو جائے۔ اس اعتبار سے وہ شخص بلا شبہ جھوٹا ہے جو خدا کی محبت کا دعویٰ بھی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مال و دولت کی محبت میں بھی گرفتار ہے ـــــ الغرض دنیا کی کروڑوں اشیاء کی محبت اس نے دل کے آئینہ خانے میں سجا رکھی ہے۔ ایسے شخص کا دعوئے محبت کسی صورت میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔

---

[۱] المزمل (۷۳ : ۸)

Marfat.com

جوابِ محبت

یہ تو تھا خدا تعالیٰ سے محبت کرنے کا مفہوم۔ اب دیکھیے کہ خدا تعالیٰ کی ذاتِ والاصفات سے حقیقی محبت رکھنے کا صلہ کیا ملتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کے معاملات کی نسبت یہ قاعدہ ارشاد ہوا ہے:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ [1] — احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جو شخص خدا تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور یوں ٹوٹ کر محبت کرتا ہے کہ دنیا کی ہر محبت کا بُت پاش پاش کر کے خدا کی محبت میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے جواب میں خداوندِ تعالیٰ کی طرف سے اسے یہ صلہ اور یہ اجرِ رحمت ہوتا ہے کہ وہ بندہ جو پہلے محض محب تھا، اب محبوب بن جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ [2] — (اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دیجیے کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔

---

[1] الرحمٰن (۵۵ : ۶۰)

[2] آلِ عمران (۳ : ۳۱) یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ متعدد قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بندہ اپنے افعال اور حُسنِ کردار کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اللہ ربّ العزت کی محبت میں صادق سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ ذاتِ باری کی طرف سے بھی اپنی محبت کا جواب محبت میں پاتا ہے، چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے:

(باقی آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

مگر اس فرق کو ذہن میں رکھیے کہ وہ خدا جو یہ چاہتا ہے کہ اس کا بندہ صرف اسی کی محبت کا دم بھرے اور ما سوا اللہ کی محبت کو دل سے نکال باہر کرے، وہ اس بات

(از صفحہ گزشتہ)

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ — پس عنقریب اللہ تعالیٰ ایسی قوم پیدا فرمائے گا جن سے خدا کو محبت ہوگی اور انہیں خدا سے محبت ہوگی۔

(المائدہ: ۵ : ۵۴)

نیز فرمایا:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ — تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

(البقرہ ۲ : ۱۵۲)

اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے نقل کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

حقت محبتی للذین یتصادقون من اجلی وحقت محبتی للذین یتناصرون من اجلی — میری محبت ان لوگوں کے لیے ثابت ہوگئی جو میرے لیے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے لیے دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔

(الطبرانی: معجم الاوسط والصغیر)

نیز فرمایا:

وما یزال یتقرب الیّ بالنوافل حتّٰی اُحبہ — اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرے قریب آتا چلا جاتا ہے تاآنکہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔

(البخاری)

نیز فرمایا:

(باقی آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

پر پوری طرح قادر ہے کہ بندے کو اس کی محبت کا کروڑہا گنا زیادہ صلہ عطا فرمائے اور جب خدا تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو اسے اس بندے کے رات کے آرام اور دن کی گہما گہمی پر بھی پیار آنے لگتا ہے اور اسے بھی وہ اپنی رضا و خوشنودی کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔

محب اور محبوب میں فرق

محب اور محبوب میں فرق یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنی جلالتِ قدر کے باوجود مُحب کے درجے میں تھے چنانچہ وہ جنابِ باری میں عرض کرتے ہیں،

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۔ اے پروردگار! میرا سینہ کھول دے۔

جب کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم محبوب کے درجے میں تھے۔ آپ کی نسبت خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

(از صفحۂ گزشتہ)

یا ابن آدم اذا ذکرتنی خالیاً ذکرتک خالیاً و اذا ذکرتنی فی ملاء ذکرتک فی ملاء خیر من الذین تذکرنی منھو	اے ابنِ آدم! جب تو مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی تجھے تنہائی میں یاد کرتا ہوں اور اگر تو میرا ذکر کسی مجلس میں کرتا ہے تو میں اس مجلس سے بہتر مجلس میں تیرا ذکر کرتا ہوں، جس میں تو نے میرا ذکر کیا۔

(مسند بزاز عن ابن عباس
نیز عزالدین بلیق، منہاج الصالحین، ص ۹۱۸)

(صفحہ ہذا)

لہ طٰہٰ (۲۰:۲۵)

Marfat.com

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ [1] (اے پیارے محمدؐ) کیا ہم نے تمہارے لیے تمہارا سینہ کھول نہیں دیا۔

اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام محب کے درجے میں تھے، دعا کرتے ہیں:

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ اے پروردگار مجھے توفیق عطا فرما

نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ کہ جو احسان تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ

وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ پر کیے ہیں ان کا شکر ادا کروں اور ایسے

صَالِحًا تَرْضٰىهُ [2] نیک کام کروں کہ تو ان سے خوش ہو جائے

ثابت ہوا کہ محب خدا کی رضا کا طلبگار ہوتا ہے، لیکن اگر خدا کسی کو اپنا محبوب بنالے تو اُسکی نسبت ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ اور (اے پیارے محمدؐ) تمہیں پروردگار

رَبُّكَ فَتَرْضٰى [3] عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام خدا سے محبت کرنے والے نبی تھے، وہ درخواست کرتے ہیں:

رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ [4] اے خدا مجھے جلوہ دکھا کہ میں تیرا دیدار کرسکوں۔

---

[1] الم نشرح (۹۴، ۱)

[2] النمل (۲۷، ۱۹)

[3] الضحیٰ (۹۳، ۵)

[4] الاعراف (۷، ۱۴۳)

Marfat.com

مگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرب کا تمغۂ افتخار خود ذاتِ باری کی طرف سے مرحمت ہوتا ہے۔

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى

پھر ذاتِ حق خود قریب ہوئی پھر مزید قرب چاہا تو درمیان میں دو کمان کا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم۔

اور ــــــ

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى [1]

ان کی آنکھ دیدار کے وقت نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ جس سے محبت فرماتا ہے اسے بن مانگے اور بلا سوال اتنا کچھ عطا فرماتا ہے جو دوسروں کو مانگنے اور سوال کرنے کے باوجود مرحمت نہیں کیا جاتا۔

یہ محبتِ الٰہی کا پاکیزہ جذبہ ہے جو انسان کے دل میں ایمان کو متحقق کرتا ہے اور باری تعالیٰ کی طرف سے متعدد خصوصی انعامات کا استحقاق پیدا کرتا ہے۔

لہذا ایمان باللہ کا پہلا تقاضا، محبتِ الٰہی ہے جس کے بغیر ایمان خالی دعوے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی سے لذتِ ایمانی نصیب ہوتی ہے اور اسی سے حلاوتِ اطاعت۔ اور یہ محبت جس قدر کامل ہو گی، ایمان اسی قدر مضبوط اور مستحکم ہو گا۔

---

[1] النجم (۵۳ ، ۸ ، ۹ ، ۱۷)

Marfat.com

اطاعتِ الٰہی

"محبّت الٰہی" کے موضوع پر تفصیلاً اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے اور یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ کس کس زاویے سے محبّتِ الٰہی انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اور بندہ کس طرح محبتِ الٰہی کی شرائط پر پورا اُتر سکتا ہے۔

اس تمام بحث سے قدرتی طور پر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر محبتِ الٰہی اس امر کی مقتضی ہے کہ انسان ہر وقت خدا تعالیٰ ہی کو یاد کرتا رہے اور اس کے سوا عمر بھر کسی کو یاد نہ کرے ـــــ تو یہ تقاضائے محبت صرف اسی طرح پورا ہو سکتا ہے کہ لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہمہ وقت یادِ الٰہی میں مصروف رہیں۔ وہ اپنے کاروبار بھول جائیں، اپنی تمام معاشرتی، تعلیمی، سماجی اور دوسری ذمہ داریاں فراموش کر دیں ـــ بالفاظِ دیگر اس کا مفہوم گویا دنیا کو چھوڑ کر جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جانا اور غاروں اور کھوہوں میں ٹھکانہ کر کے یادِ الٰہی میں مصروف رہنا ہے۔ اس سوال کا جواب اطاعتِ الٰہی کے تصور میں پنہاں ہے جس کی وضاحت آئندہ سطور میں کی جائے گی۔

محبت و اطاعت کا باہمی ربط

یاد رکھیے کہ ایمان باللہ ہم سے جس محبت کا تقاضا کرتا ہے، وہ ہرگز ایسی محبّت نہیں ہے، جو انسان کو دنیوی زندگی کے فرائض ادا کرنے سے غافل کر دے۔ یہ

Marfat.com

محبت کوئی ایسا جذبہ بھی پیدا نہیں کرتی جس سے انسان معاشی، معاشرتی اور عائلی ذمہ داریوں کو نبھانے سے غافل ہو جائے۔ اس کے برعکس اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ انسان عائلی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی ذمہ داریاں جس قدر دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ اور احکامِ الٰہی کے مطابق انجام دے گا، اسی قدر وہ خدا کی محبت کے تقاضے کی تعمیل کرنے والا شمار ہو گا۔ گویا محبت و اطاعتِ الٰہی دونوں ایمان باللہ کے بنیادی تقاضے ہونے کے ساتھ ساتھ باہم لازم و ملزوم بھی ہیں۔

محبوب کی اطاعت ہی کامل محبت کی دلیل ہوتی ہے

اس حقیقت کو اس مثال کے ذریعے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے دوستی کا دم بھرے اور یہ دعویٰ بھی کرے کہ مجھے تجھ سے بے پناہ محبت ہے اور میں ہر وقت تیری یاد میں مگن رہتا ہوں۔ اب اگر وہ شخص کہیں جانے لگے اور اس کا محبوب اسے یہ کہے کہ مجھے فلاں چیز مرغوب ہے، اسے تم میرے لیے لیتے آنا۔ یا یہ کہے کہ مجھے فلاں کام سے بڑی نفرت ہے اور جو کوئی اس کام کا مرتکب ہوتا ہے، مجھے اس سے بھی نفرت ہو جاتی ہے لہٰذا تم جہاں جا رہے ہو، وہاں اس کام سے بچتے رہنا۔ اب کچھ دنوں کے بعد محبت کا دعویٰ کرنے والے کی واپسی ہو اور وہ اپنے محبوب سے آ کر یہ کہے کہ میں وہاں ہر وقت اور ہر گھڑی تجھی کو یاد کرتا رہا ہوں مگر جو چیز تجھے مرغوبِ خاطر تھی، وہ میں نہیں لا سکا یا جس کام سے تجھے نفرت تھی میں وہ کام ترک نہیں کر سکا۔ آپ ہی بتائیے کہ اُس کا دعویٰ محبت سچا ہے یا جھوٹا؟ نیز یہ کہ ایسی محبت بھلا کس کام کی جس میں محبوب کی رضا اور عدمِ رضا کا خیال بھی دل میں نہ پایا جاتا ہو۔ اگر فی الواقع دل میں محبت ہو تو محبوب کی پسند اور ناپسند دل سے کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اگر محبّ کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں کام سے میرے محبوب کو نفرت ہے تو وہ یقیناً اس فعل کو

Marfat.com

ترک کر دے گا۔ اس لیے کہ محبوب کے ناپسندیدہ افعال کا ارتکاب سوائے دعویٰ محبت کی نفی اور صریح منافقت کے اور کیا ہو سکتا ہے ۔۔۔؟ اس لیے اسلام نے ایسی محبت کی تعلیم دی ہے جس میں نہ تو محبوب کی ذات کو فراموش کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی محبوب کی رضا و عدمِ رضا اور اسکے اوامر و نواہی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ اس لیے ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ [۱]

اے پیغمبرؐ آپ فرما دیجیے، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، پھر اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالے گا۔

بلاشبہ سچی اور بے لوث محبت اسی کو کہا جاتا ہے کہ آدمی ہر حال میں اس کام کو کر گزرے جس کے کرنے کا محبوب نے حکم دیا ہے اور اس کام سے رُک جائے جس سے اس نے منع کیا ہے۔ محبوب کے اوامر و نواہی دونوں پر عمل ہوتا رہے تو سمجھنا چاہیے کہ محبت کا دعویٰ کرنے والا اپنے دعوائے محبت میں سچا تھا۔ اور اگر محبت فقط محبوب کی شخصی یا ذاتی حد تک محدود ہو کر رہ جائے اور محبوب کی پسند اپنی پسند، اس کی نفرت اپنی نفرت نہ بنے تو محبت کے اس دعوے کو کذب اور ریاکاری تو کہا جا سکتا ہے، کامل اور حقیقی محبت ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان کے پہلے تقاضے یعنی "محبتِ الٰہی" کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب ایمان کے دوسرے تقاضے یعنی اطاعتِ الٰہی پر پوری طرح توجہ دی جائے کیونکہ محبتِ الٰہی درحقیقت اطاعت کے بسیط اور ہمہ جہتی نظام کا تقاضا کرتی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :

---

[۱] آل عمران (۳ : ۳۱)

من احب للّٰہ و ابغض للّٰہ و اعطی للّٰہ و منع للّٰہ فقد استکمل الایمان [1]

جس نے اللہ کے لیے محبت کی، اللہ کے لیے دشمنی کی، اللہ ہی کے لیے دیا اور اللہ ہی کے لیے روکا تو اس نے ایمان مکمل کر لیا۔

مقصد نزولِ احکام

انسانی زندگی کے معاملات میں کوئی ایسا معاملہ نہیں جس میں اللہ رب العزت نے اپنے ساتھ محبت کرنے والے انسانوں کو اپنی پسند اور ناپسند سے آگاہ نہ کر دیا ہو یہی وجہ ہے کہ نزولِ قرآن اور نزولِ احکام کا سب سے بڑا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ بندوں کو خدائے تعالیٰ کی مرضی اور ناپسندیدگی سے واقف کر دیا جائے۔ اسی بنا پر ارشادِ باری ہے:

وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ [2]

اور یہ کتاب بھی ہمی نے اتاری ہے جو برکت والی ہے۔ تم اس کی پیروی کرو اور خدا سے ڈرو تاکہ تم پر مہربانی کی جائے۔

قرآن کریم کے علاوہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ کے ذریعے بھی انسانیت کو افعال کے حسن و قبح سے آگاہ کیا گیا۔ ارشاد ہے:

من اطاع محمداً فقد اطاع اللّٰہ و من عصی محمداً فقد عصی اللّٰہ و محمدٌ فرقٌ بین الناس [3]

جس نے محمدؐ کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی۔ جس نے محمدؐ کی نافرمانی کی، اس نے خدا کی نافرمانی کی اور محمدؐ کی ذات گرامی اچھے اور برے لوگوں کے درمیان تفریق کا معیار ہے۔

---

[1] ابوداؤد عن ابی امامہؓ

[2] الانعام (۶: ۱۵۵) [3] البخاری جلد اول

Marfat.com

آئیے اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ربّ العزت نے انسانی زندگی کے مختلف معاملات میں اپنے ساتھ محبت کرنے والوں کو کس طرح اپنی پسند وناپسند سے آگاہ کردیا ہے تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ اس سے محبت کا دم بھرنے والے اپنی عملی زندگی میں اسکی پسند وناپسند اور رضا وعدم رضا کا کس قدر خیال رکھتے ہیں۔

عائلی زندگی عائلی وخانگی زندگی کا قیام انسانی فطرت کا اوّلین تقاضا اور معاشرتی وسماجی زندگی کی خشت اوّل ہے۔ ازدواجی تعلق اگر پاکیزہ مقاصد کے تحت قائم کیا جائے تو یہ حکم الٰہی کی تکمیل ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ [۱] — جو عورتیں تمہیں پسند ہوں (یعنی تمہارے لئے روا ہوں) ان سے نکاح کرلو۔

چنانچہ نکاح جو انسان کے داعیہ شہوت کی تکمیل کا ذریعہ بھی ہے اگر اطاعتِ الٰہی کے جذبے کے تحت کیا جائے تو عین عبادت بن جاتا ہے اور محبتِ الٰہی کے جذبے کا آئینہ دار قرار پاتا ہے

ایفائے عہد: قرآن پاک میں معاشرتی، سماجی، سیاسی اور کاروباری زندگی کو بطریقِ احسن گذارنے کے لئے ایسے احکام دیئے گئے ہیں جن سے زندگی کے ان شعبوں میں موجود خرابیوں کا قلع قمع ممکن ہے اس سلسلے میں ایک اہم حکم ایفائے عہد سے متعلق ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] النساء (۴:۳)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا	اے ایمان والو! اپنے وعدے
اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ [1]	(اقرار) پورے کیا کرو۔

یہ حکم گویا اس انداز سے دیا گیا ہے کہ اے ایمان والو! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے تمہارا محبوب اپنی ذات سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ تم اپنے عہد و پیمان پورے کرو اور ہرگز بدعہدی نہ کرو۔

اب اگر محبت کا دم بھرنے والوں کا خدا سے رشتۂ محبت سچا اور حقیقی ہوگا تو وہ زندگی میں قدم قدم پر خالق و مخلوق کے ساتھ بلاواسطہ یا بالواسطہ کیے گئے عہد و پیمان کی پاسداری کرتے ہوتے ہمہ وقت اپنے محبوب کی رضا کے طالب رہیں گے۔

اکلِ حلال کا حکم اسی طرح ایک مقام پہ اکل حلال کے بارے میں اپنے ساتھ محبت کرتے والوں کو اپنی پسند سے اس طرح آگاہ کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	اے اہل ایمان۔ ایک دوسرے
لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ	کا مال ناحق نہ کھاؤ ہاں اگر
بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ	دوسرے کی رضا و رغبت
اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً	سے تجارتی نوعیت کا لین دین
عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ [2]	ہو تو یہ جائز ہے۔

چنانچہ اس حکم کے ذریعے دوسروں کے اموال کو ناجائز طریقوں مثلاً: رشوت۔ ڈاکہ زنی، چوری۔ غبن۔ چور بازاری۔ ناجائز منافع خوری

---

[1] المائدہ (۵: ۱) [2] النساء (۴: ۲۹)

Marfat.com

سمیت تمام باطل ہتھکنڈوں سے ہتھیانے کی ممانعت کر دی گئی ہے اور اہل ایمان پر ان کے محبوب کی اس خواہش کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ ناجائز ذرائع سے دوسروں کا مال ہتھیانا اسے ناگوار گزرتا ہے لہذا محبت الٰہی کے دعویدارو اس سے باز رہو۔ چنانچہ اگر انسان محبت الٰہی کا دعویٰ بھی کرتا رہے اور ساتھ ہی ساتھ ناجائز طریقوں سے دوسروں کے اموال بھی ہتھیاتا رہے تو ایسا شخص نہ صرف اپنے دعوائے محبت میں جھوٹا ہے۔ بلکہ اس کا ایمان بھی محلِ نظر ہے۔ کیونکہ ایسے گھناؤنے کردار کا حامل شخص خود اپنے عمل سے اپنے دعویٰ ایمان کی نفی کر رہا ہے۔

فضلِ خداوندی کی تلاش

کاروبار، تجارت اور اکتساب معیشت کے لئے جائز ذرائع سے مال حاصل کرنے کو قرآنِ کریم میں فضلِ خداوندی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ	پھر جب نماز سے فارغ ہو چکو
فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ	تو کرہ ارض پر مختلف سمتوں
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ [1]	میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

رزق کمانے کی جدوجہد تو کم و بیش ہر شخص کرتا ہے۔ مومن بھی اور کافر بھی۔ فرق تو صرف کمانے کے طریقوں میں ہے۔ یہاں رب العزت

---

[1] الجمعہ (۶۲ : ۱۰)

Marfat.com

کے ساتھ محبت کا دم بھرنے والوں کو اقتصادی زندگی کا سلیقہ سکھلایا جا رہا ہے۔ کہ روزی اس انداز سے کماؤ کہ تمہارے لئے فضلِ خداوندی قرار پاتے۔ ایسے ناجائز اور باطل ہتھکنڈے مت استعمال کرو کہ یہی رزق جسے فضلِ خداوندی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ تمہارے لئے موجب وبال و عذاب بن جائے گویا روزی اس انداز سے کمائی جائے کہ بیوی بچوں کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں اور محبتِ الٰہی کے تقاضے بھی پامال نہ ہونے پائیں۔ بلکہ محبت الٰہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کی گہما گہمی بھی انسان کو اسکی یاد سے غافل نہ کرنے پائے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ [۱]	خُدا سے محبت کرنے والے لوگ تو وہ ہیں کہ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت کے معاملات بھی یادِ خداوندی سے غافل نہیں کر سکتے۔

چنانچہ خدا سے محبت انسان کو سماجی زندگی سے بیگانہ نہیں کرتی بلکہ بھرپور معاشرتی زندگی کی تعلیم دیتی ہے

قائم اللیل اور صائم النہار کو حضورؐ کا حکم

اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ کتب حدیث میں ملتا ہے کہ آنحضرتؐ ایک صحابیؓ کی شادی ہوئی۔ چند دنوں بعد اُن کی زوجہ خدمت نبوی صلی اللہ

---

[۱] النور (۲۴ : ۳۷)

علیہ وسلم میں حاضر ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے استفسار فرمایا۔ بتاؤ تمہارا خاوند کیسا ہے۔ اور تم نے شادی کے بعد اسے کیسا پایا۔ صحابیہؓ عرض کرنے لگی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ میرا خاوند بہت نیک انسان ہے۔ روزانہ روزہ رکھتا ہے اور مصلے پر کھڑے کھڑے عبادت میں رات بسر کر دیتا ہے۔ میں بڑی خوش قسمت ہوں۔ اس سے بہتر خاوند مجھے کیسے میسر آسکتا ہے۔ اس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس صحابیؓ کو طلب فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ بصیرت نے اس صحابیہؓ کے تعریفی کلمات میں چھپے ہوئے شکوے کو جان لیا تھا۔ جب وہ صحابیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ ساری رات مصلّے پر کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے سے بہتر ہے کہ بیوی کے حقوق پورے کیا کرو۔ رب العزّت ایسی نفلی عبادت ہرگز قبول نہیں کرتا جس سے انسان پر عائد معاشرتی و سماجی فرائض ترک ہو جائیں۔

اس مثال سے درحقیقت یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ خداوند قدوس سے محبت کا دعویٰ کرنے والوں کو زندگی میں ہر ہر قدم پر اسکی رضا و عدم رضا اور پسند ناپسند کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اگر زندگی کے ہر ہر معاملہ اور ہر ہر سطح پر اُس کی رضا و عدم رضا اور پسند و ناپسند کو ملحوظ رکھا جائے تو جہاں ایک طرف معاشرہ ہر سطح پر سکون و طمانیت کا گہوارہ بن جائے گا۔ دوسری طرف پوری معاشرتی زندگی احکام خداوندی کے تحت منضبط ہو کر اسکی محبت کی آئینہ دار بن جائے گی اس طرح انسان کو زندگی میں ہر سطح پر وہ ایمانی حلاوت اور چاشنی نصیب ہوگی۔ جو اسلامی معاشرے کا طرّہِ امتیاز ہے۔

Marfat.com

عمل میں ترجیحات کے تعین کا فلسفہ

جس طرح ہم روزمرہ زندگی میں اپنے معمولات میں ترجیحات کا تعین کرتے ہیں اور یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ سب سے مقدم (FIRST PRIORITY) پر کس کو رکھنا ہے اور اس کے بعد دوسرے درجے (SECOND PRIORITY) پر کونسی چیز ہے، اسی طرح شریعتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا التحیۃ والسلام نے بھی اعمال کے مدارج اور ترجیحات مقرر کی ہیں۔ قرآنِ کریم اور احادیثِ مبارکہ میں ہمیں یہ ترجیحات پوری تفصیل کے ساتھ ملتی ہیں۔ ان کا تعلق حکم کی نوعیت سے ہوتا ہے خواہ وہ حکم مال کمانے سے متعلق ہو یا عبادت سے متعلق۔ جس کام کو جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دے کر اس کی تعیین فرما دی ہے اس وقت اس کام کو کرنا ہزار ہا نفل نماز پڑھنے اور نفلی روزے رکھنے سے افضل ہے اور فرض کو ترک کر کے عمر بھر کے نفلی روزے اور کروڑ ہا نوافل پڑھ کر بھی اس کی تلافی (COMPENSATION) نہیں ہو سکتی۔ لہٰ فرض کی ادائیگی بہرحال فرض کا اور نوافل کی ادائیگی نوافل کا درجہ رکھتی ہے۔

اسلام کا تصوّرِ عبادت

اس بنا پر اسلام کا تصوّرِ عبادت بھی دوسرے ادیان کے تصوّرات سے قطعی مختلف ہے۔ اسلام ہمیں محبتِ الٰہی، اس کے احکام کی اطاعت اور اس کے مقرر کردہ شرائع کی پیروی و پابندی کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن کریم میں اس جامع تصور کو بیان کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے:

Marfat.com

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ [1]

اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو، یہاں تک کہ تمہیں یقین حاصل ہو جائے۔

ایک مغالطے کا ازالہ

بعض علما اس آیت میں حکمِ خداوندی "حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" میں "الیقین" سے موت مراد لیتے ہیں، اور یہ معنی کرتے ہیں کہ تو خدا کی عبادت کرتا چلا جا تا آنکہ تجھے موت آجائے۔ ہمارے خیال میں اگر اس آیت میں یقین سے مراد موت لی جائے تو اس آیت کی ساری معنویت ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ مفہوم آیتِ مبارکہ کے سیاق و سباق سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

یقین کا اصل مفہوم

اس آیت کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ایمانیات کے سلسلے کے خطبے "ایمان اور اس کی حقیقت" کو ذہن میں مستحضر کرنا ہوگا[2]۔ اس میں بالتفصیل واضح کیا گیا ہے کہ ایمان کی آخری حالت کا نام ایقان ہے۔ ایمان جب یقین کی اس حالت کو پہنچ جائے تو اسے ایمانِ کامل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس بنا پر اس آیتِ مبارکہ کا مفہوم یہ ہوگا:

"تو اپنے رب کی اتنی عبادت کر کہ تیرا ایمان اپنے کمال کے آخری نقطے کو پہنچ جائے۔"

یقین کا آخری نقطہ مگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کا آخری نقطہ کیا ہے؟

---

[1] الحجر (۱۵: ۹۹) [2] کتاب "ایمان اور اسلام" مطبوعہ اتفاق اسلامک اکیڈمی

Marfat.com

آخری نقطہ یہ ہے کہ مومن اپنے اس وصف کی تکمیل کرے جس سے اس نے ایمان کا آغاز کیا تھا یعنی وہ ایمان بالغیب کی صفت کو اس طرح پروان چڑھائے کہ اس کا ایمان بالغیب ایقان باللہ بن جائے۔ سورۃ البقرہ کی حسب ذیل آیت سے اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے، ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ [۱]

وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو کتاب (اے رسول) آپ پر نازل ہوئی اور جو کتابیں پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں، ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

غور کیجیے اس آیۂ مبارکہ میں پہلے فرمایا گیا کہ ایمان بالغیب حاصل کرو، پھر حکم دیا کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت، اس کی عبادت اور اس کے احکام کی پیروی سے ایمان کو درجۂ کمال تک پہنچانے کی کوشش کرو۔ اور سب سے آخر میں فرمایا گیا کہ ان اعمال و افعال کے نتیجے میں اہلِ ایمان کو آخرت پر پختہ یقین حاصل ہوتا ہے۔ بات شروع ایمان بالغیب سے ہوئی تھی، مگر ختم ایقان پر ہوئی، جو اطاعت و عبادتِ خداوندی کے ذریعے رفتہ رفتہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔

سورۃ الحجر کی جو آیت پہلے بیان کی جا چکی ہے، اس میں بھی یہی فلسفہ بیان ہوا ہے کہ اپنے رب کی ——— اس طرح عبادت کر کہ تجھے اس کی ذات اور

---

[۱] البقرہ (۲: ۳-۴)

اس کے احکام کی نتیجہ خیزی پر پختہ یقین حاصل ہو جائے۔ یا یہ کہ عبادت تجھے یقین کی وہ منزل عطا کر دے جو کسی کو بلا حجاب دیکھ کر نصیب ہوتی ہے۔ ایک دوسرے مقام پر عبادت کے اسی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ اور میں نے جنوں اور انسانوں کو
إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ [1] اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

رہبانیت کی نفی

اسی بنا پر اگر عبادت کو فقط نماز روزے اور دوسری عبادات تک محدود تصور کر لیا جائے تو یہ بہت زیادتی ہوگی۔ کیونکہ ایسی صورت میں گویا قرآن انسانوں سے یہ تقاضا کر رہا ہے کہ وہ عائلی، ازدواجی، معاشی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کے ان تمام معاملات سے، جن کا حکم خود قرآنِ مجید میں موجود ہے، کٹ کر جنگلوں اور بیابانوں میں نکل جائیں۔ یہ درست ہے تو گویا اسلام مسلمانوں کو در پردہ رہبانیت کی تعلیم دے رہا ہے حالانکہ اسلام نہ تو رہبانیت کے نظام کی تعلیم دیتا ہے اور نہ اُسے پسند کرتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ آیتِ مبارکہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بیٹھ کر عبادت، ذکر اور "اللہ اللہ" کرتے رہیں۔ اللہ رب العزت اس آیت میں جس خاص نقطے کی طرف ہمیں متوجہ کرنا چاہتا ہے وہ ذرا مختلف ہے۔

---

[1] الطور (۵۲: ۵۶)

Marfat.com

آیۂ مبارکہ کا صحیح مفہوم

اس آیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے ہمیں روزمرہ زندگی کو سامنے رکھنا ہو گا۔ تیراکی ایک فن ہے، اس فن پر آپ کو بے شمار کتب مل جائیں گی، بے شمار لوگ بتلانے والے مل جائیں گے۔ بایں ہمہ محض کسی کتاب کو پڑھ کر یا محض کسی کی زبان سے سن کر کوئی بھی شخص تیراکی کا ماہر نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے لیے باقاعدہ آپ کو کسی تالاب میں کود کر ہاتھ پاؤں مارنے ہوں گے، تربیتی اور تجرباتی و عملی مراحل سے مکمل طور پر گزرنا ہو گا ——— پھر کہیں جا کر آپ پیراک بن سکیں گے۔ یعنی تیراکی صرف تیرنے، ڈوبنے اور ڈوب ڈوب کر بچ نکلنے سے آتی ہے انسان کسی نظریے یا مکتبی علم کی بنیاد پر کسی بھی فن میں اس وقت تک حقیقی مہارت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی یقین کی منزل سے ہمکنار ہو سکتا ہے جب تک وہ اس فن کے تجرباتی مراحل سے خود نہ گزرے۔

اس طرح اس مقام پر عبادت کے حکم میں درحقیقت خداوند تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ تعلیم دے رہا ہے کہ اے میرے بندو! جس ہستی پر تم بن دیکھے ایمان لے آئے ہو، اب اسی ہستی کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرو، خطرات سے الجھو مگر حق پر ثابت قدم رہو۔ باطل کو کلیتہً ترک کر دو، زندگی کی کیفیات میں خود کو گم کر دو، اور یوں زندگی کے ایسے کیف سے آشنا ہو جاؤ کہ کبھی حالات سے نبرد آزمائی میں تیرو اور کبھی ڈوبو، کبھی مشکلات کا سامنا کرو تو کبھی آسانیوں کا۔ یعنی زندگی مکمل طور پر میری تعلیم اور اس کے اوامر و نواہی کے مطابق بسر کرو۔ اس طرح جب تم زندگی میں میرے احکام کو تجرباتی توثیق کے مراحل (EXPERIMENTAL VERIFICATION) سے گزر کر دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ جو حکم میں نے دیا تھا، اسی کی بنا پر تمہیں کامیابی نصیب ہوئی اور جس کام سے منع کیا گیا تھا، اسی کے نتیجے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

Marfat.com

جب امر اور نہی کا یہ نتیجہ تجربہ و مشاہدہ کی بنا پر سامنے آجائے گا تو پھر بن دیکھے ہی گویا میری ذات کا مشاہدہ ہو جائے گا اور تمہیں یقین ہو جائے گا کہ کوئی ایسی ارفع و اعلیٰ ذات موجود ہے، جس کے احکام کی تعمیل میں کامیابی اور نافرمانی میں ناکامی مضمر ہے

اسی بنا پر یہاں عبادت کا وسیع تر مفہوم مراد ہے، اور وہ ہے اطاعتِ خداوندی یعنی جس کام کو کرنے کا اس نے حکم دیا، اُسے بجالانا اور جس کام سے اُس نے روکا، اُس سے باز رہنا۔

اصلی اور حقیقی عبادت کیا ہے؟

یہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ عبادت کا اصلی (لغوی) مفہوم انتہائی تذلل اور عاجزی اختیار کرنا ہے۔ اسی سے ایک لفظ عبودیت بنا ہے، جس کا مفہوم ہے، انسان کا خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں خود کو نہایت عاجز، انتہائی مسکین، سر بسر بے بس اور بے حد ذلیل سمجھنا۔ بارگاہِ خداوندی میں اسی احساسِ بندگی کا نام عبادت ہے۔

یہ تو عبادت اور عبودیت کا لغوی مفہوم ہوا، لیکن اس عبادت کی عملی شکل یہ ہے کہ جو شخص خود کو خدا تعالےٰ کا بندہ اور غلام ہونا یوں ثابت کرے کہ جس کام سے اس نے منع کیا ہے، اُس سے عمر بھر رُکا رہے اور جس کام کا اس نے حکم دیا ہے، اسے ساری زندگی یکساں ذوق و شوق سے کرتا رہے۔ خواہ وہ امور و نواہی مسجد اور اس کی چار دیواری سے متعلق ہوں خواہ ہسپتالوں اور مکتب و مدرسہ کی زندگی سے متعلق ہوں ان کا تعلق بیوی بچوں کے ساتھ سلوک سے ہو یا حکومتی اور ریاستی معاملات سے۔

الغرض انسانی زندگی کے جس شعبے میں جس ڈھب سے زندگی گزارنے کا خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اسی طریقے سے زندگی بسر کرنے کا نام عبادت ہے۔

Marfat.com

حاکم کی سب سے بڑی عبادت

مثال کے طور پر دیکھیے کہ حاکم کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ [۱] — اور اگر فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرنا۔

نیز فرمایا:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ [۲] — اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے فیصلہ کرو۔

اگر کوئی حاکم خدا تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق اپنی رعایا سے عدل و انصاف کا سلوک کرتا ہے، دن رات رعایا کے حقوق پورے کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے، ظالموں کو ظلم سے روکتا اور مظلوم کی دادرسی کرتا ہے، تو ایسا حاکم دنیوی زندگی بسر کر کے بھی سراسر خدا کی عبادت کر رہا ہے۔ ایسے حاکم کے لیے باری تعالیٰ نے قیامت کے دن خصوصی لطف و کرم کے سائے کا وعدہ کر رکھا ہے۔

عبادت کے اس وسیع مفہوم سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے درحقیقت عبادت کا ایک منفرد اور اچھوتا فلسفہ پیش کیا ہے جسے محض مان لینا کافی نہیں بلکہ اسے ہر طرح مان کر عملی حقیقت کے طور پر اپنانے سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعے کے ضمن میں ارشاد ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ — اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا

---

[۱] المائدہ (۵: ۴۲)

[۲] النساء (۴: ۵۸)

Marfat.com

اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ [1] | کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آکر کافر بن گیا۔

ابلیس کو اس موقع پہ یہ خیال تھا کہ میں جو بڑا صاحبِ فہم فرشتوں کا سردار اور بڑا ریاضت گزار ہوں مٹی کے پُتلے کو سجدہ کیوں کروں؟ —— اس کی نظر مٹی کے پتلے پر تو تھی، مگر حکم الٰہی، اس کی حقیقت اور اس کی اہمیتِ بے پایاں پر نہ تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ خدا تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے کہ اس وجود کو سجدہ کیا جائے، جسے وہ محض مٹی کا پتلا سمجھ رہا ہے۔ چنانچہ حکم خداوندی میں سرتابی سے وہ کفر و ضلالت کا شکار ہو کر ملعون اور مردود ٹھہرا۔ اگر غور کیجیے اس کے کفر کا سبب کیا تھا؟ کیا اس نے خداوند تعالیٰ کی توحید سے انکار کیا تھا؟ کیا اس نے ذاتِ جلّ و علا کی عبادت سے منہ موڑ لیا تھا؟ کیا وہ کسی شرک کا مرتکب ہوا تھا؟ حالانکہ وہ تو بزعم خویش اپنے آپ کو توحید کا سب سے بڑا علمبردار سمجھ رہا تھا۔ اگر ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو دیکھنا پڑے گا کہ وہ کون سا عمل تھا جس کا تعلق براہِ راست خُدا کی ذات سے تھا اور جس کا ابلیس نے انکار کیا تھا۔ وہ عمل حکم خدا سے سرتابی تھی۔ ابلیس سے بڑھ کر تو خُدا کی بارگاہ میں سجدے کرنے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن خدا نے اُسے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ ابلیس نے آدم کو حقیر جانا سجدے سے انکار کیا اور اسی بنا پر ملعون و مردود ٹھہرا۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ امر متحقق ہوا کہ خدا تعالیٰ کی عبادت، محض کثرتِ سجود اور کثرتِ نوافل ہی کو نہیں کہا جاتا۔ بلکہ خدا کی عبادت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کو بطیبِ خاطر اس طرح بجا لایا جائے کہ انکار کی مجال نہ رہے۔ عبادت کی اصل روح یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو جو حکم بھی دے، اس پر بلا چون و چرا عمل کیا جائے اور یہ حالت پختہ اعتماد اور یقین کے بغیر ممکن نہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ ابلیس

---

[1] البقرہ (۲ : ۳۴)

کا کفر خدا کی عبادت سے انکار کی بنا پر نہیں ہوا بلکہ اس کا کفر خدا تعالیٰ کی اطاعت سے انکار کی بنا پر ہوا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اطاعت و عبادتِ الٰہی کو صرف نماز روزے اور دیگر فرائض تک محدود سمجھنا غلطی ہے۔ اس کے برعکس حقیقی اور سچی عبادت یہ ہے کہ بندہ جس دن سن شعور کو پہنچتا ہے، اس دن سے اپنی زندگی کے آخری دن تک اس طرح زندگی گزارے کہ اس کا کوئی کام بھی شریعتِ اسلامیہ سے باہر نہ ہو۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کا بیوی بچوں سے سلوک، اپنے پڑوسیوں، اپنے ماتحتوں، اپنے افسروں، مزدوروں اور اپنے سے چھوٹوں اور بڑوں سے، الغرض ہر ذی قرابت اور ذی حق کے ساتھ اس کا سلوک اور معاملہ خدا کے حکم کی اطاعت سے باہر نہ ہو۔ یوں اگر کوئی انسان ذوی الحقوق کے حقوق پورے کرتا ہے، تو اس کی زندگی کے شب و روز اور اس کی حیات کا ایک ایک سانس مصرفِ عبادت ہے۔ اگر کوئی معالج پوری رات یا اس کا کچھ حصہ کسی کراہتے ہوئے مریض کے علاج معالجے کی غرض سے اس کے سرہانے گزار دیتا ہے، تو اس کا یہ عمل عمر بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔

قرآنِ حکیم نے عبادت کے اس جامع تصوّر کو یوں بیان کیا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا	نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب
وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ	(کو قبلہ سمجھ کر) کی طرف منہ کرو، بلکہ نیکی
وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ	یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روزِ آخرت پر
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	اور فرشتوں پر اور (خدا کی) کتاب پر اور
وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ	اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال عزیز
وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ	رکھنے کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں

Marfat.com

عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ [1]

محتاجوں اور مسکینوں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں (خرچ کریں) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جو عہد کریں، اس کو پورا کریں اور سختی اور تکلیف اور (معرکۂ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ نے عبادت کا وہ تصوّر پیش کیا ہے جو انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، خواہ ان کا تعلق مذہب سے ہو یا معیشت سے، معاشرت سے ہو یا سیاست سے، حالتِ جنگ سے ہو یا حالتِ امن سے۔ گویا عبادت، اطاعتِ الٰہی کی اس کیفیت کا نام ہے جو تمام عمر کے احوال کو محیط ہوتی ہے۔

یہ تصور رہبانیت عیسائیت کا پیدا کردہ ہے کہ بندہ صحیح عبادت اسی وقت کر سکتا ہے جب دنیا کے جھمیلوں سے یکسو ہو جائے۔ اسلام کا نظریہ اس سے قطعی مختلف ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت ہرگز انسان کو دوسرے

---

[1] البقرہ (۲ : ۱۷۷)

Marfat.com

انسانوں سے تعلقات منقطع کر لینے کا حکم نہیں دیتی۔ خدا کی عبادت کا صحیح تصور یہ ہے کہ جس رب کی تم عبادت کرتے ہو، اس کی پیاری مخلوق کے حقوق بجا لاؤ، جس ڈگر پر تمہارے خدا نے تمہیں چلنے کا حکم دیا ہے، اسی پر ساری زندگی چلتے رہو۔ اس مکمل نظامِ زندگی کا نام عبادت ہے۔

اطاعتِ الٰہی کا ثمر

اب اگر کوئی شخص خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے اور اس کے احکام کے مطابق اپنے شب و روز گزارے، تو اسے خدا کے ہاں سے یہ اجر ملتا ہے کہ پوری کائنات اس کے تابع کر دی جاتی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے،

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ [۱]	اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو اس نے اپنے حکم سے تمہارے تابع کر دیا ہے۔

گویا بقول اقبال،

ے
نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

شیخ محمد شربینی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

اگر کوئی انسان خدا تعالیٰ کی کامل اطاعت اختیار کر لے تو کائنات اس کے تابع کر دی جاتی ہے، یوں بندہ خدا کا شریک تو نہیں ہوتا لیکن محبت و اطاعتِ خداوندی کے اعلیٰ معیار پر فائز ہو کر محبوبِ خدا ضرور ہو جاتا ہے۔ پھر جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا

---

[۱] الجاثیہ (۴۵، ۱۳)

Marfat.com

ہے، وہی تقدیر الٰہی بن جاتا ہے۔ ۱؎ یعنی۔

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں (اقبال)

مصر کے ایک بزرگ شیخ محمد شربینی علیہ الرحمہ نہایت عبادت گزار اور برگزیدہ انسان تھے۔ ایک مرتبہ اُن کا اکلوتا بیٹا احمد سخت بیمار ہوا اور قریب المرگ ہو گیا مگر موصوف پھر بھی ہمہ تن مصروفِ عبادت رہے۔ آپ کی اہلیہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگیں کہ آپ کو تو محبتِ خداوندی کا خزینہ نصیب ہو چکا۔ پس اگر ہمارا یہ بیٹا مر بھی جائے تب بھی آپ کو کوئی پروا نہ ہوگی۔ البتہ میں مامتا کی ماری کہاں جاؤں گی۔ خدارا اپنے بیٹے کی صحتیابی کے لیے بارگاہِ رب العزت میں دعا کیجیے، مگر آپ بے فکر ہو کر بیٹھ رہے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ملک الموت بچے کی روح قبض کرنے کے لیے مریض کی بالین پر پہنچ گیا۔ ملک الموت ہو یا کوئی اور فرشتہ، خدا کی مشیت اور ارادے کے بغیر قدم نہیں اُٹھاتا۔ امام نبہانی نے امام شعرانی کے حوالے سے نقل فرمایا ہے کہ جب شیخ نے ملک الموت کو بچے کے سرہانے دیکھا تو ان پر اپنی اہلیہ کی گریہ وزاری کا اثر ہوا، اسی وقت ملک الموت کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا،

ارجع الیٰ ربک راجعۃ (اے ملک الموت) اپنے رب کے پاس

۱؎ احادیث میں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے،

رُبَّ اَشعَثَ اَغبَرَ لَو اقسَمَ علی اللّٰہِ لَاَبَرَّہٗ (البخاری و مسلم)

بہت سے پراگندہ حال اور گرد آلود بدن والے ایسے ہیں کہ اگر وہ خدا کے متعلق قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔

Marfat.com

فان الامر نسخ[1] — واپس لوٹ جا، کیونکہ اس بچے کی موت کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔

چنانچہ ملک الموت لوٹ گیا اور بچہ تندرست ہو گیا اور مزید تیس سال زندہ رہا[1]

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مقولہ

سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اس مقام پر فرماتے ہیں کہ اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:

یا بن آدم انا اللہ الذی لا الٰہ الا انا اقول لشیء کن فیکون اطعنی اجعلک تقول لشیء کن فیکون و قد فعل بکثیر من انبیائہ و اولیائہ و خواصہ من بنی آدم[2]

اے میرے بندے ہر چیز میرے قبضۂ قدرت میں ہے، میں جس چیز کو حکم دیتا ہوں وہ ہو جاتی ہے اور جس چیز کو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتی۔ اے میرے بندے اگر تو میرا حقیقی بندہ اور غلام ہو جائے، تو میں تجھے بھی اس قابل بنا دوں گا کہ تو جس سمت توجہ کرے "کُن" کہے گا، اشیاء تخلیق ہو جائیں گی۔ دوربت سے انبیاء و اولیاء و خواص ایسا کر چکے ہیں۔

---

[1] جامع کرامات الاولیاء از یوسف بن اسماعیل النبہانی، جلد اول، ص ۲۹۹۔ نیز جمال الاولیاء، از مولانا اشرف علی تھانوی، ص ۲۰۲

[2] فتوح الغیب، مقالہ ۱۶۔ اس خاصیت کے عطا کیے جانے پر امام عبدالوہاب شعرانی یوں وضاحت فرماتے ہیں

(باقی حاشیہ آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

گویا انسان سے جس محبت کا مطالبہ کیا جا رہا ہے، اس کے لیے اطاعتِ خداوندی لازمی ہے اور اگر بندہ خدا تعالیٰ کی اطاعت میں آجائے تو پوری کائنات اس کے تابع فرمان ہو جاتی ہے۔ لہٰذا بندہ جوں جوں اطاعتِ الٰہی کے بلند مرتبے پر فائز ہوتا چلا جاتا ہے، اس کا ایمان اور محبت نقطۂ کمال کو پہنچتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس کی عبدیت کامل ہونے لگتی ہے نتیجۃً وہ مردِ حق جو پہلے مطیع اور محب تھا کامل اطاعت کے صلے میں مطاع اور محبوب کے مقام پر فائز کر دیا جاتا ہے۔

فاذا اعطی الحق بعض خواصہ فی ھذہ الدار حرف کن ھل یتصرف بھا ام الادب ترکہ (فالجواب) کما قال الشیخ فی الباب السابع والسبعین ومائۃ ان من ادب اھل اللہ اذا اعطاھم اللہ تعالیٰ التصرف بلفظۃ کن فی ھذہ الدار لا یتصرفون بھا لان محلھا الدار الاخرۃ و لکنھم جعلوا مکان لفظ کن بسم اللہ لیکون التکوین للہ تعالیٰ ظاھرًا کما ھو لہ تعالیٰ باطنًا

(الیواقیت والجواہر، ص ۱۴۷)

اگر یہ کہا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ اس دنیا میں اپنے خواص کو حرف کن کا وصف عطا کرتا ہے، تو کیا وہ اس سے تصرف بھی کرتے ہیں یا ادباً ترک کر دیتے ہیں۔ پس اس کا جواب یہ ہے جیسا کہ شیخ نے باب ۱۷۷ میں بیان فرمایا ہے کہ بیشک اہل اللہ کا طریقہ یہی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انہیں لفظِ کن کا تصرف عطا فرما دے تو وہ اس تصرف کو ادباً استعمال میں نہیں لاتے کیونکہ اس کا مقام دارِ آخرت ہے، لیکن وہ تصرفات میں بجائے لفظِ کن کہنے کے بسم اللہ کہہ لیتے ہیں، تاکہ تکوین کی نسبت ظاہری بھی اللہ کی طرف ہو جائے جیسے کہ باطناً ہے۔

Marfat.com

پھر اس کا اپنا وجود ایسا اکسیر بن جاتا ہے کہ مس خام کو بھی کندن بنا دیتا ہے۔ اسے لازوال رفعت اور عزت نصیب ہو جاتی ہے، اسے حیاتِ جاوداں بخش دی جاتی ہے، اس کے ذریعے لوگوں کی مرادیں اور آرزوئیں پوری ہونے لگتی ہیں، دنیا کی آفتیں اور مصیبتیں اس کی برکت سے ٹلنے لگتی ہیں۔ وہ شہروں اور ریاستوں کا منتظم بنا دیا جاتا ہے۔ لوگوں کی مشکلات اس کی دعا سے حل ہونے لگتی ہیں۔ وہ عوام و خواص بلکہ خلائق کا مرجع بنا دیا جاتا ہے۔ وہ نہ صرف خود سعادتمند ہو جاتا ہے بلکہ جو کوئی اس کے دامن سے صدقِ دل کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے، اُس کی شقاوت بھی سعادت میں بدل جاتی ہے۔ اس کی نگاہِ حیات بخش سے مردہ دلوں کو زندگی اور پژمردہ روحوں کو تازگی نصیب ہوتی ہے۔ اس کی صحبت بدبختی کو خوش بختی میں بدلتی ہے، اس کی دوستی آخرت کو سنوارتی ہے اور اس کی دشمنی غضبِ الٰہی کا باعث ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ارشاد ہوتا ہے:

من عادی لی ولیا — جو کوئی میرے ولی سے دشمنی رکھے گا،
فقد اذنتہ بالحرب — میں اس سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں۔

یہ ایمان باللہ کا دوسرا تقاضا ہے جس سے پہلے تقاضے یعنی محبتِ الٰہی کی تصدیق ہوتی ہے۔

Marfat.com

ایمان باللہ کا تیسرا تقاضا

توکّل علی اللہ

ایمان باللہ کا تیسرا تقاضا توکّل علی اللہ [1] ہے، یعنی ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسا اور اعتماد کرنا ہے قرآن حکیم ایک مقام پر موسیٰ علیہ السلام کا ارشاد نقل کرتا ہے:

وَقَالَ مُوسٰى يٰقَوْمِ إِنْ — اور موسیٰؑ نے کہا اے اہلِ قوم! اگر

---

[1] توکّل باب تفعّل سے مصدر ہے، بقول امام راغب الاصفہانی، اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے۔

(ا) لام کے صلے کے ساتھ مثلاً توکلت لفلان، (میں فلاں کی ذمہ داری لیتا ہوں) یہ دوسرے کی ذمہ داری خود لینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

(ب) علیٰ کے صلے کے ساتھ، مثلاً توکلت علیہ (میں نے اس پر بھروسا کیا) اس صورت میں اس کا مفہوم کسی معاملے میں دوسرے پر بھروسا کرنا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ اسی معنی میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، مثلاً ارشاد باری ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ (ابراہیم ۱۴: ۱۲) — اور توکّل کرنے والوں کو خدا پر ہی بھروسا کرنا چاہیے۔

اسی مادے سے تواکل (بروزن تفاعل) ہے جس کا مفہوم ہے لوگوں کا اپنے کام کی ذمہ داری ایک دوسرے پر عاید کرنا۔ اسی سے لفظ وکیل (فعیل بمعنی مفعول) ہے، جس کے معنی ہیں وہ شخص جو کسی معاملے میں ذمہ دار متصور ہو (مفردات القرآن۔ ص ۹۹۳، ۹۹۴)

Marfat.com

كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ [1]

تم خدا پر ایمان لاتے ہو اور (دل سے) فرمانبردار ہو تو اسی پر بھروسا رکھو۔

اس آیت میں نہ صرف یہ کہ ذات باری پر ہر معاملے میں توکل کو جزوِ ایمان کہا گیا ہے بلکہ فی الواقع اسے شرطِ ایمان قرار دیا گیا ہے۔ حرف "اِنْ" (اُردو میں اس کا ترجمہ "اگر" سے کیا جاتا ہے) اور اس کے بعد کا جملہ شرطیہ ہے، جس کی جزا "فعلیہ توکلو" ہے۔ ان دونوں کو باہم ملانے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر اللہ کی ذات پر ایمان ہوگا تو اس پر توکل اور اعتماد بھی ہوگا اور اگر اللہ کی ہستی پہ توکل نہیں ہے، تو ایسی صورت میں ایمان بھی متحقق نہیں۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جس ذات سے کامل محبت ہو اور اس کی کامل اطاعت کا جذبہ بھی دل میں موجزن ہو تو انسان اس محبوب کی ذات پہ انحصار بھی کرنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس یہ بات ناممکن ہے کہ آپ کو کسی شخص سے محبت ہو، اس کی اطاعت کا جذبہ بھی دل میں پایا جاتا ہو، مگر اس شخصیت پر انحصار کرنے کو جی نہ چاہے۔

محبت انتہائی غیرت مند جذبہ ہے جس سے بڑھ کر غیرت مندی کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ محبت یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ دعوائے محبت کرنے والے کی آنکھیں اپنے محبوب کے سوا کسی اور کی طرف بھی اٹھیں اور نہ ہی محبوب اپنی محبت میں کسی غیر کی شرکت کو برداشت کر سکتا ہے۔

محبت کے ساتھ جب اطاعتِ الٰہی کا جذبہ بھی شامل ہو جائے تو ان دونوں سے ایمانِ کامل کا خمیر تیار ہوتا ہے، جس کا مزاج سراسر توحید ہے اور توحید کا پہلا تقاضا توکل علی اللہ ہے۔ یعنی یہ کہ ہر حالت میں انسان اپنے تمام تر اعتماد کا مرکز

---

[1] یونس، ۱۰ : ۸۴)

اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھے۔[1]

توکّل کی حقیقت

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ توکّل ترکِ اسباب و وسائل کا نام ہے، حالانکہ خدا تعالیٰ کو ایسا توکّل قطعاً منظور نہیں جس میں اسباب سے کلیتہً قطع نظر کر لیا جائے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ توکل اسباب اختیار کرنے کے باوجود، ان پر اعتماد نہ کرنے اور فقط اللہ کی ذات پر بھروسا کرنے کا نام ہے۔ اسلام ہمیں یہ تلقین کرتا ہے کہ ہم اسباب اور وسائل سے ضرور استفادہ کریں، انہیں ضروریاتِ زندگی سمجھ کر ضرور کام میں لائیں، مگر ہمارا آخری بھروسا اور اعتماد اسباب و وسائل پر نہ ہو، بلکہ اصل مسبب الاسباب اور ربِ کائنات کی ذات — پر ہو۔ ارشادِ خداوندی ہے،

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا[2]

وہی مشرق اور مغرب کا رب ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کو اپنا کارساز بناؤ۔

---

[1] اسی بنا پر قرآن کریم میں ایک جگہ بالصراحت یہ حکم دیا گیا ہے:

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (ابراہیم-۱۴، ۱۱)

اور خدا ہی پر مومنوں کو بھروسا رکھنا چاہیے۔

یہاں لفظ "فلیتوکل" صیغۂ امر ہے اور اصولِ فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی حکم صیغۂ امر کے ساتھ دیا جائے تو اُس کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اس آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہر مومن کو خدا پر توکل رکھنا ضروری اور لازمی ہے۔

Marfat.com

رب کائنات کا مفہوم

اس آیۂ مبارکہ میں لفظ "رب" آیا ہے، جو قرآن کریم کی سورہ فاتحہ اور سورۂ علق کی اولین آیات میں بھی استعمال ہوا ہے۔ لفظ رب کے معنی ہیں، کسی چیز کو تدریجاً نشوو نما دے کے حدِ کمال تک پہنچانا[1] یعنی کسی چیز کی اس انداز میں تربیت کرنا کہ اسے عدمِ محض سے اُٹھا کر، اُس کے ظرف اور اس کی استعداد کے مطابق تدریجی طور پر اسے درجۂ کمال تک پہنچا دیا جائے۔ گویا رب اس ہستی کو کہتے ہیں جو انسانوں اور دیگر مخلوقات کی اسطرح پرورش

(از صفحۂ گزشتہ)

[2] المزمل (۷۳: ۹) اسی مضمون کی ایک آیت سورۂ الانعام کے اختتام پر ہے، ارشاد ہے،

قُلْ اَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ ھُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ — کہو کیا میں پروردگار کے سوا اور پروردگار تلاش کروں۔ وہی تو ہر چیز کا رب ہے۔

(۶: ۱۶۴)

اور سورۂ فاتحہ میں جہانوں کے "رب" کے نام سے یہی مضمون بیان کیا گیا ہے (۱: ۱)

(صفحۂ ہٰذا)

[1] الراغب، مفردات، ص ۳۳۲، اُردو ترجمہ۔ رب اصلاً مصدر (بمعنی تربیت کرنا، پرورش کرنا) ہے، مگر استعمال فاعل (یعنی تربیت کرنے والے) کے معنوں میں ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں نہ صرف یہ کہ اسی نقطے کو حرفِ آغاز ٹھہرایا گیا ہے بلکہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ تمام دنیا کے انسانوں نے سب سے پہلے عالمِ ارواح میں اللہ رب العزت کی ربوبیت کا اقرار کیا تھا (الاعراف ۷: ۱۷۲) شیخ فریدالدین عطار اسی موقع کے لیے فرماتے ہیں،

ع چوں بلیٰ گفتی بحق تنبل مباش

Marfat.com

حفاظت اور نگہداشت کرے کہ ان کی کوئی روحانی ضرورت اور طبعی و جسمانی حاجت اس کی نگاہوں سے مخفی نہ ہو۔

خود حضرتِ انسان کے اپنے وجود میں اللہ رب العزت کی ربوبیتِ کاملہ کی زبردست شہادت پائی جاتی ہے، کیونکہ اس پر ایک زمانہ ایسا گزر چکا ہے جب وہ عدم محض تھا، ارشاد ہوتا ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا [1]	بے شک انسان پر زمانے میں ایسا وقت بھی گزر چکا ہے جبکہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہ تھا

پھر مراحلِ حیات اس پر آسان کیے گئے اور اسے مختلف مراتب سے نوازا گیا، ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۙ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ [2]	اے انسان! تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس نے دھوکہ دیا۔ وہی تو ہے جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضا کو ٹھیک کیا اور تیری قامت کو معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

جس طرح انسان عدم محض سے وجود کی طرف بڑھا ہے، اسی طرح پوری کی پوری کائنات بھی کسی زمانے میں عدم محض تھی جسے اللہ رب العزت نے اپنے کلمۂ کُن سے

---

[1] الدھر (۷۶: ۱)

[2] الانفطار (۸۲: ۶ تا ۸)

اس مرتبے اور منزل تک پہنچایا۔ ارشاد ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ	اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز
شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ	کا ارادہ کرتا ہے تو اسے فرما دیتا ہے کہ
فَيَكُوْنُ ؂	ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

"فیکون" مضارع کا صیغہ ہے اور عربی زبان کی گرامر کا قاعدہ ہے کہ مضارع کے صیغے میں دوام اور استمرار پایا جاتا ہے۔ یعنی اس کا مفہوم زمانۂ حال سے زمانۂ مستقبل کی طرف محیط ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہوا کہ خداوندِ قدوس جس سمت حرفِ کن سے اشارہ فرماتا ہے، ربِ کائنات کے اس فرمانِ محض سے نہ صرف اس شے کو خلعتِ وجود عطا ہو جاتی ہے بلکہ حرفِ "کن" کی توجہ کا اثر اس شے کی تخلیق کے بعد بھی اس سے منقطع نہیں ہوتا۔ یہ تعلق قائم رہتا ہے، تاآنکہ وہ شے اپنی ارتقائی منازل طے کرتے کرتے اپنے کمالِ وجود پر منتہی ہو جاتی ہے۔ اسی تصور کو جدید اصطلاح میں (EVOLUTION) کہا جاتا ہے۔

؂ یٰسین (۳۶ : ۸۲)۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ	اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی
كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ	طرح ایک بات ہوتی ہے۔

(القمر، ۵۴ : ۵۰)

اس سے مراد ہے کہ حکمِ الٰہی کے وقوع اور اس کے نفاذ و تعمیل میں کوئی تاخیر نہیں ہوتی؛ اگرچہ تکوینی مصالح کے تحت اللہ تعالیٰ نے کائنات کی مختلف اشیا کو کم و بیش مدتوں میں تدریجی طریقے سے منزلِ کمال تک پہنچایا ہے۔

Marfat.com

ارتقائے کائنات کا قرآنی نظریہ

چنانچہ ارتقائے کائنات کا قرآنی نظریہ یہ ہے کہ انسان ہو یا کائنات یا اس میں بسنے والی تمام چھوٹی اور بڑی مخلوقات، ان سب کو اپنی پیدائش سے لے کر اپنی فطری انتہا تک لمحہ بلحہ خداوند تعالیٰ کی توجہ اور اس کے الطاف و عنایات کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اگر ایک لمحے کے لیے وہ ذات اپنی توجہات کسی شے سے ہٹا لے تو اس کا وجود محض قصۂ پارینہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو وجود نام ہے اللہ تعالیٰ کی مسلسل توجہ کا، جبکہ عدم اس ذات کے توجہ ہٹا لینے کو کہتے ہیں۔ اس نے توجہ کر دی تو وجود عدم سے ہست ہو گیا اور اس نے اپنا رُخ پھیر لیا تو وجود موجود ہونے کے بعد پھر معدوم ہو کر رہ گیا۔

اب اس وضاحت کی روشنی میں دیکھیے کہ سورۂ المزمّل کی مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں ابتداءً تو یہ بتایا گیا کہ مشرق و مغرب کا رب ایک ہی ہے اور پھر ماسوا اللہ کی کامل نفی کی گئی۔ آخر میں انسان کو کہا گیا کہ وہ اسی ہستی کو اپنا کارسازِ مطلق یعنی وکیل بنا لے۔

وکیل کا مفہوم

وکیل کا لفظ وکالت سے بنا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کسی کام کی انجام دہی کی ذمہ داری کسی دوسرے شخص کے کندھوں پر ڈال دے۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں وکیل اور وکالت کے اس تصور سے بخوبی آشنا ہیں، لیکن کیا وکیل کو کام سونپ دینے کے بعد موکل کو غفلت کی نیند سو جانا چاہیے؟ ہماری روزمرہ کی زندگی اس سوال کا جواب نفی میں دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ موکل اپنے وکیل کی ہدایات کا پابند ہوتے ہوئے اس کی تعلیم کے مطابق تگ و دو کرتا ہے۔ وہ اپنی تمام تر کوششیں

Marfat.com

بروئے کار لانے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔

بعینہٖ اسی طرح ہمیں حکم دیا جا رہا ہے کہ ہر معاملے میں توکّل تو اللہ کی ذات پر کریں، آخری بھروسا اور اعتماد تو محض اس کی ہستی پر کریں، مگر اپنے کام کی انجام دہی کے لیے اس کے احکام و قوانین کے مطابق جدّوجُہد جاری رکھیں اور اس میں ہرگز کوتاہی نہ کریں۔

اس کے ساتھ ہی قرآنِ حکیم یہ بھی واضح کرتا ہے کہ خدا کی ذات پر توکل کرنے والوں کو خداوند تعالیٰ ہر اعتبار سے کافی ہو جاتا ہے۔ ارشاد مبارک ہے:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ [1]

اور جو کوئی اللہ کی ذات پر بھروسا کرے گا تو وہ اس کو کافی ہو گا۔

جس شخص کے لیے خدا تعالیٰ کافی ہو جائے [2] اس کی زندگی میں کسی قسم کے نقصان

---

[1] الطلاق (۶۵: ۳)

[2] یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بعض اہل اللہ کی نسبت کثرت سے یہ روایت کیا گیا ہے کہ ان کا دنیوی علائق سے برائے نام بھی کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس کے باوجود خداوندِ تعالیٰ خزانۂ غیب سے ان کی بھرپور امداد فرماتا تھا۔ خود قرآن مجید میں حضرت مریمؑ کو زمانۂ عبادت میں بے موسم پھل کثرت سے دیے جانے کا ذکر ہے اور جب ان سے یہ پوچھا جاتا کہ انہیں یہ نعمتیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں تو وہ فرما دیتیں: هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ (آل عمران، ۳: ۳۷) اسی طرح ظاہری اسباب کے علی الرغم حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تمام حقائق اپنی جگہ درست اور صحیح ہیں، مگر عرفا فرماتے ہیں کہ ترکِ اسباب کی اجازت اسی وقت مل سکتی ہے، جب انسان کی نگاہوں سے حقیقت اور مجاز کے تمام پردے ہٹ جائیں۔ ہر شخص کو ترکِ اسباب کی اجازت نہیں ہے۔ (دیکھیے ابوطالب مکی: قوت القلوب، جلد دوم، ص ۱۱۸) مولانا روم اس فرق کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر

Marfat.com

اور خطرے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ خدا کی کفالت و کفایت سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز بہتری کی ضمانت نہیں دے سکتی۔

خدا تعالیٰ کے کافی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جدّ وجہد تو انسان کرے، مگر انسان کے اس فعل کی انجام دہی کی ذمہ داری خداوندِ تعالیٰ خود اپنے ذمے لے لے اور انسان سے گویا یوں ارشاد ہو،

"اے انسان! اس کام کے لیے تو نے حتی الوسع کوشش کی۔ مگر تو نے اس کام کے انجام کو میری ذات سے وابستہ کر دیا ہے۔ اب تو ہر اعتبار سے بے فکر اور مطمئن ہو جا۔ جس کے امور کا میں متکفل ہو جاؤں، پھر اسے پریشان یا متفکر ہونے اور غم زدہ یا ملول ہونے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ [1]

اور مومنوں کی مدد کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔

بہر حال انسان کی ذمہ داری اپنی طرف سے کوشش بروئے کار لانا ہے۔ جب وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائے اور انجام کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی ذاتِ والاصفات پر چھوڑ دے تو خداوندِ تعالیٰ اپنے بندے کو ضرور سرخرو فرماتا ہے۔

توکل کا یہی انداز قرآنِ کریم اپنے ہر پیروں میں پیدا کرنا چاہتا ہے، اس کے بغیر کسی مومن کا ایمان پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

متوکّلین کا درجہ

اس بات کو سمجھنے کے لیے کہ خداوندِ تعالیٰ کے ہاں متوکلین کا کیا درجہ ہے حضرت

---

[1] الروم (۳۰، ۴۷)

Marfat.com

عبداللہ بن عباسؓ سے مروی درج ذیل حدیث کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا،

میرے سامنے تمام انبیائے سابقین کی اُمتیں پیش کی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ کسی نبی کے ساتھ تھوڑے لوگ ہیں اور کسی کے ساتھ زیادہ۔ کسی کے ساتھ ایک یا دو آدمی دکھائی دیے اور کسی کے ساتھ کثیر تعداد نظر آئی جبکہ کسی کے ساتھ ایک آدمی بھی نہیں تھا۔ پھر میں نے ایک سمت نگاہ کی تو لوگوں کا ایک جمِ غفیر دیکھا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ میری اُمت کے لوگ ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُمتی ہیں۔ اس کے بعد مجھے کہا گیا کہ میں آسمان کے کنارے (اُفق) کی طرف دیکھوں، میں نے دیکھا تو انسانوں کا ایک سوادِ عظیم نظر پڑا۔ پھر مجھے کہا گیا کہ دوسرے کنارے کی طرف نظر کروں، میں نے نظر اُٹھائی تو وہاں بھی انسانوں کا سوادِ عظیم دکھائی دیا۔ مجھے کہا گیا کہ یہ آپ کی اُمت ہے۔ جس میں ستر ہزار ایسے افراد تھے جو بغیر حساب کتاب کے جنت میں داخل ہو رہے تھے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ بیان کر کے گھر میں تشریف لے گئے تو آپؐ کے پیچھے صحابہؓ نے آپس میں ان خوش نصیب افراد کے متعلق خیال آرائی شروع کر دی۔ کسی نے کہا کہ یہ تاجدارِ انبیاء کے صحابہؓ ہوں گے۔ کسی نے خیال کیا کہ یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو اسلام کی حالت میں پیدا ہوئے اور جنہوں نے کبھی اللہ کے ساتھ شریک نہیں کیا۔ الغرض کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ ابھی وہ یہ قیاس آرائیاں کر ہی رہے تھے کہ آپؐ واپس تشریف لے آئے۔ لوگوں نے آپ سے استفسار کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم بلا حساب و کتاب جنت میں داخل ہونے والے ستر ہزار خوش نصیب افراد کون ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، یہ وہ لوگ ہیں جو نہ جھاڑ پھونک کرتے ہیں اور نہ کسی سے کرواتے ہیں اور نہ فال لیتے ہیں، بلکہ صرف اپنے رب پر بھروسا

Marfat.com

کرتے ہیں لے۔

اندازہ کیجیے، توکل کرنے والوں کا خدا کے ہاں کیا درجہ ہے؟ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ توکّل کامل ہونا چاہیئے

اللہ کی ذات پر توکل کا ایک پہلو یہ ہے کہ متوکّل شخص خدا تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ اس اعتبار سے توکل درحقیقت اطاعتِ خداوندی ہی کی ایک اعلیٰ شکل ہے۔

مذکورہ بالا حدیث پاک میں توکّل کے اُخروی ثمر کی نشان دہی کی گئی تھی، لیکن توکّل کرنے والے کو دنیا میں بھی بہترین ثمر مرحمت فرمایا جاتا ہے، حدیث میں ہے:

لو توکلتم علی اللّٰہ حق توکلہ لرزقتم کما رزق الطیر تغدو خماصًا وتروح بطانًا ولزالت بدعائکم الجبال ٢ہ

اگر تم اللہ پر ایسا توکل کرو، جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو تمہیں ان پرندوں کی طرح جو صبح کو خالی شکم گھر سے نکلتے اور شام کو پُر شکم ہو کر لوٹتے ہیں، رزق دیا جائے اور تمہاری دعاؤں سے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ٹل جائے۔

لہ بخاری و مسلم، ۱۱۹۱ تا ۱۲۰، حدیث ۲۲۰، مطبوعہ قاہرہ۔

" ھم الذین لا یرقون ولا یسترقون ولا یتطیرون و علیٰ ربھم یتوکلون "

٢ہ رواہ الترمذی و مسند احمد بن حنبل و اسنادہ صحیح و ابو طالب المکی، قوت القلوب ۲؍۴)

توکل کے غلط تصورات اور ان کے غلط نتائج

مذکورہ بالا اثرات وثمرات صرف اسی صورت میں مترتب ہوسکتے ہیں جبکہ توکل کا صحیح تصور ہمارے ظاہر و باطن میں جاگزیں ہو چکا ہو۔

ہمارے ہاں توکل کے بارے میں دو قسم کے تصورات پائے جاتے ہیں اور ان کی بنا پر دو گروہ موجود ہیں؛

ایک گروہ، جو جدید مادہ پرستانہ تصورات کا حامل ہے، یہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہے، اسباب ہی میں مضمر ہے۔ اسباب سے مسببات پیدا ہوتے ہیں۔ اس تصور کو بڑھانے اور بگاڑنے میں جدید مغربی تہذیب اور مادی انداز فکر نے بہت زیادہ عملی حصہ لیا ہے اور یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کائنات صرف علت و معلول کے ایک غیر منتہی سلسلے کا نام ہے اور اسباب سے ماوراء کچھ بھی نہیں۔

اس غلط تصور کے نتیجے میں ہماری زندگیوں سے روحانی اثرات عنقا ہو گئے ہیں اور ہم محض اسباب و علل کے غلام بن کر رہ گئے ہیں اسطرح ہماری آنکھوں سے زندگی کا وہ رُخ اوجھل ہو گیا جو ان اسباب و علل کے پیچھے ایک مؤثر حقیقت کے طور پہ کار فرما ہے۔

اس گروہ کے بالمقابل دوسرا گروہ بزعم خویش مذہبی نام لیواؤں کا ہے۔ جنہوں نے توکل کا مفہوم ترک اسباب سے متعین کیا اور یہ کہا کہ ہر قسم کے اسباب و علل سے دستبرداری اختیار کر لی جائے۔ انہوں نے انسان کو یہ تلقین کی کہ جدوجہد بیکار ہے، جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھا ہے وہ تمہیں مل کر رہے گا۔ الغرض اس تصور نے قسمت اور تقدیر کے اس مسخ شدہ عقیدے کو جنم دیا جو انسانی جدوجہد کو زنگ آلود کر دیتا ہے۔ یہ دونوں تصورات اسلامی تعلیمات سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ جہاں تک اسلام

Marfat.com

کا تعلق ہے، اس کی تعلیمات بالکل واضح ہیں۔

جدوجہد کی تلقین

انسان کو جدوجہد اور تلاش اسباب پر آمادہ کرتے ہوئے قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝[۱]

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

یہ قانونِ قدرت ہے کہ انسان کو وہی کچھ دیا جائے جس کی وہ طلب کرے اور جس کی اسے تلاش نہ ہو اس سے اسے محروم رکھا جائے۔ یہ بات کہ کوئی شخص طلبِ صادق اور جدوجہد کے بغیر ہی مراد کو پہنچ جائے، قانونِ فطرت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ احادیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک صحابیؓ خدمتِ نبوی میں باریاب ہوئے۔ وہ اونٹنی پر سوار تھے۔ جب اُنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی قدم بوسی کی تو آپ نے پوچھا کہ اپنی اونٹنی کہاں چھوڑ آئے ہو، اُنہوں نے عرض کیا خدا کے توکل پر باہر کھلا چھوڑ آیا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا:

اِعْقِلْهَا وَتَوَکَّلْ ۝[۲]

پہلے اس کے گھٹنوں پر رسی ڈال پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسا کر۔ دیا یہ کہ پہلے عقل اور تدبیر سے کام لے اور پھر توکل اور بھروسا کر۔

گویا اسلام کی تعلیمات ترکِ اسباب کی ہرگز اجازت نہیں دیتیں، بلکہ حکم یہ ہے

۱۔ النجم (۵۳: ۳۹)

۲۔ ترمذی بحوالہ منہاج الصالحین، بیروت، ص ۲۴۶۔

Marfat.com

کہ حتی الوسع اسباب کی جستجو کی جائے اور پھر آخری نتیجہ اللہ کی ذات پر چھوڑ دیا جائے۔
توکل یہ نہیں ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور جد وجہد، تگ و دو اور سعی وعمل کو ترک کر کے جمود و تعطل کا شکار ہو جائے۔
اگر انسان کو صحیح توکل نصیب ہو جائے تو پھر انسان تقدیر کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ تقدیر خود اس کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ قضا کا منتظر نہیں ہوتا بلکہ قضا اس کی منتظر ہوتی ہے۔ اس کے اُٹھنے اور آگے بڑھنے والے قدم ہی تقدیر بن جاتے ہیں علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

تِرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

لہٰذا یہ شکوہ کرنا کہ ہمیں کچھ نہیں ملتا، ہماری قسمت میں بیماریاں، پریشانیاں اور تکالیف ہیں، سراسر کفرانِ نعمت اور خدا تعالیٰ کی عطاؤں کا کھلا انکار ہے۔

ایک سائل اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

شیخ ابو طالب المکی 'قوت القلوب' میں بیان کرتے ہیں کہ ایک سائل ہر روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے پر دستک دیتا اور اپنی ضروریات کا سوال کرتا۔
ایک روز حضرت عمرؓ نے اس سائل کو فرمایا کہ اے شخص! عمر کا دروازہ اچھا ہے یا خداوندِ قدوس کا؟ اس نے عرض کیا کہ دروازہ تو رب تعالیٰ ہی کا اچھا ہے، مگر کیا کروں؟ آپؓ نے فرمایا، جا کے قرآن پڑھ کہ ہدایت کی کوئی کرن تجھے نصیب ہو جائے وہ شخص چلا گیا۔ کافی عرصہ گزر گیا، اُس نے حضرت عمرؓ کے دروازے پر آکر دستک نہ دی۔ سیدنا

Marfat.com

فاروقِ اعظم نے ایک روز اس کی بابت دریافت فرمایا تو پتا چلا کہ وہ شخص گوشہ نشین ہے اور کسی سے ملتا جلتا نہیں۔ آپؓ نے فرمایا کہ چلو چل کر اس کا حال دریافت کرتے ہیں۔ جب اس کے دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ شخص بیٹھا تلاوت کر رہا ہے۔ فاروقِ اعظم نے اس سے پوچھا کہ اے شخص کیا وجہ ہے کہ تمہیں ہمارے پاس آئے ہوئے عرصہ گزر گیا ہے؟ وہ کہنے لگا، یا امیرالمومنینؓ! جب سے قرآن پڑھا ہے، اس وقت سے کسی مخلوق ـــــــ کے دروازے پر جانے کی حاجت باقی نہیں رہی۔ آپ نے پوچھا کہ تم نے قرآن میں کیا پڑھا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ آیت کریمہ پڑھی ہے:

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ — اور تمہارا رزق اور جس چیز کا تم سے
وَمَا تُوعَدُونَ [1] — وعدہ کیا جاتا ہے، آسمان میں ہے۔

اس آدمی نے کہا کہ اس آیت سے مجھے معلوم ہوا کہ میرا رزق تو آسمان پر ہے، میں خواہ مخواہ اسے زمین پر تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ جب سے یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی ہے، میں نے آسمان والے سے تعلق قائم کر لیا ہے، اس وقت سے مجھے ہر چیز میسر آ رہی ہے۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر رو دیے اور پھر اکثر اس سے ملنے کے لیے تشریف لے جاتے۔[2]

اس واقعے سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ جب تمام انسانوں کا رزق آسمان پر ہے تو پھر کیوں نہ انسان تگ و دو چھوڑ دے۔ ہرگز نہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے مقدر کا فیصلہ کرنے کے بعد تلاش و جستجو کے ذریعے اسے حاصل کرنے کا حکم دیا اور تگ و دو کو فرض ٹھہرایا ہے۔

رزق بیشک مقدر ہے، مگر جد و جہد کے بغیر مقدر شدہ رزق بھی نہیں مل

---

[1] الذاریات (۵۱:۲۲)
[2] قرب القرب، جلد دوم، ص ۸

Marfat.com

سکتا۔ مقدر کو اپنا مقدر بنانا بھی انسان کی اپنی تگ و دو پر منحصر ہے۔

مولانا رومؒ کی بیان کردہ ایک تمثیل

توکل کے مذکورہ تصور کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا رومؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص سخت غفلت شعار تھا۔ وہ نہ تو دنیا کمانے کے لیے طلب و محنت کا سہارا لیتا اور نہ ہی دینی احکام کی بجا آوری میں تن آسانی کو ترک کرتا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ظاہری اور باطنی اعتبار سے افلاس کا شکار ہوگیا ایک دن اُس نے کسی رئیس کے لشکریوں کو دیکھا، جن کی زندگی بڑی پُرتکلف تھی، انہیں زرق برق لباس سے لے کر خورد و نوش کے اعلیٰ سے اعلیٰ سامان مُہیا تھے۔ اس پر وہ شخص بارگاہِ رب العزت میں شکوہ کرنے لگا کہ یاالٰہی میں تیرا بندہ ہوں، جبکہ یہ لشکری فلاں رئیس کے ملازم ہیں۔ میری زندگی کتنی پُرصعوبت ہے، جبکہ ان لشکریوں کی زندگی کتنی آسائش سے گزر رہی ہے۔ ان کو لباس میسر ہے، عزت، سکون، صحت تندرستی الغرض ہر سامان میسر ہے۔ ان کو معمولی سی تکلیف ہوتی ہے تو رئیس ان کی فکر کرتا ہے۔ جبکہ میرے شب و روز دکھ اور تکلیف میں بسر ہوتے ہیں۔ پھر وہ یوں گویا ہوا کہ (معاذاللہ) اے اللہ! تجھے اپنے بندوں کو پالنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ اگر تجھے رب بننا نہیں آتا تو اس رئیس ہی سے سیکھ لیا ہوتا کہ بندہ پروری کیا ہے۔ [۱] کچھ ہی

---

[۱] مثنوی کے اس موقع کے اشعار حسب ذیل ہیں:

کاے خدا زیں خواجۂ صاحب منن   چوں نیاموزی تو بندہ داشتن

بندہ پروردن بیاموز اے خدا   زیں رئیس و اختیار شہر ما

مولانا رومؒ جنابِ باری میں اُس کی جُرأت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(باقی آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

دنوں کے بعد اس ملک کے بادشاہ نے کسی بنا پر اس رئیس کو گرفتار کر لیا۔ جب بادشاہ نے اس کے سپاہیوں سے اس کے خفیہ مال و متاع کے متعلق پوچھ گچھ کی، تو ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم نے اپنے آقا کا نمک کھایا ہے۔ اب ہم کسی صورت میں بھی اس کا راز افشا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس کے لشکریوں کو ایک ماہ تک طرح طرح کی سزائیں دیں اور سخت اذیتوں میں مبتلا رکھا۔ جب وہ کسی طرح بتانے پر آمادہ نہ ہوئے تو بادشاہ نے انہیں قتل کرنا شروع کر دیا مگر وہ یکے بعد دیگرے اپنی جانیں دیتے رہے، ایک دوسرے کے قتل ہونے کا خون آشام منظر مشاہدہ کرتے رہے مگر کیا مجال کہ کسی نے اپنی زبان کھولی ہو۔ اس وقت حاطف غیب سے ایک ندا نے اُسے یوں متوجہ کیا

تو بھی بندہ بننا ان سے سیکھ لے
پھر کبھی مولا کو یوں طعنہ نہ دے

(از صفحہ گزشتہ)

انبساطے کرد آں از بے خودی — جرأتے بنمود اُو از ملتدی
اعتمادش بر ہزاراں موہبت — کہ ندیم حق شد اہلِ معرفت
گر ندیم شاہ گستاخی کند — تو مکن چوں تو نداری آں سند

ترجمہ: (۱) اس بے خود نے بے خودی اور پھکڑپن سے یہ جرأت کی۔

(۲) اس کو اللہ تعالیٰ کی ہزاروں بخششوں پر اعتماد تھا، کیوں کہ حق والا خدا کا مصاحب ہوتا ہے۔

(۳) اگر بادشاہ کا کوئی مصاحب گستاخی کرے تو تُو ہرگز نہ کرنا کیونکہ تو وہ سہارا نہیں رکھتا (جو وہ رکھتا ہے) (مثنوی، دفتر پنجم، ص ۳۱۹ تا ۳۲۱)

Marfat.com

مثنوی کے الفاظ یہ ہیں:

گفتش اندر خواب ہاتف کے کیا
بندہ بودن ہم بیاموز و بیا
اے دریدہ پوستینِ یوسفاں
گر بدرّد گرگت آں از خویش داں
زآنکہ می بافی ہمہ سالہ بپوش
زانکہ می کاری ہمہ سالہ بنوش
فعل تست ایں غصہ ہائے دمبدم
ایں بود معنیٔ "قد جفّ القلم"[1]

اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ ہم خدا تعالیٰ کی نعمتوں کی کمی کا تو شکوہ کرتے ہیں، مگر یہ نہیں سوچتے کہ ہم کس حد تک اس کا حقِ بندگی ادا کر رہے ہیں۔

خدا کی ربوبیت، اس کی عطائے بے پایاں، اس کے الطاف و عنایات، اس کا جود و سخا، اس کی نوازشات اور اس کی مہربانیوں میں کچھ کمی نہیں۔ کمی خود ہماری جانب سے ہے، ہمیں خود بندگی کا سلیقہ نہیں آتا۔ اگر ہم اس کے احکام کے مطابق زندگی

---

[1] دفتر پنجم ترجمہ سجاد حسین مطبوعہ لاہور۔

ترجمہ (i) غیبی آواز نے اس سے خواب میں کہا کہ اے سردار غلام بننا بھی سیکھ لے اور آجا
(ii) اے یوسفوں کی پوستین پھاڑنے والے۔ اگر تجھے بھیڑیا پھاڑ لے تو اسے اپنے سبب سے سمجھ
(iii) کیونکہ تو جو سارے سال بُنتا ہے، وہ پہن اور جو سارے سال بوتا ہے وہ کھا
(iv) یہ ہر وقت کا رنج تیرا کارنامہ ہے، "قلم لکھ کر خشک ہو گیا" کے یہی معنی ہیں

Marfat.com

بسر کریں، ہر مشکل اور ہر نازک گھڑی میں اسی کی ذات پر بھروسا کریں اور ساری تگ ودو کا سلسلہ اسی کی رضا کی خاطر جاری رکھیں تو ہماری موجودہ زندگیوں میں انقلاب آسکتا ہے۔ اسی بنا پر اہلِ دل کا قول ہے:

من کان للہ کان اللہ لہٗ — جو اللہ کا ہو جائے، اللہ اس کا ہو جاتا ہے۔

بلکہ جو شخص خدا کی مخلوق کی بہتری کے لیے کوشاں ہو جائے، خدا تعالیٰ اس کی بہتری میں مصروف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہٖ — جو اپنے بھائی کی حاجت روائی میں مصروف ہو، خدا اس کی حاجت روائی کی ذمہ داری لے لیتا ہے۔

انبیا علیہم السلام اور طلبِ اسباب

القصہ اسباب کی تلاش و جستجو توکل کے تصور کے منافی ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ اگر اسباب کا واسطہ توکل کے منافی ہوتا تو خود اللہ رب العزت انسانیت کی رُشد و ہدایت کے لیے انبیا علیہم السلام کا ذریعہ اور وسیلہ ہرگز اختیار نہ فرماتا۔ ایک انبیا ہی پر کیا موقوف ہے، پورے کا پورا عالم ہی اسباب و علل کے ایک وسیع و عریض نظام کی منہ بولتی تصویر ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ [1] — اے لوگو! اس رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا۔

---

[1] النساء (۴:۱)

Marfat.com

وہ ذات اگر چاہتی تو کروڑوں افراد براہِ راست تخلیق کر سکتی تھی۔ لیکن اس نے پہلے ایک جان پیدا کی، اس سے دو جانیں بنائیں اور پھر ان سے کروڑوں اور اربوں انسان اطراف واکنافِ عالم میں پھیلا دیے۔ گویا خود انسانیت کی اپنی تخلیق بھی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسباب سے تعلق رکھنا اور اُن کی تلاش وجستجو کرنا مشیتِ ایزدی کے منافی نہیں ہے۔

انبیا علیہم السلام کی سوانح حیات ہمارے سامنے زندگی کا وہ رُخ پیش کرتی ہیں جو اللہ کو پسند ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی زندگیاں بھی اسباب سے خالی نہیں۔ قرآنِ حکیم میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی سلب ہونے اور پھر حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کے صدقے واپس مل جانے کا ذکر ہے۔ اس موقع پر ارشادِ خداوندی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِىْ هٰذَا	یہ میرا کُرتہ لے جاؤ اور اسے میرے
فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِىْ	والد کے منہ پر ڈال دو، وہ بینا ہو جائیں گے۔
يَاْتِ بَصِيْرًا [1]	

چنانچہ ایسا ہی ہوا، جب قمیص حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں سے مس ہوئی تو یک لخت ان کی بینائی عود کر آئی۔ دونوں خدا کے پیغمبر تھے، اس واسطے اور ذریعے کے بغیر بھی دعا سے مدعا حاصل کر سکتے تھے لیکن ذریعے اور وسیلے کی اہمیت کے پیشِ نظر اسی راہ کو اختیار فرمایا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے شاہِ مصر کے سامنے خود کو پیش کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] یوسف (۱۲ : ۹۳)

Marfat.com

اِجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ[1]
مجھے اس ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجیے کیونکہ میں حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور اس کام سے واقف بھی ہوں۔

وہ خدا کے جلیل القدر نبی تھے، مگر پھر بھی دنیوی سلطنت کو دینِ خدا کی ترویج و اشاعت کے ذریعے کے طور پر طلب فرما رہے تھے۔

خود نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت سے قبل یہ دعا تعلیم کی گئی،

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا[2]
اور کہو! اے پروردگار مجھے اچھی طرح داخل فرمائیے اور اچھی طرح نکالیے اور اپنے ہاں سے زور و قوت کو میرا مددگار بنائیے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعا طریقۂ انبیاء کی تصدیق فراہم کرتی ہے۔
اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام جب گوشۂ عزلت اختیار کر لیتی ہیں، تو ان کے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لاتے ہیں اور فرماتے ہیں،

اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَهَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا[3]
میں تو تمہارے پروردگار کا فرستادہ ہوں (اور اس لیے آیا ہوں کہ) تمہیں پاکیزہ لڑکا بخشوں۔

بیٹا خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا کیا جا رہا ہے، مگر اس میں ظاہری سبب اور ذریعہ

---

[1] یوسف (۱۲: ۵۵)

[2] بنی اسرائیل (۱۷: ۸۰)

[3] مریم (۱۹: ۱۹)

Marfat.com

کے طور پر حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا گیا اور بیٹا دینے کے فعل کو بھی انہی کی طرف منسوب کیا گیا۔

الغرض قرآنِ کریم کی تعلیمات اور سنّتِ نبویہ اس امر پر صراحت سے دلالت کرتی ہیں کہ توکّل یہ نہیں کہ اسباب اور ذرائع کو ترک کر دیا جائے۔ اس کے برعکس مذہبی زندگی ہو یا دنیوی، اکتسابِ دولت ہو یا تحصیلِ دین، الغرض زندگی کے ہر معاملے میں اپنی بساط اور استعداد کے مطابق کوشش کرنا عینِ اسلام ہے۔ یہ سب باتیں توکّل کے منافی ہرگز نہیں۔ انسانی تگ و دو توکّل کے منافی اس وقت ہوتی ہے، جب وہ نتائج کو اپنی تگ و دو ہی کا نتیجہ قرار دے اور یہ سمجھے کہ اگر میں نے یہ اسباب اختیار نہ کیے تو میں ثمراتِ محنت سے محروم ہو جاؤں گا، حالانکہ یہ چیز خدا تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے مثلاً کوئی یہ سمجھنے لگے کہ جو جاہ و عزّت اُسے حاصل ہے وہ محض اُس کی ذاتی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے حالانکہ یہ تو صرف عطیۂ خداوندی ہے۔ جیسا ارشادِ خداوندی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؎	حالانکہ عزت خدا تعالیٰ کی ہے اور اس کے رسولؐ اور مومنوں کی، لیکن منافق نہیں جانتے۔ ؎ المنافقون (۶۳ : ۸)

عزت، اسباب پر بھروسا کرنے والوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ اسباب پر بھروسا ترک کر کے اللہ پر بھروسا کرنے والوں کے لیے ہے۔

اہل اللہ اور مردانِ حق نے کبھی کسی بادشاہ یا امیر کے دروازے پر عزت چاہنے کے لیے دستک نہیں دی۔ انھوں نے زندگی کے اسباب کو اپنایا مگر ان پر بھروسا نہ کیا، ان کے دل نے ان کی طرف رجوع نہ کیا۔ انھوں نے زندگی کے اسباب کی خاطر دوستی اور دشمنی نہ کی اور نہ انہیں عزت کی بنیاد ٹھہرایا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دنیا سے

Marfat.com

رُخ پھیرتے تھے، مگر دنیا ان کے پیچھے پیچھے چلتی تھی، خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمیشہ یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے:

اللّٰھم لک اسلمت و بک اٰمنت وعلیک توکلت والیک انبت وبک خاصمت لہ

اے اللہ! میں نے تیرے ہی حکم کو مانا، اور تجھی پر ایمان لایا اور میں نے تجھی پر بھروسا کیا اور تیری ہی طرف متوجہ ہُوا اور تیری ہی وجہ سے تیرے دشمنوں سے دشمنی کی۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف خدا کو چاہنا اور اسی کی ذات پر بھروسا کرنا اتنی بڑی قوت ہے کہ دنیا خود بخود قدموں میں کھنچی چلی آتی ہے اور آخرت کی نعمتیں بھی میسر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مردانِ حق جن کی زندگی سراپا توکّل اور قناعت کا پیکر اتم ہوتی ہے۔ دنیوی مال و متاع کے حصول کی خواہش تک سے مبّرا رہتے ہیں اور اموالِ دنیوی کی بڑی سے بڑی پیشکش انہیں مقامِ توکّل و استغناء سے متزلزل نہیں کرسکتی۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور خلیفہ مستنجد باللہ

ایک دفعہ خلیفہ مستنجد باللہ (عباسی) ہزاروں اشرفیوں کی دس تھیلیاں لے کر حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ میں یہ ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ آپ نے چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ اس

لہ متفق علیہ (رواہ البخاری والمسلم)

Marfat.com

نے پھر التجا کی کہ للہ میرا یہ ہدیہ قبول کیجیے، اس سے آپ کی کچھ ضرورتیں پوری ہو جائیں گی۔ حضرت شیخؒ نے ایک تھیلی دائیں اور دوسری بائیں ہاتھ میں لے کر نچوڑی تو اس سے خون کا فوارہ جاری ہوگیا۔ پھر آپ نے فرمایا اس دولت دنیا کو تو ہماری ضرورتوں کی تکمیل سمجھ کر لایا ہے جو ظلم اور جبر سے حاصل کی گئی ہے، پھر فرمایا کہ بخدا اگر مجھے آلِ رسول کا احترام نہ ہوتا تو میں ان تھیلیوں کو اس قدر نچوڑتا چلا جاتا کہ خون تیرے محلات تک بہہ جاتا، یہ دیکھ کر خلیفہ کو غش آگیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ آپ گھر سے باہر نکلے تو گلی سے ایک سائل نے راہِ خدا میں آپ سے کچھ مانگا۔ اس وقت آپ نے جو دستار پہن رکھی تھی، اس کی مالیت ستر ہزار درہم تھی، آپ نے بلا تامل وہ دستار اُتار کر اس سائل کے حوالے کر دی۔[۲]

بندگانِ خدا بالعموم، دنیا چھوڑ کر جنگلوں اور غاروں میں نہیں جا بستے بلکہ وہ دنیا ہی میں رہتے ہیں، یہیں کاروبار بھی کرتے ہیں اور دیگر دنیوی امور کی بجا آوری بھی کرتے ہیں۔ مگر ان سب مصروفیات کے باوجود ان کا دل دنیا کی محبت سے خالی ہوتا ہے۔ ان کا توکل اور بھروسا دنیا کے بجائے خدا تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ دنیا کی نعمتیں بھی بے اندازہ عطا فرماتا ہے اور آخرت کی نعمتیں بھی بے حد و حساب ارزاں فرمائے گا۔

اس لیے اسے بندۂ خدا تیرے لیے ضروری ہے کہ تو لوگوں سے تعلق تو رکھے مگر ان پر توکل نہ کرے، اسبابِ کسب و ہنر کو اختیار تو کرے مگر ان پر تکیہ نہ کرے، واسطے اور وسیلے تلاش کرے مگر انہیں مقصود نہ سمجھے، ورنہ تو خدا کی نعمتوں اور

---

[۱] نزہتہ الخاطر الفاتر فی مناقب شیخ عبد القادر جیلانیؒ از ملا علی قاری، ص ۵۶

[۲] تفریح الخاطر فی مناقب سیدنا شیخ عبد القادر، از شیخ عبد القادر اربلی، ص ۲۸

Marfat.com

عنایتوں سے محروم ہو جائے گا اور یہ سب کچھ تیرے لیے حجاب بن جائے گا۔ اور پھر جب تو ہر شے پر بھروسا چھوڑ کر اپنے رب کی طرف لوٹے گا تو وہ تیرے اور اپنے فضل کے درمیانی حجابات اُٹھائے گا، تیری مشکلات آسان ہو جائیں گی، تیری کامیابیوں کے راستے کشادہ ہو جائیں گے، تجھ پر خصوصی عنایات کی جائیں گی، جب تو ان نوازشات اور مہربانیوں کا ثمر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا تو تیرا علم پختہ یقین بن جائے گا، تیرا سینہ کھول دیا جائے گا، تجھے قرب کے مراتب سے نوازا جائے گا، تجھے اسرارِ الٰہی عطا کیے جائیں گے اور ان کی حفاظت کی وجہ سے تیری قابلیت، لیاقت اور امانت میں اضافہ ہو گا۔ تیری شرافت اور بزرگی بڑھ جائے گی۔ چنانچہ تو اس حکمِ الٰہی کا مصداق بن جائے گا۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا[1]

اور جنھوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا، ہم ضرور ان پر اپنے راستے منکشف کر دیں گے۔

اے بندۂ خدا!

اپنا سکون دنیا اور اہلِ دنیا پر منحصر نہ سمجھ، نہ ان سے عزت کا طلبگار ہو اور نہ اس خیال سے ان سے محبت کر۔ تیرا سکون اور آرام خداوند تبارک و تعالیٰ سے ہے، تیری قدر و منزلت بھی اسی کے باعث ہے۔ تو اس کے سوا نہ کوئی طمع کر اور نہ کسی سے خائف ہو کیونکہ نفع و نقصان، عزت و ذلت، بلندی و پستی، محتاجی و تونگری اور حرکت و سکون سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے:

وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ

اور اگر تجھے اللہ کوئی تکلیف پہنچائے

---

[1] عنکبوت (۲۹: ۶۹)

فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ [1]

تو اس کے سوا کوئی اس کا ٹالنے والا نہیں، اور اگر وہ تیرا بھلا چاہے تو کوئی اس کے فضل کو رد کرنے والا نہیں۔

اس لیے جب تجھے کوئی پریشانی لاحق ہو، مصیبت اور آفات کا سامنا ہو تو کسی کے سامنے زبانِ شکوہ دراز نہ کر، کیونکہ اس پیدا کرنے والے سے بڑھ کر کوئی تیرا ہمدرد اور شفیق نہیں اور اگر تیرا بدن ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دیا جائے تب بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لا اور نہ دل کو رنجیدہ کر۔ اللہ سے ڈر، اور شکایت سے بچ۔ اکثر مصیبتیں، رب کی شکایت ہی کی وجہ سے نازل ہوتی ہیں۔ ہر حال میں اللہ پر توکّل کر کیونکہ وہ تیرے نفع اور نقصان کو تجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اس نے ارشاد فرمایا ہے:

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔـا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔـا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [2]

ممکن ہے تمہیں کوئی بات بری لگے مگر وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں کوئی بات پسند ہو مگر وہ تمہارے حق میں بری ہو۔ اور اللہ (حقیقت حال کو) جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں، اپنی محبت و اطاعت اور اپنی ذات پر توکّل کی لذت سے آشنا کرے اور ہمیں زندگی میں ایمان کے یہ تینوں تقاضے بتمام و کمال پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

---

[1] یونس (۱۰ : ۱۰۷)

[2] البقرہ (۲ : ۲۱۶)

Marfat.com

Marfat.com

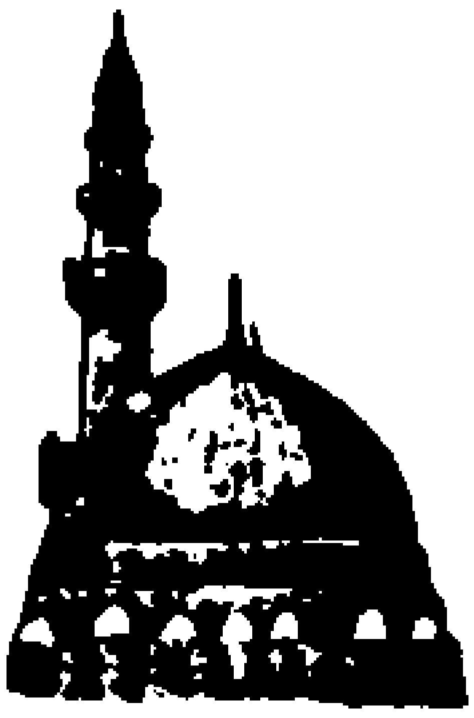

ایمان بالرسالت

Marfat.com

Marfat.com

باب دوم

نظامِ رسالت
اور
اُس کی ضرورت

Marfat.com

Marfat.com

شہادتِ توحید و رسالت ارکانِ اسلام کا اولین رکن ہے۔ ان پر تفصیلی گفتگو ارکان اسلام کے ضمن میں کی جائے گی۔ سردست ایمان بالرسالت کے عمومی تصور پر کچھ روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

ایمان بالرسالت کے سلسلے میں دو بنیادی مباحث زیرِ غور آئیں گے۔

(الف) اسلام کا تصورِ رسالت

(ب) ضرورتِ رسالت

اب ہم ان پر قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

(الف) اسلام کا تصورِ رسالت

اسلام ایک ترقی یافتہ مذہب ہی نہیں بلکہ عالمگیر اور آفاقی صفات کا حامل دین بھی ہے۔ اسلام نے دیگر مذاہب کے برعکس "رسالت" کا ایک ٹھوس اور جامع تصور پیش کیا، جس سے دوسری اقوام و ملل کے دامن تہی ہیں۔ چنانچہ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں رائج مذاہب عیسائیت و یہودیت سے لے کر مشرقِ بعید تک میں مروج ادیان تک اس وسیع تصورِ رسالت سے تہی دست و تہی داماں ہیں۔ اسلام نے نہ تو رسالت کو

Marfat.com

بڑھا کر خدا یا خدا کی اولاد کے درجے پر پہنچایا اور نہ گھٹا کر عام انسانوں کے برابر قرار دیا۔ دینِ مبیں نے رسالت و نبوّت کا ایسا جامع و بے نظیر اور کامل و بے مثل نظریہ پیش کیا جس میں نورِ حق کی صداقت اور چمک دمک بخوبی دکھائی دے سکتی ہے۔

رسول کا لفظ ر۔س۔ل کے تین حرفوں سے بنا ہے۔ رسل کے معنی بقول الراغب (صاحب مفردات) آہستہ اور نرمی کے ساتھ چل پڑنے کے ہیں لہ اور لفظ رسول اسی سے مشتق ہے۔ صاحب لسان العرب کے بقول، یہ لفظ ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

الـذی یتابع اخبـار الـذی بعثہٗ ؎ — جو اپنے بھیجنے والے کے احوال و واقعات کی متابعت کرے۔

لفظ رسل میں فی الحقیقت اُٹھنے اور چلنے کے دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ بقول امام راغب اصفہانیؒ لفظ رسول کا اطلاق بھی دو طرح پر ہوتا ہے۔ کبھی پیغام پر اور کبھی پیغام رساں پر۔

یہ تو اس کی لغوی بحث تھی۔ اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد خداوندِ قدوس کا اپنے مخصوص و برگزیدہ بندوں کے ذریعے نسلِ انسانی تک اپنا پیغامِ حق و صداقت پہنچانا ہے۔ اس اعتبار سے رسالت ایک وسیع کلیہ ہے جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس تک تمام انبیاء و رسل کی نبوتیں اور رسالتیں شامل ہیں۔ ہر نبی اپنی اپنی جگہ حق و صداقت کا کامل و مکمل نمونہ رہا ہے اور ان سب نے ایک ہی مشن، ایک ہی مقصد اور ایک ہی لائحۂ عمل کے تحت کام کیا ہے۔ اس بنا پر اسلام ان سب پر ایمان لانے کو ضروری اور لازمی قرار دیتا ہے۔

لہ مفردات، بذیل رسل

؎ لسان العرب، بذیل رسل

Marfat.com

ارشاد ہے:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ [1] — سبھی خدا اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔

عمومیتِ رسالت — قرآن حکیم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر خطے اور نسلِ انسانی کے ہر طبقے کی طرف اپنے رسول اور پیغمبر بھیجے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ [2] — اور کوئی اُمت نہیں مگر اس میں کوئی نہ کوئی ہدایت کرنے والا ضرور گزر چکا ہے۔

قرآن کریم کی یہ آیت عمومیتِ رسالت پر دلالت کرتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ کرۂ ارض کا ہر وہ خطہ جہاں چند انسانوں نے مل کر کوئی معاشرہ (society) تشکیل دیا ہے، اللہ کی طرف سے آنے والے انبیاء کے فیضان سے خالی نہیں رہا۔

ایک نبی — ایک قوم — اس سلسلے میں عمومیت اور وسعت اس حد تک ملتی ہے کہ ابتداء میں ایک نبی اور ایک قوم کا اصول جاری رہا۔ اس سلسلے میں ارشاد باری ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ [3] — اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اس کی اپنی قوم کی زبان میں تاکہ انہیں

---

[1] البقرہ (۲: ۲۸۵)

[2] فاطر (۳۵: ۲۴)

[3] ابراہیم (۱۴: ۴)

Marfat.com

احکام خدا کھول کر بتا دے۔

الفاظ "لِيُبَيِّنَ لَهُمْ" سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ خداوندِ قدوس کو اپنی مخلوق کی سہولت اور آسانی کا کس قدر خیال اور احساس تھا کہ اس نے دنیا کی جس قوم کو بھی اپنا پیغام پہنچانا چاہا تو پیغام ربانی کے لیے نبی یا رسول کو بھی اسی قوم میں سے منتخب کیا تاکہ وہ نبی یا رسول اس قوم کے افراد سے انہی کی زبان میں گفتگو کر سکے

یہ خدائی اصول دراصل اتمام حجت کا ایک ذریعہ تھا۔ ارشاد ہے:

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ [1]

(سب) پیغمبروں کو (خدا نے) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجا تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کو خدا پر کسی الزام کا موقع نہ رہے۔

انبیاء انذار و تبشیر کے پہلوؤں سے کام لے کر لوگوں کو خدائی اصول اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ [2]

اور ہم جو پیغمبروں کو بھیجا کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ لوگوں کو خدا کی نعمتوں کی خوشخبریاں سنائیں اور عذاب سے ڈرائیں۔

اور پھر جب انبیاء کرام کے اتمام حجت کے لیے تشریف لے آنے کے باوجود بعض بدبخت اقوام کے بگڑے ہوئے قلوب رو بہ اصلاح نہیں ہوتے بلکہ پیغام حق کو ٹھکرا کر وہ ان مقدس نفوس کی گستاخی کی مرتکب ہوتی ہیں اور عمل کے اعتبار سے فساد

---

[1] النساء (۴: ۱۶۵)

[2] الکہف (۱۸: ۵۶)

Marfat.com

کی آخری حدوں کو چھونے لگتی ہیں تو اس وقت تمام تنبیہات کے بعد ان پر غضب الٰہی عذاب بن کر ٹوٹ پڑتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ؁ — اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں، عذاب نہیں دیا کرتے۔

اس کے برعکس جو لوگ ان انبیاء و رسل کی دعوت و تبلیغ سے اصلاح پذیر ہو جاتے ہیں، ان کی دنیا و آخرت کے سنور جانے کا واضح اشارہ دے دیا جاتا ہے۔

ایک نبی اور کل کائنات

انذار و تبشیر اور تبلیغ و دعوت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ انسان انبیاء کی تعلیمات کے اثر سے تہذیب و تمدن کے اوصاف سے متصف ہوتا گیا تو آہستہ آہستہ نبوت و رسالت کے اس نظام میں وسعت و آفاقیت پیدا ہوتی گئی اور ایسے انبیاء جن کا دائرۂ تبلیغ صرف کرۂ ارضی کو محیط تھا تشریف لا چکے تو کائنات ارضی و سماوی، اور قیامت تک کے تمام ادوار کے لیے خاتم الانبیاء سرورِ کون و مکان، فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کر دیا گیا۔ اور وہ دنیا کے سب سے عظیم انقلاب اور سب سے بڑے دین کے داعی اور مبلغ اعظم قرار پائے۔ ارشادِ خداوندی ہے،

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ؂ — اور اے محبوب! ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

نیز فرمایا،

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ — وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت

؁ بنی اسرائیل (۱۷ : ۱۵)

؂ سبا (۳۴ : ۲۸)

Marfat.com

الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ — ہے جس نے اپنے برگزیدہ بندے پر

لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا [1] — قرآن نازل کیا تاکہ وہ اہلِ عالم کو ہدایت کرے

خدا تعالےٰ نے آپؐ کے دامن کو عالمین کی ہدایت کے سامان کے ساتھ ساتھ آفاقی و کائناتی رحمتوں سے بھی بھر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا — اور (اے محبوب) ہم نے آپ کو

رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ [2] — تمام عالمین کے لیے رحمت (بناکر) بھیجا ہے۔

اب جس طرح تمام جہانوں کا پروردگار ایک ہی ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ — سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے

الْعٰلَمِیْنَ [3] — جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔

اسی طرح کل کائنات ایک نبی و رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پرچمِ رحمت تلے جمع کر دی گئی۔ اور یوں توحیدِ باری کے ساتھ ساتھ توحیدِ رسالت کا تصور بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ صرف یہی نہیں کہ آپ کی رسالت آپ کے زمانے اور اس کے مابعد کے ادوار کے لیے ہے بلکہ آپؐ سے پہلے کے زمانے بھی آپؐ کی دسترسِ نبوت سے باہر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے روز جب اُمتوں پر گواہی کی ضرورت ہوگی تو ان کے انبیاء کو بلایا جائے گا اور جب ان انبیاء کی شہادت پر گواہی درکار ہوگی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام پکارا جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ — بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر

---

[1] الفرقان (۲۵:۱)

[2] الانبیاء (۲۱:۱۰۷)

[3] الفاتحہ (۱:۱)

Marfat.com

أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيدًا [1] | اُمت میں سے احوال بتانے والے (نبی) کو بلائیں گے اور آپ کو ان سب کا حال بتانے کے لیے گواہ طلب کریں گے۔

یہ تو تھا اسلام کا تصورِ رسالت و نبوّت۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ

ب۔ **ضرورتِ رسالت** نظامِ رسالت کے پیچھے کون سے عوامل کارفرما ہیں؟ اور نظامِ رسالت و نبوت کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟

اس مسئلے کو ہم چار جہتوں کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں:

(۱) انسان کا مقصدِ تخلیق اور ضرورتِ رسالت

(۲) نسلِ انسانی کی جوابدہی کا تصوّر اور ضرورتِ رسالت

(۳) انسانی علم کی کم مائیگی اور ضرورتِ رسالت

(۴) انسانی عمل کی تکمیل اور ضرورتِ رسالت

۱۔ انسان کا مقصدِ تخلیق اور ضرورتِ رسالت

ایک مشہور عربی ضرب المثل ہے:

فعل الحکیم لا یخلوا عن الحکمۃ | دانا کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔

اس اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے ہر کام کی کوئی نہ کوئی غرض اور کوئی نہ کوئی جہت ضرور ہوتی ہے۔ اگر کسی کام کی کوئی جہت نہ ہو تو اسے عبث، بیہودہ اور محض فعلِ صبیان جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے جو کسی بھی عاقل و بالغ شخص کے لیے عیب کی حیثیت رکھتی ہے اسی لئے انسان کے تمام سماجی و معاشرتی، معاشی و اقتصادی اور

---

[1] النساء (۴: ۴۱)

Marfat.com

سیاسی و اخلاقی منصوبے، تمام علوم فنون اور روزمرہ کے جملہ مشاغل و سرگرمیاں بامقصد (PURPOSIVE) ہیں اور انسان اپنے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ اس کا یہ کام مقصد و حکمت سے خالی ہے۔ اگر انسان کی یہ حالت ہے جو خدا کے مقابلے میں "لا شئ" کی حیثیت رکھتا ہے تو خدا تعالیٰ کے متعلق یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ اس کی اتنی بڑی تخلیق بے مقصد اور بے فائدہ ہے؟

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تخلیقِ کائنات اور خود تخلیق انسان کے متعلق موجودہ سائنس کا یہ نظریہ ہے کہ یہ تخلیق محض ایک حادثہ (INCIDENT) اور ایک اتفاق (CHANCE) ہے۔ سائنس والوں کا خیال ہے کہ آفرینشِ کائنات کے وقت مختلف اقسام کی گیسیں گردش کر رہی تھیں، پھر وہ باہم الگ تھلگ اور ٹھوس ہو کر، کچھ منور اجسام میں بدل گئیں اور کچھ تاریک و غیر روشن اجسام میں۔ اس طرح یہ کائنات (معاذ اللہ) آپ سے آپ وجود میں آ گئی۔ قطع نظر اس کے کہ ہمارے مذہب نے ہمیں کیا تعلیم دی ہے، قابلِ غور بات یہ ہے کہ آیا کائنات کی کوئی چیز بھی خود بخود وجود میں آ سکتی ہے۔ پھر سائنس خود افعال کے اسباب و علل کی تلاش و جستجو کا نام ہے۔ اگر زمین کا ایک پتا بھی ہلتا ہے تو سائنس اس کا کوئی نہ کوئی سبب (CAUSE) بیان کرتی ہے — تو کیا یہ ممکن ہے کہ اتنے بڑے کارخانۂ قدرت کی تخلیق بے سبب ہو۔

اسی بنا پر خالق و مالکِ کائنات نے مظاہرِ قدرت میں غور و فکر کرنے اور ان سے کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد دریافت کرنے پر زور دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ [1]	کیا اُنھوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں اور جو چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں ان کی

---

[1] الاعراف (۷: ۱۸۵)

معنویت اور مقصد، پر نظر نہیں کی۔

نیز فرمایا،

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ [1] — کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے مقصد پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔

اگر انسان کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل مدعا اور جہتِ مقصدیت سے خالی نہیں ہوتا تو خدائے علیم و خبیر کی نسبت بھلا یہ کیونکر تصور کر لیا جائے کہ اس کا یہ فعل محض شغل ہی ہے اور اپنے اندر کوئی غرض و غایت نہیں رکھتا۔

اسی بنا پر جب مردِ حق کائنات کی ان آیاتِ بینات پر نظر ڈالتا ہے اور اسے فعلِ خداوندی کی صحیح معرفت نصیب ہوتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا [2] — اے ہمارے پروردگار! تو نے اس مخلوق کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔

وہ کائنات کے سینے پر دھڑکتے ہوئے دل کی آواز سنتا ہے، اس کی نگاہیں تمام موجوداتِ عالم کے حجابات کو چیر کر اپنے خالق و مالک کو پہچان لیتی ہیں اور پھر اس کے دل میں اسی آقا و مولیٰ کی یاد انگڑائیاں لینے لگتی ہے۔ اسی بنا پر فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ [3] — لیکن جو ایمان والے ہیں، وہ خدا سے شدید محبت رکھتے ہیں۔

---

[1] المؤمنون (۲۳: ۱۱۵)

[2] آل عمران (۳: ۱۹۱)

[3] البقرہ (۲: ۱۶۵)

Marfat.com

★ سائنس اور اسلام یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ عام طور پر مذہبی معتقدات اور سائنسی اکتشافات کے درمیان تصادم (CLASH) نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی تحقیق (SCIENTIFIC RESEARCH) کا زاویہ اور دائرۂ کار مذہبی عقائد و فکر کے زاویے اور دائرۂ کار سے قطعی مختلف ہے۔ مذہب مابعد الطبیعیاتی حقائق سے بحث کرتا ہے جبکہ سائنس کی تحقیق کا دائرہ طبعی زندگی کے نظام (PHENOMENA OF PHYSICAL WORD) تک محدود ہے۔

مذہب وحیٔ ربانی کی قوت سے مکان اور لامکان کی بے کنار وسعتوں میں پرواز کرتا ہے اور سائنس کائناتِ ارضی کی فضاؤں میں محصور ہے۔ تاہم بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں قرآن و حدیث نے ایک حقیقت (FACT) اور نظریے (THEORY) کو صراحت سے بیان کر دیا ہے اور وہ حکم قطعی الثبوت بھی ہے۔ ایسے اسلامی نظریے کے خلاف سائنس کی کوئی بھی شاخ، کوئی نظریہ پیش کرنے کی جسارت کرے تو اسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء ہو یا لومبروسو کا فلسفۂ جرمیات، حیوانیات کا کوئی موقف ہو یا حیاتیات کا کوئی فیصلہ، ہم مذہب کے صریح حکم کے مقابلے پر اسے قطعاً قبول نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ہر سائنسی تحقیق طویل مدت گزر جانے کے باوجود اقدام و خطا (TRIAL & ERROR) کے رُخ پر زیرِ تحقیق ہی رہتی ہے اور مسلمہ حقیقت کم ہی بنتی ہے جبکہ مذہب اور اس کے معتقدات تحقیق و تفتیش سے ہمیشہ بالاتر رہتے ہیں۔

★ مقصدِ تخلیقِ کائنات بہر حال جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کائنات کو اللہ رب العزت ہی نے تخلیق کیا ہے تو پھر اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یقیناً اس کائنات کی تخلیق کا کوئی مقصد ہو گا چنانچہ قرآن حکیم اس تصور کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہوئے آگاہ کرتا ہے،

Marfat.com

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ؁۱

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

اور پھر انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے رب العزت کی شایانِ شان بندگی بجالانے کی غرض سے بہترین صورت پر پیدا کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ؁۲

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

اس سلسلے میں انسان کو ایک اور مقام پر ان الفاظ میں تنبیہہ کی گئی ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۙ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۙ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ؁۳

اے انسان! تجھ کو اپنے رب کریم کے باب میں کس چیز نے دھوکہ دیا (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضا کو درست کیا اور تیری قامت کو معتدل رکھا۔ پھر جس صورت میں چاہا، تجھے جوڑ دیا

مقصدِ تخلیق اور رسالت

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اس کائنات تو اور اس میں بسنے والی اہم ترین مخلوق انسان کو خدا نے ہی پیدا کیا اور اسی نے تمام حوائج انسانی کی تکمیل فرمائی۔ اُسی نے انسان کو اس کے گمان اور قیاس سے بڑھ کر نعمتوں اور احسانات سے نوازا اور پھر اس کی تخلیق کا مقصد یہ قرار دیا کہ اُس کی عبادت کی جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خدا نے انسان تک اس کا مقصدِ تخلیق پہنچانے کا کوئی انتظام بھی کیا یا نہیں عقل اس بات کو باور نہیں کرتی کہ انسان کی تخلیق تو بامقصد

؁۱ الذاریات (۵۱: ۵۶) ؁۲ التین (۹۵: ۴) ؁۳ الانفطار (۸۲: ۶ تا ۸)

Marfat.com

ہو مگر اسے اس کے مقصد حیات سے آگاہ کرنے کا کوئی بندوبست کیا گیا ہو اس سے تو (معاذ اللہ) خدا کی ذات و الا صفات پر الزام آتا ہے کہ اس نے اتنی وسیع و عریض کائنات پیدا تو کردی پھر کائنات اور حضرت انسان میں ربط و تعلق بھی پیدا کر دیا، مگر اسے یہ بتانے کا کوئی انتظام نہیں فرمایا کہ اس کا اس کائنات میں اور خود اس کائنات کا اس کے دل و دماغ میں مقام اور درجہ کیا ہونا چاہیے؟ آیا انسان کائنات اور اس کے موجودات کی خدمت و پرستش کے لیے ہے یا کائنات خود اس کی خدمت و اطاعت کے لیے ہے؟ اور یہ کہ یہاں اسے کیسے گزر اوقات کرنی ہے؟ کس کا حکم ماننا ہے؟ کس کا نہیں ماننا؟۔ اس مضمون کو سورۃ الانعام میں کس خوبی سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے :

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ [1]

اور ان لوگوں نے خدا کی قدر شناسی کا حق ادا نہ کیا۔ جب انہوں نے یہ کہہ دیا کہ خدا نے کسی انسان پر (وحی اور کتاب وغیرہ) کچھ بھی نازل نہیں کیا۔

گویا یہ کہہ دینا کہ خدا نے اس دنیا کی مادی و جسمانی حوائج کی تکمیل تو کی ہے مگر روحانی و باطنی ضروریات کو تشنہ چھوڑ دیا، ذات خداوندی کی سخت ناقدری اور ناشکری کرنے کے مترادف ہے۔ یہ تو بالکل ایسا ہے کہ کوئی شخص کسی کو ملازم تو رکھ لے مگر اسے اس کے حقوق و فرائض سے آگاہ نہ کرے، اسے یہ نہ بتائے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس کام سے بچنا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر خداوند تعالیٰ انسان کو اس کے فرائض و واجبات سے آگاہ نہ فرمائے تو وہ اپنی اس شاہکار تخلیق میں (معاذ اللہ) کہاں تک

---

[1] الانعام (۶ : ۹۱)

Marfat.com

صاحب حکمت ہو سکتا ہے۔!

بہرحال انسان کو اس کے مقصد حیات اور اس کی تخلیق کی غرض و غایت سمجھانے کے لیے عقل سلیم نظام رسالت کو ناگزیر سمجھتی ہے جسے اللہ رب العزت نے اپنے فضل و کرم سے پورا فرما دیا ہے۔

۲- نسل انسانی کی جوابدہی کا تصور اور ضرورت رسالت

قاعدہ ہے کہ ہر با مقصد شے کا سفر حیات کسی نہ کسی منطقی انجام تک ضرور پہنچتا ہے اور جس پر کسی خاص مقصد کو پورا کرنے کی ذمہ داری عائد کی جاتی ہے اس سے مناسب وقت پر جواب طلبی بھی ضرور کی جاتی ہے۔ ہم روزمرہ زندگی میں اسکی مثالیں عام دیکھتے ہیں۔ ملازم جس کام پر مامور ہوتا ہے اگر اس سے اس کے مالک کا جواب طلبی کرنا بجا ہے تو خدائے علیم و خبیر کا انسان سے جواب طلبی کرنا کیوں ضروری قرار نہیں پاتا؟ جب کہ رب العزت نے انسان کی تمام طبعی اور جسمانی حوائج کی اس طرح تکمیل فرمائی ہے کہ بڑے سے بڑا آقا بھی اپنے غلام کو ان سہولیات کا عشر عشیر بھی فراہم کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔

★ تکمیل حوائج

ذرا غور کیجیے کہ خدا نے کس طرح حوائج انسانی کی تکمیل کی انسان کا سب سے پہلا مسئلہ قرارگاہ اور حصول معاش تھا جو اسے دیا گیا،

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ [1]

اور تمہارے لیے زمین میں ایک وقت تک ٹھکانا اور معاش مقرر کیا گیا ہے۔

اس کا دوسرا مسئلہ زندگی کی ضروریات اور آسائشوں کا تھا، وہ بھی پورا کر دیا گیا،

---

[1] البقرہ (۲:۳۶)

Marfat.com

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَاءً ثَجَّاجًا لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا [1]

اور ہم نے نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا تاکہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں اور گھنے گھنے باغ لگائیں۔

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِى الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ [2]

بیشک ہم نے تمہیں زمین میں تصرف عطا کیا اور اس میں تم سب کے لیے سامانِ معیشت پیدا کیے۔

انسان کی ایک طلب یہ بھی تھی کہ اسے ماحول کا جائزہ لینے اور اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع دیا جائے، یہ بھی پوری کر دی گئی:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ ۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ [3]

بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے۔

انسان کو بھرپور زندگی گزارنے کیلئے اعضاء و جوارح کی ضرورت تھی فرمایا گیا:

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ

اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنایا۔

اس کے علاوہ انسان کو خیر و شر میں تمیز کے لیے فہم و بصیرت درکار تھی جو اسے مرحمت فرما دی گئی۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ [4]

اور اس کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھائے۔

---

[1] النباء (۷۸: ۱۴ تا ۱۶) [2] الاعراف (۷: ۱۰) [3] البلد (۹۰: ۸-۹)
[4] البلد (۹۰: ۱۰) (ملک ۶۷: ۲۳)

Marfat.com

نیز فرمایا :

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ؎۱ — اور اسے ہر چیز کے باب میں برائی اور اچھائی کے دونوں پہلوؤں کا شعور عطا کیا گیا۔

پھر اس کی یہ خواہش تھی کہ اسے اپنی تگ و دو کا پورا پورا صلہ میسر آئے۔ یہ خواہش بھی پوری کی گئی :

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ؎۲ — اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے کوشش کی۔

اب غور کیجیے، جس خدا نے انسان کی تمام ضروریات، جملہ خواہشات پوری کیں، اسے کھانے پینے، پہننے اور زندگی بسر کرنے کو قسم قسم کی چیزیں دیں —— وہ خدا کیا انسان کو بغیر جواب طلب کیے چھوڑ دے گا۔ ارشاد ہے :

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ؎۳ — کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔

دنیا میں رہتے ہوئے ہر شخص کو بعض اوقات اس کے اعمال کا خاطر خواہ بدلہ نہیں ملتا، کیونکہ اس طرح اس دنیا کے آزمائش گاہ ہونے کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے موت اور مابعد الموت کی زندگی رکھی گئی ہے، تاکہ انسان یہاں جو کچھ کرے اس کی آخری اور حتمی جزا و سزا اگلی دنیا میں دی جا سکے۔ چنانچہ

؎۱ الشمس (۹۱ : ۸)

؎۲ النجم (۵۳ : ۳۹)

؎۳ القیامہ (۷۵ : ۳۶)

Marfat.com

کہا جا سکتا ہے کہ حضرت انسان کی تخلیق با مقصد ہے۔ زندگی بھی با مقصد ہے اور موت بھی بامقصد ہوگی۔ زندگی انسان کو وسائل مہیا کرتی ہے تو موت ان کے استعمال پر ٹھیک ٹھیک جزا و سزا فراہم کرے گی۔

قیامت کے دن انسان کی تمام چالاکیاں اور عیاریاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ وہاں فقط سچائی اور ایمان و اعمال کی درستی ہی اس کے کام آئے گی۔

اب یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب خدا نے دنیا کو دارالعمل بنایا انسان کے اعمال کی جزا و سزا کا ایک مرحلہ اس دنیا میں رکھا اور حتمی فیصلے کے لیے موت کے بعد کی زندگی کو مخصوص کر دیا تو کیا اس دُنیا میں رہتے ہوئے انسان کو اس کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرنے کا بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی نظام مقرر کیا گیا یا نہیں؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا، تو جزا و سزا کا یہ سارا نظام بے معنی ٹھہرتا ہے۔ اللہ رب العزت تو کسی انسان پر رتّی برابر بھی ظلم روا نہیں رکھتا۔ اُس کا اعلان یہ ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؎۱	اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

وہ بھلا کیونکر گوارا فرمائے گا کہ جس انسان کو ربانی ہدایات کا کوئی ضابطہ ہی مہیا نہیں کیا گیا، اس سے مؤاخذہ فرمائے۔ ؎۲ اگر کسی ملازم کو اس کے کام اور فرائض

؎۱ الانبیاء (۲۱ : ۴۷)

؎۲ دیکھیے بنی اسرائیل (۱۷ : ۱۵)

Marfat.com

کی نشاندہی کرنے والی ہدایات سے محروم رکھا گیا ہو، تو اس کے مالک کو اس سے مؤاخذہ کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ ہم اپنے ملازمین کو پہلے ہدایات کا چارٹر دیتے ہیں، پھر وقت آنے پر اسی چارٹر کی بنا پر اس سے جواب طلبی کرتے ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ جو بڑا ہی رحیم و کریم ہے اس کی نسبت یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ وہ کوئی ضابطہ دیئے بغیر انسان سے روزِ قیامت کو جواب طلبی فرمائے گا اور کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل سے آگاہ کیے بغیر انسان کو اس کے افعال پر جزا و سزا دے گا۔ لہٰذا جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے انسان کو اس کے حقوق و فرائض، آزادیوں اور ذمہ داریوں کی تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے نظامِ رسالت کو بروئے کار لایا گیا ہے۔

(۳) انسانی علم کی کم مائیگی

اللہ رب العزت نے چونکہ انسان کو باقاعدہ ایک مقصد کے تحت تخلیق فرمایا ہے، اس لیے اسے اپنے ماحول اور گرد و پیش سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ذرائعِ علم (SOURCES OF KNOWLEDGE) بھی عطا فرمائے ہیں[۱] انسان

---

[۱] قرآن کریم میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِۙ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ	بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے (یہ چیزیں بھی دیں) اور اسے خیر و شر کے دونوں راستے بھی دکھائے۔

(البلد ۹۰ : ۸ تا ۱۰)

مزید ارشاد فرمایا گیا

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ	اور اس نے تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔

(ملک ۶۷ : ۲۳)

Marfat.com

کو سوچنے سمجھنے کے لیے طاقتور دماغ، دیکھنے کے لیے صاف شفاف آنکھیں، سننے کے لیے حساس کان، چکھنے کے لیے زبان، سونگھنے کے لیے ناک، چھونے کے لیے ہاتھ اور احساسِ لمس کے لیے اعصاب بخشے گئے۔ان ذرائع علم کو عقل اور حواس کہا جاتا ہے۔ یہ اس ذات کی عنایت ہے کہ اس نے ان ذرائع کو بالعموم ہر انسان کے لیے کھلا رکھا ہے، انہیں محدود اور مسدود نہیں فرمایا۔

انسان کو ذرائع علم عطا کیے جانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بھرپور طریقے سے کائنات میں زندگی بسر کر سکے۔ مخلوقات اور ان کے خواص و اوصاف کو جانے، ان کی حقیقتوں کا ادراک کرے اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کیلئے مختلف زاویوں سے غور و فکر کر سکے۔

ذرائع علم کی اقسام

اس مقصد کے لیے بلاتمیز رنگ و نسل انسان کو جو ذرائع علم عطا کیے گئے ہیں انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) حواسِ خمسۂ ظاہری

حواس کی پہلی قسم حواس خمسۂ ظاہری کہلاتی ہے، جن کی تعداد پانچ ہے۔ اور یہ عمر کے ساتھ ساتھ تکمیلی مراحل طے کرتے چلے جاتے ہیں۔

(۱) قوتِ لامسہ (چھونے کی قوت)

(۲) قوتِ باصرہ: آنکھوں سے دیکھنے کی قوت

(۳) قوتِ سامعہ: کانوں سے سننے کی قوت

(۴) قوتِ ذائقہ: زبان سے چکھنے کی قوت

(۵) قوتِ شامہ: ناک سے سونگھنے کی قوت

یہ وہ پانچ ذرائع علم ہیں جن کی بدولت انسان اپنے گرد و پیش اور ماحول سے اپنا ادراکی تعلق قائم

Marfat.com

کرتا ہے مگر یہ حواس صرف ظاہری دنیا (PHYSICAL WORLD) کی حقیقتوں کو جاننے اور ان کا ادراک کرنے تک محدود رہتے ہیں ۔ یہ حواس انسانی ذہن کو فقط ظاہری خام مواد ——— مہیا کرنے پر مامور ہیں۔ قوتِ لامسہ کا کام کسی چیز کو چھو کر یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ چیز کیسی ہے؟ نرم و گداز ہے یا سخت اور کھردری۔ لیکن اگر کوئی چیز غیر مادی جسم رکھتی ہے تو ہاتھ کوشش کے باوجود اس کے وجود کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ اس طرح قوتِ باصرہ کا کام مرئی اشیاء کو دیکھنا اور ان کے وجود کا سراغ لگانا ہے، لیکن آنکھ اسی وقت جسم کا سراغ لگا سکتی ہے جب کوئی چیز دیکھے جانے کے قابل ہو۔ اگر کوئی چیز غیر مرئی ہے تو اس کو قوتِ باصرہ معلوم نہیں کر سکتی۔ علیٰ ہذا القیاس قوتِ سامعہ کا کام آواز کا پتا لگانا ہے۔ خوشبو یا بدبو کو قوتِ شامہ کے ذریعے جانا جاتا ہے۔ مٹھاس یا کڑواہٹ کا احساس قوتِ ذائقہ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔[۱]

★ حواسِ خمسہ کا ایک دوسرے کی جگہ لینا محال ہے

جو چیز آنکھ کے ذریعے معلوم کی جا سکتی ہے، وہ کسی اور حس کے ذریعے نہیں جانی جا سکتی۔ مثلاً کوئی شخص آپ کے قریب آ کر بیٹھ جائے اور آپ آنکھیں بند کر لیں تو اپنے بقیہ چاروں حواس استعمال کرنے کے باوجود آپ کسی صورت میں بھی اس شخص کے وجود کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر کسی شخص

---

[۱] اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ غیر حسی اور غیر مادی اشیاء کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ موجود ہیں تو ہمیں دکھائی کیوں نہیں دیتیں، ناسمجھی کی بات ہے۔ کیونکہ ہمارے حواس غیر مادی اشیاء کو جاننے اور ان کا ادراک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ تجدد پسند لوگوں کا فرشتوں اور جنوں سے متعلق اعتراض بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔

Marfat.com

کی قوت سامعہ مفقود ہو جائے تو وہ بقیہ چاروں حواس کو آزمانے کے باوجود آواز کا سراغ لگانے سے قاصر رہتا ہے۔ اگر زبان ذائقے کا پتا نہ چلا سکے تو آنکھ، ناک، کان اور ہاتھ پاؤں سلامت ہونے کے باوجود بھی وہ مختلف ذائقوں میں تمیز نہیں کر سکتا۔ لے

★ **حواس ظاہری کا دائرہ محدود ہے** اب ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر حس کا ایک مخصوص دائرہ اور حلقہ ہوتا ہے۔ جو اشیا حواس ظاہری کے ذریعے معلوم کی جاتی ہیں، انہیں ادراکات حسی کہتے ہیں۔ جو شے جس حاسے کے دائرہ کار میں آتی ہے، اسے ہمیشہ اسی حاسے کی مدد ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس حاسے کے بجائے اس پر دوسرے حواس آزمائے جائیں تو ہزار کوششوں کے باوجود اس چیز کی صحیح ماہیت اور حقیقت کا ادراک ناممکن ہوتا ہے۔

آواز کو کان کے ذریعے سے معلوم کیا جائے گا تو وہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ رنگوں کو آنکھوں کے ترازو میں تولا جائے گا تو ان میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ خوشبو کو قوت شامہ کے ذریعے معلوم کیا جائے گا تو وہ انسانی ادراک میں آسکتی ہے، لیکن مذکورہ بالا حواس کے علاوہ اسی چیز کو کسی دوسرے حاسے کی مدد سے جاننے کی کوشش بیکار ثابت ہوگی۔

طے یہ پایا کہ اگر کوئی وجود دنیا میں موجود ہے مگر اس کو معلوم کرنے والی خاص حس

لے اس سے بھی انسان اور اس کے حواس کی بے بسی عیاں ہو جاتی ہے کہ انسان کو اپنے جن حواس پر ناز ہے اور جن کے متعلق اس کا خیال ہے کہ وہ ان سے ہر حقیقت جان اور پرکھ سکتا ہے، ان کی حالت تو یہ ہے کہ اگر خود ان میں سے کوئی حس مفقود ہو جائے تو سب مل کر بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔

Marfat.com

موجود نہیں، تو پھر باقی سارے حواس آزمانے کے باوجود اس وجود کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ ؎

★ مولانا رومؒ کا بیان کردہ واقعہ مولانا رومؒ نے اس بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے بڑی عمدہ مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں، کسی جگہ پانچ اندھے تھے، اُنھوں نے ساری زندگی ہاتھی کو نہیں دیکھا تھا، ایک مرتبہ ہاتھی کو ان کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا گیا۔ اور ہر ایک سے کہا گیا کہ باری باری ہاتھ سے چھو کر بتاؤ کہ ہاتھی مجموعی طور پر کیسا ہوتا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے اس ہاتھی کو جاننے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کوشش کے نتیجے میں ایک نابینا کا ہاتھ ہاتھی کے پیٹ پر پڑا۔ اس نے کہا ہاتھی تو دیوار کی طرح ہوتا ہے۔ ایک نابینا نے اپنا ہاتھ ہاتھی کی ٹانگوں پر رکھا تو اس نے خیال کیا کہ ہاتھی تو ستونوں کی طرح ہوتا ہے۔ ایک نے اپنے ہاتھ سے ہاتھی کے کان کو ٹٹولا تو اس نے گمان کیا کہ ہاتھی تو پنکھے کی طرح ہوتا ہے۔ اس طرح کسی نے سونڈ پر ہاتھ لگایا تو اس نے کہا کہ ہاتھی تو رسّے کی مانند ہوتا ہے۔

الغرض پانچوں کے پانچوں نابینا اپنے تمام تر حواس آزمانے کے باوجود، اتنے بڑے وجود (ہاتھی) کے صحیح ادراک سے قاصر رہے۔ وجہ صرف یہ تھی کہ جس حاسے کی مدد سے اس وجود کو جانا جا سکتا تھا، یہ لوگ اس سے محروم تھے۔ اور اس کی عدم موجودگی میں دوسرے تمام حواس آزمانے کے باوجود انہیں ہاتھی کی شکل و صورت معلوم

؎ اسی بنا پر شیخ سعدی نے گلستان میں بجا طور پر فرمایا ہے،

نہ ہر جا کہ مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

Marfat.com

نہ ہوسکی۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ:

اولاً: حواسِ خمسہ ظاہری صرف دنیا کی اشیا (PHYSICAL WORLD) کا ادراک کر سکتے ہیں جس میں مادہ بھی شامل ہے اور توانائی بھی۔

ثانیاً: ہر حس کا ایک مخصوص دائرۂ کار ہے۔ جو چیز اس دائرے میں آجائے، وہ حس فقط اسی کو محسوس کر سکتی ہے لیکن جو چیز اس حس کے دائرے سے باہر ہو اس چیز کا صحیح ادراک تمام حواس مل کر بھی نہیں کر سکتے۔

★ انسانی جسم میں عقل کی حیثیت

ایک اور قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ اگر پانچوں حواس درست اور سلامت ہوں، لیکن انہیں عقل کی سرپرستی حاصل نہ ہو، تو یہ پانچوں حواس کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک محسوس کرنے کے باوجود انسان کو کسی خاص نتیجے تک نہیں پہنچا سکتے۔ ان سے حاصل شدہ مواد کو خام مال (RAW MATERIAL) یا ادراک (PRECEPTION) تو کہہ سکتے ہیں، علم ہرگز نہیں قرار دے سکتے۔ یہ ادراک اور یہ احساس اسی وقت علم کا روپ اختیار کرتا ہے جب آنکھوں کی بصارت، کانوں کی سماعت، ہاتھوں کے لمس اور زبان کے ذائقے کا تأثر عقل پر وارد ہو اور عقل اس سے صحیح نتائج اخذ کر کے انسانی جستجو کو خاص نہج عطا کر دے اور اس ادراک کو منظم کر دے۔ [1]

---

[1] انسانی جسم مکمل طور پر ایک خودکار مشین کی طرح کام کرتا ہے اور اس میں دماغ کی حیثیت کمپیوٹر کی سی ہے۔ موجودہ تحقیقات سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ دماغ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

انسانی جسم کے جس حصے میں یہ سب عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے، اسے دماغ کہتے ہیں۔ اللہ رب العزت نے بذاتِ خود عقل کو ایک بہت بڑا کارخانہ (FACTORY) بنا دیا ہے۔

★ **تحصیلِ علم میں عقل کا کردار** : جس طرح حواس ظاہری کے پانچ الگ الگ حصے ہیں، اسی طرح عقل کے بھی پانچ الگ الگ گوشے ہیں۔ عقل کے یہ تمام حصے نہایت نظم وضبط اور باہمی افہام وتفہیم سے کام کرتے ہیں۔ حواسِ خمسہ ظاہری جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اس کے تأثرات جوں کے توں دماغ تک پہنچا دیتے ہیں۔ عقل اپنے پانچوں شعبوں کی مدد سے ان تأثرات سے صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کان نے کیا سنا، ہاتھوں نے کیا چھوا، زبان نے کون سا ذائقہ چکھا اور آنکھ نے کیا دیکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حواس کا کام دماغ کے لیے معلومات کا خام مواد تیار کرنا ہے، ان محسوسات کو سمجھنا نہیں۔ کان بذاتِ خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ سنے ہوئے الفاظ کا مطلب کیا ہے، آنکھ بذاتِ خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ سرخ اور سبز رنگ میں کیا

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ)

پورے جسمِ انسانی کو کنٹرول کرتا ہے، اس کو ایک نظام کے تحت مربوط کرتا ہے اور ان سب میں ایک شعوری کیفیت جاری وساری کرتا ہے۔ یہ تمام مراحل غیر محسوس طریقے پر خودکار نظام کے تحت یوں وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ انسان کو اس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ لیکن اگر ان تمام کیفیات کا تجزیہ کیا جائے تو پھر قدم قدم پر ارشادِ ربانی کی حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا

اگر تم خدا کی ان نعمتوں کو گننا چاہو تو نہ گن پاؤ۔

(النحل ۱۶:۱۸)

Marfat.com

فرق ہے، ہاتھ اور زبان خود یہ نہیں بتا سکتے کہ فلاں چیز نرم ہے یا سخت، میٹھی ہے یا کڑوی ـــــ آخری فیصلہ عقلِ انسانی صادر کرتی ہے، حواسِ خمسہ نہیں۔ گویا علم کی آخری صورت گری عقل سے ہوتی ہے، حواسِ خمسہ سے نہیں۔

انسانی حواس کی بے بسی : حواسِ ظاہری کا دائرہ کار پہلے ہی صرف مادی اور طبیعی دنیا (PHYSICAL WORLD) تک محدود تھا، غیر مادی اشیا کا ادراک حواسِ ظاہری کے ذریعے ناممکن تھا۔ یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ انسانی حواس کی معلوم کردہ اشیا کو اگر عقلِ انسانی منظم اور مربوط نہ کرے تو حواسِ خمسہ کے یہ تمام تاثرات علم کا روپ نہیں دھار سکتے۔ ؎۱

(ب) حواسِ خمسہ باطنی

جس طرح محسوساتِ ظاہری کے لیے قدرت نے پانچ حواس تخلیق فرمائے ہیں، اسی طرح عقلِ انسانی میں بھی پانچ مدرکات پیدا کیے گئے ہیں، جنہیں حواسِ خمسہ باطنی کہا جاتا ہے۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) حسِ مشترک : انسانی عقل کا یہ گوشہ حواسِ ظاہری کے تاثرات کو وصول (RECEIVE) کرتا ہے۔ حواس کے اولین تاثرات اس حصۂ عقل پر جا کر جذب ہو جاتے ہیں۔ مثلاً جب ہم اپنی آنکھ سے کسی چیز کو دیکھتے ہیں، تو انسانی عقل کے اس حصے پر اس کی تصویر مرتسم ہو جاتی ہے اسی لیے اسے لوح النفس بھی کہتے ہیں۔ ؎۲

؎۱ اس کی صحیح مثال کسی دیوانے یا پاگل کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جس کے تمام حواس اپنی اپنی جگہ درست اور صحیح و سالم ہوتے ہیں، مگر دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا ہوتا، اس بنا پر اس کے حواس کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں اور صحیح علم وجود میں نہیں آ سکتا۔

(حاشیہ ؎۲ آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

(۲) حسِ خیال : حسِ خیال کا کام یہ ہے کہ مدرکات اور محسوسات کی جو تصاویر اور شکلیں حسِ مشترک میں پہنچتی ہیں، حسِ خیال ان کی ظاہری صورتوں کو اپنے اندر محفوظ کر لیتی ہے۔ مثلاً جب ہم لفظ "میں" بولتے ہیں، تو اس لفظ کی ظاہری صورت یعنی "میم" "ی" اور "نون غنہ" ہے چنانچہ اس کے ظاہر کا یہ تاثر حسِ مشترک پر منعکس ہوتا ہے، اور یہ تاثر بصورت تصویر حسِ خیال میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

(۳) حسِ واہمہ : جس طرح محسوسات کی ظاہری شکل و صورت کو حسِ مشترک نے حواس ظاہری سے وصول کیا تھا اور "حسِ خیال" نے اسے اپنے حافظے میں محفوظ کر لیا تھا، اسی طرح حسِ واہمہ مدرکاتِ حسی کے معنی و مفہوم یعنی ان کی باطنی شکل و صورت کا ادراک کرتی ہے اور محفوظ رکھنے کے لیے ان تاثرات کو اس سے اگلی حس میں منتقل کر دیتی ہے جسے حافظہ کہا جاتا ہے۔

(۴) حسِ حافظہ : یہاں محسوسات کے مفہوم یعنی معنوی وجود کو اس طرح سے محفوظ کیا جاتا ہے، جس طرح ان کی ظاہری شکل کو حسِ خیال میں محفوظ کیا گیا تھا۔

(۵) حسِ متصرفہ : پانچویں اور آخری باطنی حس متصرفہ کہلاتی ہے، جس کا کام یہ ہے کہ حسِ مشترک میں آنے والی ظاہری صورت کو قوتِ واہمہ میں حاصل ہونے والے معنی

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ)

۲ مشہور لغت دان سید احمد دہلوی (فرہنگ آصفیہ، ۲: ۱۶۱) حس مشترک کے تحت لکھتے ہیں: "حس مشترک اس قوت کا نام ہے جو تمام صور محسوسات کو جو حواس خمسہ ظاہری میں منقوش اور مرتسم ہوتے ہیں قبول کر لیتی ہے۔ پس حس مشترک کو ایک تالاب اور پانچوں حواس ظاہری کو اس میں پانی پہنچانے والی نہریں تصور کرنا چاہیے۔ اس کا مقام پیشانی کے جوف میں ہے۔

Marfat.com

سے اور حسِ خیال میں محفوظ شکل و صورت کو قوتِ حافظہ میں محفوظ مفہوم کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔ اس طرح انسان مختلف الفاظ سن کر ان کا مفہوم سمجھنے، مختلف رنگ دیکھ کر ان میں تمیز کرنے اور مختلف ذائقے چکھ کر ان میں فرق کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ پانچوں حصے باہم مل کر ایک خاص نقطے تک پہنچتے ہیں جسے علم کہا جاتا ہے۔ یہاں ادراک، علم میں بدل جاتا ہے۔ اگر یہاں حسِ مشترک موجود نہ ہو تو یہ پانچوں حواس بے بس ہو کر رہ جائیں۔ اس طرح اگر ان میں حسِ واہمہ صحیح نہ ہو، تو آپ سب کچھ دیکھیں لیکن جان کچھ نہ سکیں۔ آواز تو سنائی دے گی، مگر اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ چیز کو ہاتھوں سے چھوا تو جا رہا ہوگا، مگر نرم اور سخت چیزوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکے گا۔

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ حواسِ ظاہری علم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے حواسِ باطنی کے محتاج ہیں۔ جب تک حواسِ ظاہری کے مدرکات ان پانچوں حواسِ باطنی سے گزر کر ایک صحیح نتیجے تک نہ پہنچیں، اس وقت تک حواسِ ظاہری کے ذریعے محسوس کیے جانے والے تمام مادی حقائق علم کی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔ گویا حواس ظاہری کسی شے کو محسوس تو کرتے ہیں، اسے معلوم نہیں کر سکتے۔

دوسری طرف عقل اور اس کے حواس باطنی مکمل طور پر حواس ظاہری کے محتاج ہیں۔ اگر آنکھ دیکھنے سے، کان سننے سے، ناک سونگھنے سے اور زبان چکھنے سے محروم ہو تو تمام عقلی حواس مل کر بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جہاں حواس عقل کے محتاج ہیں، وہاں خود عقل بھی حواس کی محتاج ہے۔

اگر کسی بچے کو پیدائش کے بعد ایسے مقام پر پرورش کیا جائے جہاں کوئی آواز اس کے کان میں نہ پڑنے پائے تو ایسا بچہ پچاس سال کا ہو جانے کے باوجود نہ کچھ بول سکے گا اور نہ کچھ سمجھ سکے گا وجہ فقط یہ ہے کہ ہم جو کچھ اپنی زبان سے بولتے ہیں درحقیقت نتیجہ ہوتا ہے ان آوازوں کا جو کانوں نے

Marfat.com

سنیں اور جنہیں عقل نے حافظے میں محفوظ کر لیا۔ جب یہ شخص اپنے کان سے کچھ سن ہی نہیں سکا اور اس کی عقل الفاظ، حروف، لہجوں اور آوازوں کو محفوظ ہی نہ کر سکی تو جس طرح اس کا دماغ الفاظ کے معاملے میں سفید کاغذ کی طرح کورا رہا اسی طرح اس شخص کو اپنی کیفیات حاجات اور خواہشات کے بیان پر بھی قدرت حاصل نہ ہو سکی [۱]

انسان اور اس کی بساطِ علم

اب یہ طے پا گیا کہ انسانی عقل کی پرواز صرف وہیں تک ہوتی ہے، جہاں تک حواس اپنا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ جو حقیقت آپ کی باصرہ، سامعہ، لامسہ، ذائقہ اور شامہ قوتوں کی دسترس سے باہر ہو، اس کا ادراک عقل بھی نہیں کر سکتی۔ حواس کے خام مال کے بغیر عقل ایک عضوِ معطل ہے اور عقل کے بغیر سارے کے سارے حواس عبث و بیکار ہیں۔ پس انسان کو جو ذرائع عطا کیے گئے ہیں، وہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس لیے حواسِ خمسہ اور عقل کی فعالیت کے باوجود انسانی زندگی کی حقیقت سے متعلق اکثر سوالات تشنۂ طلب رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسان کو کس نے پیدا کیا؟ انسان کی تخلیق کیسے ہوئی؟ آغازِ کائنات کیسے ہوا؟ اور اس کا اختتام کیسے اور کب ہوگا؟ اس کائنات سے اس کا تعلق کیا ہے؟ اس کائنات میں زندگی گزارنے کے لیے کون سے قانون کی پاسداری کی جائے؟ کون سی چیز اچھی ہے اور کون سی بری؟ ظلم کیا ہے اور انصاف کیا؟ مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے؟ آیا

---

[۱] بنابریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ اقدس میں اہلِ عرب کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنی اولاد کو حضانت کے لیے بدوی عورتوں کے سپرد کر دیتے تھے تاکہ وہ ان لوگوں کی خالص اور فصیح عربی سن کر اسے بولنے پر قادر ہو سکے۔

Marfat.com

وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے یا ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے؟ اگر وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے تو اس نظامِ زندگی کا مفہوم کیا ہوا، اور اگر مرنے کے بعد نئی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس کی کیفیت کیا ہے؟ مزید یہ کہ مرنے کے بعد اس سے کوئی جواب طلبی بھی ہو گی یا نہیں

یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر انسانی زندگی بامقصد ہے تو انسان کو ان سوالات کا تسلی بخش جواب چاہیے۔ جب یہ تمام سوالات انسانی عقل پر دستک دیتے ہیں تو انسان ان کے جواب کے لیے اپنی آنکھوں کی طرف رجوع کرتا ہے، وہ جواب دیتی ہیں کہ ہم تو خود تیرے باعث معرضِ وجود میں آئی ہیں، ہم تیری تخلیق سے پہلے کا حال کیوں کر جان سکتی ہیں۔ انسان اپنے کانوں سے پوچھتا ہے تو کان گویا ہوتے ہیں کہ ہمارا وجود خود تیری ہستی کا رہینِ منت ہے۔ جو اشیا ہمارے دائرۂ ادراک سے ماورا ہیں، ہم ان کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ انسان اپنی قوتِ شامہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے کہ یہ حقائق سونگھنے سے معلوم نہیں ہوتے، میں ان سوالات کا جواب کس طرح دوں۔ انسان اپنی قوتِ ذائقہ سے پوچھتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ ان ماورائی حقیقتوں کو چکھا نہیں جا سکتا، میں بھی مجبور ہوں۔ پھر انسان اپنی قوتِ لامسہ سے سوال کرتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے میں ان احوال کو چھو نہیں سکتی، ان کی نسبت کیا بتاؤں۔ الغرض انسان نے حواسِ خمسہ میں سے ہر ایک کے دروازے پر دستک دی، ان میں سے ہر ایک سے پوچھا کہ بتاؤ ہمارا خالق کون ہے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مجھے آنے کے بعد کہاں جانا ہے؟ اچھائی اور برائی کیا ہے؟ مگر انسانی حواس انتہائی درماندگی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حقائق کوئی آواز نہیں کہ ہم سن کر بتا سکیں، کوئی رنگ نہیں کہ دیکھ کر جواب دے سکیں، مادی اجسام نہیں کہ چھو کر فیصلہ صادر کر سکیں —— اس طرح انسانی حواس کی بے بسی

Marfat.com

اور عاجزی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تمام حقائق جن سے انسان کی اخلاقی، روحانی اور اعتقادی و نظریاتی زندگی تشکیل پاتی ہے، پانچوں حواس کی زد سے ماوراء ہیں تب انسان اپنی عقل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کا دامن جھنجھوڑ کر کہتا ہے : اے میرے وجود کے لیے سرمایۂ افتخار چیز! میری زندگی کے بنیادی حقائق سے متعلق مجھے تمام حواس نے مایوس کر دیا، اب تو ہی اس سلسلے میں میری راہنمائی کر۔ مگر عقل بھی اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے : اے انسان! میں تو تیرے حواس کی محتاج ہوں۔ جو چیز حواس کے ادراک میں نہیں آسکتی، اس کے متعلق میں کیسے فیصلہ صادر کر سکتی ہوں؟ اگر حواس خاموش ہیں تو مجھے بھی بے بس و مجبور سمجھ۔

ربّ العزت نے انسان کو ذریعہ علم کے طور پر ایک اور باطنی سرچشمہ بھی عطا کیا ہے۔ جسے وجدان کہتے ہیں۔

وجدان اور اس کے لطائف

انسانی وجدان کے بھی پانچ گوشے ہیں، ان کو لطائفِ خمسہ کہتے ہیں :

لطیفۂ قلب، لطیفۂ روح، لطیفۂ سر، لطیفۂ خفی، لطیفۂ اخفٰی۔

ان لطائف کے ذریعے انسان کے دل کی آنکھ بینا ہو جاتی ہے۔ حقائق سے پردے اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں، روح کے کان سننا شروع کر دیتے ہیں اور یوں انسانی قلب بعض ایسی حقیقتوں کا ادراک کرنے لگتا ہے جو حواس و عقل کی زد میں نہیں آسکتے۔ لیکن انسانی وجدان کی پرواز بھی طبیعی کائنات (PHYSICAL WORLD) تک محدود ہے۔ امام غزالیؒ ارشاد فرماتے ہیں :

وورا العقل طور آخر تنفتح فيه عين اخرٰى فيبصر

اور عقل کے بعد ایک اور ذریعہ ہے جس میں باطنی آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس کے

Marfat.com

بھا الغیب وما سیکون فی المستقبل و امورا اخر العقل معزول عنھا[1]

ذریعے یعنی حقائق اور مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو دیکھا جاتا ہے اور ان دیگر امور کو بھی جن کے ادراک سے عقل قاصر ہوتی ہے۔

لیکن وہ حقائق جو طبیعی کائنات کی وسعتوں سے ماورا ہیں، جو خدا کی ذات وصفات سے متعلق ہیں اور انسانی تخلیق اور اس کے مقصدِ تخلیق نیز اس کی موت اور ما بعد الموت سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے بارے میں حتمی اور قطعی علم نہ تو حواس دے سکتے ہیں، نہ عقل اور نہ ہی وجدان۔ انسان نے یکے بعد دیگرے تینوں ذرائع علم کے دروازوں پر دستک دی، ان میں سے ایک ایک کو پکارا، مگر ہر ایک نے اسے مایوس کر دیا۔ کوئی بھی ذریعہ اس کے علم کو حتمیت اور قطعیت نہ دے سکا۔ اب انسان خدا کی ذات کو پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ اے ربِ کائنات! میں خود اپنی ذات، اس کائنات اور تیری ذات کو یقینی طور پر سمجھنا چاہتا ہوں مگر میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جو مجھے مطمئن کر سکے۔ اس لیے اس کائنات میں میرے لیے علم کا کوئی ایسا سرچشمہ پیدا کر دے، علم کا کوئی ایسا منبع تخلیق کر دے، جو مجھے ان حقائق کے بارے میں حقیقی آگاہی بخش سکے۔ جہاں تمام حواس ناکام ہو جائیں، وہاں اسے پکارا جا سکے۔ جہاں انسانی عقل خیرہ ہو جائے، وہاں اس سے مدد کی درخواست کی جا سکے۔ جہاں انسانی وجدان بھی نامراد لوٹ آئے، وہاں اس سرچشمۂ علم سے فیضان کی بھیک مانگی جا سکے۔

علومِ نبوّت کا فیضان

انسان جب پوری طرح اپنی علمی بے بسی اور فکری کم مائیگی کا اعتراف کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ندا آتی ہے: اے انسان! تو نے اپنے علم اور اپنے ذرائع

---

[1] المنقذ من الضلال: ص ۵۴، مطبوعہ لاہور۔

Marfat.com

کی بے بسی کا اعتراف کرلیا۔ ہم تجھے یہی سمجھانا چاہتے تھے کہ تو کہیں اپنے حواس و عقل اور کشف و وجدان کی بدولت یہ تصور نہ کر بیٹھے کہ میرا علم درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرا علم ابھی کائنات کی حقیقتوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا[1]۔ اب تجھے جس سرچشمۂ علم کی تلاش ہے وہ ہم نے نظامِ نبوت و رسالت کی صورت میں ـــــــ اس کائنات میں قائم کر دیا ہے۔ جا، دروازۂ نبوت پر دستک دے، اسی چوکھٹ سے رہنمائی طلب کر ـــــ علمِ نبوت کے فیضان سے یہ تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی۔

مقصدِ رسالت و نبوت

نظامِ رسالت و نبوت کے ذریعے قدرت نے انسانوں کو وہ سرچشمۂ علم عطا کر دیا جو انہیں ان کا مقصدِ تخلیق بھی بتلاتا ہے، ان کے خالق و مالک کی ذات کی نشاندہی بھی کرتا ہے، اس کی صفات اور افعال کی معرفت بھی عطا کرتا ہے، یہاں تک کہ مرنے کے بعد کی زندگی کی حقیقت بھی بیان کرتا ہے۔ گویا وہ سب بنیادی حقائق جو چشمِ عالم سے مخفی تھے، علومِ نبوت کے طفیل آشکارا ہو گئے۔ جن کی جستجو انسان ازل سے کرتا آ رہا تھا اور جن کی حتمی معرفت سے انسان کے حواس، عقل اور وجدان سب ناکام ہو چکے تھے، انوارِ رسالت نے تمام حجابات اٹھا کر انہیں تفصیل سے واضح کر دیا۔ لہٰذا اس وقت تک انسانی علم پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک نبوت و رسالت اس کی رہنمائی

---

[1] اسی لیے قرآن مجید میں روح کی حقیقت پر بحث کے دوران میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (بنی اسرائیل، ۱۷: ۸۵)

اور تمہیں بہت ہی تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

Marfat.com

نہ کریں۔

ذرائع انسانی سے حاصل شدہ علم میں غلطی کا امکان

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّمہ ہے کہ حواس کے ذریعے انسان کو جو علم حاصل ہوتا ہے، اس میں بہرصورت غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے۔ عقل غلطی کر سکتی ہے۔ اور وجدان اور کشف میں بھی سقم ہو سکتا ہے جبکہ انسان ایسے حتمی و قطعی علم کی جستجو اور طلب رکھتا ہے، جس میں غلطی اور خطا کا کوئی ادنیٰ سا احتمال بھی موجود نہ ہو۔

عین ممکن ہے کہ زید کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے، عمرو کی آنکھ اسے غلط ثابت کر دے۔ ایک شخص کی عقل ایک دلیل سے جو نتیجہ اخذ کرے، دوسرے کی سوچ اسی دلیل سے اس کے برعکس نتائج منتزع کرے۔ اسی طرح وجدان اور دیگر حواس کے فیصلوں میں بھی غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ لیکن علم کا وہ درجۂ کمال اور علم کی وہ رفیع حالت، جہاں غلطی اور خطا کا کوئی امکان نہ ہو، جہاں انتشار اور افتراق کی کوئی گنجائش نہ ہو، وہ صرف اور صرف بارگاہِ نبوت و رسالت کی دریوزہ گری سے حاصل ہو سکتی ہے، یا پھر ان اہل اللہ کے فیضانِ نظر سے جو اپنی ذات کو انوارِ نبوت و رسالت سے مستنیر کر چکے ہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ انسانی حواس ہوں یا انسانی عقل، یہ سارے کے سارے ذرائع انسان کو حتمی علم مہیا نہیں کر سکتے۔ حتمی علم صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو آفتابِ نبوت کے انوار سے اپنے سینے کو منور کر رہا ہو اور یہ مقام صوفیاء کو نصیب ہوتا ہے[1] لہٰذا ثابت ہوا کہ علومِ نبوت و رسالت ہی علم کا وہ واحد ذریعہ ہیں جن

---

[1] المنقذ من الضلال، ص ۵۰ مطبوعہ لاہور

Marfat.com

کی فراہم کردہ معلومات میں غلطی اور خطا کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔

سائنسی علوم و اکتشافات کی حقیقت

یہاں قدرتی طور پر ذہن سائنس اور اس کے اکتشافات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔جہاں تک سائنس اور اس کی تحقیقات کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر سائنسی تحقیقات نظریہ (THEORY) کہلاتی ہیں۔ انہیں اس کائنات کے بنیادی حقائق (BASIC REALITIES) نہیں کہا جا سکتا۔ آج سائنسی تحقیق ایک بات ثابت کرتی ہے، کچھ عرصے کے بعد دوسری تحقیق اسے غلط ثابت کر دیتی ہے، آج سائنس کسی مسئلے میں ایک موقف اختیار کرتی ہے، کچھ عرصے کے بعد سائنس دان نیا نقطۂ نظر پیش کر دیتے ہیں۔ سائنسی تحقیق کا آغاز "HYPOTHESIS" سے ہوتا ہے اور اس کی تصدیق تجربے (EXPERIMENT) سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد یہ نظریے (THEORY) کے درجے پر پہنچتی ہے۔ اس کے باوجود ماہرین کے خیال میں سائنس کا ۱۰۰ فی صد علم غیر یقینی (INDEFINITE) اور ظنی (PROBABLE) ہے۔ یہ انسانی علوم (SOCI AL SCIENCES) ہوں یا قدرتی علوم (NATURAL SCIENCES) کیمسٹری (CHEMISTRY) اور طبیعیات (PHYSICS) ہو یا نباتیات (BOTANY) اور حیوانات (BIOLOGY)، ان سب علوم کی تحقیقات کا ۷۰ یا ۸۰ فی صد ابھی اقدام وخطا (TRIAL & ERROR) کے مرحلے میں ہے۔ سائنس اپنی سینکڑوں برس کی جدوجہد کے باوجود وہ پیمانہ دریافت نہیں کر سکی جس پر وہ اپنی معلومات اور دریافتوں کو پرکھ کر قطعی اور حتمی شکل میں پیش کر سکے۔ بہت کم ایسی سائنسی تحقیقات ہیں جو قانون (LAW) بنتی ہیں۔ علم جب تک حتمیت اور قطعیت کے درجے تک نہ پہنچے، اس وقت تک وہ باکمال نہیں بن سکتا۔ گویا سارے ذرائع

Marfat.com

اقدام وخطا پر مبنی معلومات رکھتے ہیں، لیکن نبوت و رسالت کے تمام علوم واکتشافات ہر قسم کی خطا اور غلطی سے منزّہ ہیں اور وہ شروع سے آخر تک حتمیت و قطعیت کی شان لیے ہوئے ہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؀ ۱

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور جو کچھ حضرت محمدؐ پر نازل ہوا، اسے مانا —— یہی ان کے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔

رسول اور نبی جو بات اپنی زبان سے کہتا ہے، وہ ابدی صداقتوں کی امین ہوتی ہے۔ سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہو سکتا ہے، کائنات میں شب و روز کا نظام بدل سکتا ہے، لیکن نبی کی زبان سے صادر ہونے والی حقیقت غلط نہیں ہو سکتی۔

نظامِ رسالت و نبوت انسان کو وہ علم عطا کرتا ہے جو ہر اعتبار سے حتمی اور قطعی ہوتا ہے۔ وہ اپنے آغاز ہی سے مرتبۂ کمال پر فائز ہوتا ہے۔ اس علم کو تجرباتی مراحل (EXPERIMENTAL VERIFICATION) سے گزرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ علم بنیادی اور دائمی حقیقتوں کی بات کرتا ہے۔ انسانی عقل جوں جوں فروغ پاتی جاتی ہے، علمِ نبوت و رسالت کی بیان کردہ حقیقتوں کے قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ بالآخر انسانی علم کی انتہا علومِ نبوت کی تصدیق کرنے لگتی ہے۔

سائنس اور مذہب کی مطابقت

سائنس آج اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ انسانی تخلیق ایک خلیے (Cell) سے ہوتی

---

۱ محمد (۴۷: ۲)

ہے۔ پھر وہ سیل (CELL) تقسیم ہو کر دو خلیوں میں تبدیل ہوتا ہے پھر اس کی مزید تقسیم ہوتی ہے اور دو سے چار اور چار سے سولہ سیل بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارا علم حیوانیات (ZOOLOGY) کئی سو سال کی تحقیق اور تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا لیکن علوم نبوت نے بصورت قرآن آج سے چودہ سو سال پہلے ہمیں اس سے آگاہ کر دیا تھا:

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا	اے لوگو! اس پروردگار سے ڈرو
رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ	جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور
نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا	اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور پھر ان سے
زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا	بہت سے مرد اور عورتیں زمین میں
كَثِیْرًا وَّنِسَآءً ؕ [1]	پھیلا دیے۔

گویا پہلی تقسیم نے ایک جان کو دو جانوں (CELLS) میں تبدیل کیا۔ پھر ان دو جانوں سے ہزاروں لاکھوں جانوں کا سلسلہ پھیلا دیا گیا۔ غور کیجیے علوم نبوت نے جو مبنی بر وحی ہوتے ہیں، جو حقیقت آج سے چودہ سو برس پہلے بیان کر دی تھی، سائنس سینکڑوں سال کے تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچ پائی ہے۔

اسی طرح ایک جگہ ارشاد باری ہے:

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ	اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی
كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ [2]	سے بنائی ہیں۔

یہ حقیقت بھی سائنس کی ہزار سالہ کوششوں اور تجربات کے نتیجے میں دریافت کی گئی کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا ہے۔ [3]

---

[1] النساء (۴: ۱)

[2] الانبیاء (۲۱: ۳۰)

(حاشیہ ۳ آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

اسی طرح عقلِ انسانی اور فلسفہ عرصۂ دراز سے سورج کو غیر متحرک قرار دیتے رہے جب کہ قرآن اسے ۱۴ سو سال پہلے سے متحرک قرار دے چکا ہے۔ اب سائنس نے بھی اپنی تحقیقات کے نتیجے میں بہ اعلان کر دیا ہے کہ سورج متحرک ہے اور باقاعدہ ایک نظام کے تحت گردش کر رہا ہے۔ یہ حقیقت کس خوبی اور کتنی وضاحت سے قرآنِ کریم نے بہت پہلے بیان کر دی تھی، ارشاد ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ؎۱	اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا ہے۔ یہ خدائے غالب و دانا کی مقرر کی ہوئی تقدیر ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ دعویٰ اس وقت ہوا جب ساری دنیا کے فلسفی اور عقلا سورج کو غیر متحرک (ساکن) مان رہے تھے، لیکن سینکڑوں برسوں کے بعد عقلِ انسانی کو وہی مسلک اختیار کرنا پڑا جو ایک نبیٔ اُمّی کی زبان سے صادر ہوا تھا۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ انسانی علوم جب تک بارگاہِ رسالت و نبوت میں سربسجود نہ ہوں،

(بقیہ از صفحۂ گزشتہ)

؎۳ سائنسی اصول ہے، (WATER WAS HELD TO BE THE FIRST PRINCIPAL OF ALL THINGS)

از صفحۂ ہذا

؎۱ یٰسین (۳۶:۳۸)

Marfat.com

اس وقت تک ان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جن حواس، حس عقل اور حس وجدان پر اعتماد کرتا ہے، ان کی پرواز محدود ہے، یہ سب ایک نکتے پر پہنچ کر رک جاتے ہیں۔ ان کے لیے اس سے آگے تاریکی ہی تاریکی ہے۔ لہذا انسانی علوم کی تکمیل کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ علوم رسالت کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک دیں۔

مسلمان سائنسدانوں کے لیے لمحہ فکریہ

چنانچہ مسلمان دانشوروں کی تحقیقات لادینی نظریات اور غیر اسلامی طبیعی و حیاتیاتی تصورات کی کرید پر نہیں بلکہ قرآنی تصورات کے رخ پر ہونی چاہییں مسلمان مفکرین اور سائنسدانوں کے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے کاش کچھ ایسے مسلمان سائنسدان پیدا ہو جائیں جو عالم طبیعی سے متعلق قرآنی حقائق کو بنیاد بنا کر اس پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھیں اور یوں عالم انسانیت کے لئے وہ بے بہا جواہر تحقیق سامنے لائیں۔ جنکی نشان دہی قرآن میں جا بجا کر دی گئی ہے۔

(۴) انسانی عمل کی تکمیل اور ضرورت رسالت

اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے کہ کس طرح حواس اور دیگر قوائے انسانی حقائق و معارف کائنات کے ادراک میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ حواس کی ناکامی کے اس اعتراف کے بعد اللہ رب العزت کی طرف سے انسان کو علوم و معارف نبوت کے فیضان سے مشرف کیا جاتا ہے اور علوم وحی کے ذریعے انسان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ اب نظام نبوت کی چوتھی دلیل پر گفتگو ہوگی کہ انسانی عمل کی تکمیل نظام نبوت و رسالت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

Marfat.com

علومِ نبوت عطا کیے جانے کی غرض وغایت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو علمِ وحی ونبوت آخر کس لیے دیا جاتا ہے؟ کیا محض اس لیے کہ وہ انسانی دنیا میں ایک نیا نظریہ اور فلسفہ بن کر رہ جائے؟ یا محض اس لیے کہ تفننِ طبع کے طور پر گاہے بگاہے اس کا مطالعہ کر لیا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ خداوندِ قدوس کو ہرگز ہرگز ایسا مطلوب نہیں، کیونکہ جب تک علم ترقی کر کے عمل کی صورت میں متشکل نہ ہو جائے، اس وقت تک علم کی افادیت غیر محسوس اور نامعلوم رہتی ہے۔ ؎

اسی بنا پر وحیِ الٰہی پر مبنی علم سے استفادے کے لیے نمونۂ عمل کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ علمِ حقیقی کا یہ خارجی وجود نظامِ رسالت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔

چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے کہ ہم نے جس رسول کو بھی اس دُنیا میں مبعوث کیا ہے اس کی بعثت کی غرض وغایت ہی یہ تھی کہ دنیائے انسانیت اس کی سیرت وکردار کی صورت میں احکامِ الٰہی کی پاسداری کا نظارہ کرے اور اس کی روشنی میں اپنے عمل کی راہ متعین کرے چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے۔

؎ مثال کے طور پر انسانوں کو اس بات کا علم ہے کہ "پانی پیاس بجھاتا ہے۔" لیکن کیا محض اس علم سے کسی پیاسے کی پیاس بجھ سکتی ہے؟ کیا محض اس کلیے سے آگاہی کسی تشنہ لب کے لیے تشفی کا ذریعہ بن سکتی ہے؟ ہمارے روزمرہ مشاہدے کا جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ جب تک اس علم کے مطابق عمل اختیار نہ کیا جائے، یعنی کہیں سے پانی لے کر نہ پی لیا جائے، اس وقت تک پیاس کا بجھنا ناممکنات میں سے ہے۔ یہی حال وحی اور نبوت کے علوم کا ہے۔

Marfat.com

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ [1]

اور ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا، اس لیے بھیجا ہے کہ خدا کے حکم سے اس کی پیروی کی جائے۔

یعنی اس کے طرزِ عمل اور کردار کو دیکھ کر دوسرے انسان بھی اپنے اعمال کی اصلاح کر سکیں۔ اسی بنا پر قرآن کی رُو سے محض "حصولِ علم" پر مدارِ نجات نہیں، بلکہ وہ اس مقصد کے لیے عمل اور جد و جہد کو لازمی قرار دیتا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ [2]

اور ان سے کہہ دو کہ عمل کیے جاؤ۔ خدا اور اس کا رسولؐ اور مومن سب تمہارے عملوں کو دیکھ لیں گے۔

اس آیت مبارکہ کے ذریعے یہ امر بھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جملہ مومنین کی نظر تمہارے علم کو عمل میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتی ہے اور یہی مدارِ نجات ہے [3]

---

[1] النساء (۴: ۶۴)

[2] التوبہ (۹: ۱۰۵)

[3] ایک اور مقام پر اسی مضمون کو بڑی عمدگی سے یوں بیان کیا گیا ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَ لَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا (النساء۔ ۴: ۱۲۳)

نجات نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے، نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر۔ جو شخص بُرے عمل کرے گا، اسے اسی طرح کا بدلہ دیا جائے گا اور وہ خدا کے سوا کسی کو حمایتی اور مددگار نہ پائے گا۔

Marfat.com

بعثتِ انبیاء کی غرض و غایت

قرآن کریم یہ نکتہ بیان کرتا ہے کہ اگر اس کائنات میں انبیاء و رسل کو مبعوث نہ کیا جاتا اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے بنی نوع انسان تک ہدایت کا پیغام پہنچا دیتا تو ان تعلیمات کے بنی نوع انسان تک پہنچنے کے باوجود منشاءِ ہدایت ہرگز پورا نہ ہوتا کیونکہ اللہ رب العزت کا منشا یہ تھا کہ ایسی ہستیاں دُنیا میں بھیجی جائیں جو اُس کی رضا اور ہدایت کا پیکر بن کر خود کو دُنیا کے سامنے پیش کریں اسی لئے آفرینشِ آدم کے موقع پر ارواحِ انسانی کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا گیا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ [1]

پس جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (اس کی پیروی کرنا) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی، انہیں نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے۔

گویا شروع ہی میں یہ امر واضح کر دیا گیا تھا کہ محض علم ہدایت کا پالینا کافی نہیں بلکہ اس پیغامِ ہدایت کو زندگی میں عملاً اپنانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس موقع پر خوف اور غم سے محفوظ رہنے کی جو بشارت دی گئی، وہ محض ہدایت کے علم کی بنا پر نہ تھی، بلکہ خدائی ہدایت کی پیروی کی بنا پر دی گئی تھی۔

یہاں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ ہے "فَمَنْ تَبِعَ"۔ تبع کا لفظ اتباع [2]

---

[1] البقرہ (۲ : ۳۸)

[2] تبعہ و اتبعہ کے معنی بقول امام راغب الاصفہانی صاحب مفردات القرآن، کسی

(باقی آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

سے بنا ہے، اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اتباع اور اطاعت کے مفہوم میں بنیادی فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اطاعت اور اتباع کے الفاظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

اطاعت، اتباع میں امتیاز

ارشاد خداوندی ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ [1]	اے اہل ایمان! خدا اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب امر ہیں، ان کی بھی۔

نیز فرمایا:

وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ [2]	اگر تم اہل ایمان ہو تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

کے نقش قدم پر چلنے کے ہیں۔ یہ کبھی اطاعت و فرمانبرداری سے ہوتا ہے جیسے کہ محولہ بالا آیت مبارکہ میں ہے اور کبھی کسی کے پیچھے چلنا اور اسے پالینا ہے۔ جیسے ارشاد ہے:

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ (الشعراء۔ ۲۶: ۶۰)	تو انہوں نے سورج نکلتے ان کا تعاقب کیا۔

(صفحہ ہذا)

[1] النساء (۴: ۵۹)

[2] الانفال (۸: ۱)

Marfat.com

اسی طرح بے شمار مواقع پر لفظِ اطاعت اللہ اور اس کے رسول ؐ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جب کہ اتباع کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بلکہ زیادہ تر ذاتِ رسالت مآب ؐ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ [1]

اے پیغمبر! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔

اس طرح اتباع کا لفظ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے مخصوص کیا گیا ہے، جب کہ لفظ اطاعت، اللہ تعالیٰ اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

لفظِ "اتباع" کے مفہوم میں مغالطہ

عوام کے ذہنوں میں یہ اشکال اُبھرتا ہے کہ عموماً اطاعت اور اتباع کا ترجمہ ایک ہی کیا جاتا ہے —— پیروی کرنا، سوال یہ ہے کہ اگر ان دونوں کے مفہوم میں فرق ہے تو مترجمین اس فرق کو کیوں ملحوظ نہیں رکھتے؟

اصل بات یہ ہے کہ اُردو زبان کا دائرہ عربی کے مقابلے میں اتنا وسیع نہیں ہے جو اتنے باریک اور لطیف فرق کو ایک لفظ سے متمیز کر سکے۔ ورنہ دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ اطاعت حکم کی بھی ہوتی ہے اور عمل کی بھی۔ جب کہ صحیح اتباع

---

[1] آل عمران (۳: ۳۱)

Marfat.com

اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکم نمونے کے سانچے میں ڈھل کر سامنے نہ آجائے [1]

صرف اتباعِ رسول ﷺ کیوں؟

جہاں تک اللہ رب العزت کا تعلق ہے تو بلاشبہ اس کی اطاعت سب انسانوں کا اولین فرض ہے مگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی ذواتِ مقدسہ میں فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ احکام صادر فرماتا ہے۔ مثلاً یہ حکم دیتا ہے کہ،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ [2] — اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔

لیکن وہ ذات خود اس امر سے بالاتر ہے کہ انسانی شکل و صورت اختیار

---

[1] اتّباع کا مادہ تبع ہے جس سے لفظ تابع وجود میں آیا ہے، جس کے معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں خواہ اچھائی میں ہو یا برائی میں۔ خیر کا مرکز سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے۔ آپ کی پیروی خیر کی پیروی ہے جبکہ شر کا منبع شیطان ہے جس کی پیروی شر کی پیروی اور ضدِ ایمان ہے۔ ارشادِ باری ہے۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (سبا، ۳۴: ۲۰) — اور شیطان نے ان کے بارے میں اپنا خیال سچا کر دکھایا کہ مومنوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے سوا وہ سب اس کے پیچھے چل پڑے۔

[2] البقرہ (۲: ۴۳)

Marfat.com

کر کے نماز ادا کرے اور لوگوں کو دکھائے کہ نمازیوں قائم کی جاتی ہے۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ یہ تو ارشاد فرماتا ہے کہ،

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ ۱ — پس تمہیں جو عورتیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو۔

لیکن اللہ رب العزت خود نکاح کر کے ازدواجی بسر کرنے سے مبترا اور منزہ ہے۔ جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات سے محض حکم صادر ہوتا ہے۔ اس کی ذات حکم کی عملی مثال یا نمونہ پیش کرنے سے ماوراء ہے۔ اس لیے اس کی اطاعت تو ہو سکتی ہے لیکن اتباع نہیں۔ جب تک حکم کسی پیکر مثال میں ڈھل کر آنکھوں کے سامنے نہ آجائے اور علم عمل کے ڈھانچے میں تبدیل ہو کر انسانوں کو دکھائی نہ دینے لگے، اس وقت تک اس کی اتباع ممکن نہیں۔ اس لیے اللہ ربّ العزت نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ احکام تو خود دیے مگر ان کی عملی مثال پیش کرنے کے لیے انبیاء و رُسل کو مبعوث فرمایا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی واضح فرما دیا کہ جو کوئی ان کی اتباع کرے گا، وہ حقیقت میں خدا ہی کی اطاعت ہوگی۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۲ — جو کوئی رسول کی فرمانبرداری کرے گا تو بیشک اس نے خدا کی فرمانبرداری کی۔ اور اے پیغمبر! جو نافرمانی کرے، ہم نے آپ کو ان کا نگران بنا کر نہیں بھیجا۔

یہ واضح کر دیا گیا کہ اگر تمہیں میری خوشنودی مطلوب ہے تو میرے نبیؐ کی

---

۱ النساء (۴: ۳)

۲ النساء (۴: ۸۰)

Marfat.com

اتباع کرو، میرے نبیؐ کی غلامی کا طوق اپنی گردنوں میں ڈال لو ــــــ تمہیں میری خوشنودی حاصل ہوجائے گی۔ اسی بنا پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَا یؤمن احدکم حتٰی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہٖ [1]

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن ہو ہی نہیں سکتا، جب تک اس کی خواہشات اُن تعلیمات کے تابع نہ ہوجائیں جو میں لے کر آیا ہوں۔

گویا جب تک انسان اپنی خواہشات، اپنی آرزوؤں اور اُمنگوں کو نبی معظمؐ کے قدموں پر قربان نہ کرے، اس وقت تک اس کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ قرآنِ مجید میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہی میں خدا تعالیٰ کی اطاعت مضمر ہے۔ اور یہ بھی کہ آپ کو لوگوں پر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا۔ یہی وہ بلند و بالا مقام ہے جہاں سے آپ نے علم کو عمل کے سانچے میں ڈھال کر اس کا نمونہ اس طرح بنی نوعِ انسان کے سامنے پیش کیا کہ کسی کو انکار کی مجال ہی نہ رہی۔[2] اگر کوئی شخص آپ کی غلامی سے گریزاں ہو تو دنیوی نقصان

---

[1] البخاری، کتاب الایمان

[2] یہاں اس روایت کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جو رازدارِ نبوت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضورؐ کے بارے میں اصحابِ سیرؒ نے نقل کی ہے کہ اُم المومنین حضرت صدیقہؓ سے سوال کیا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق کیا تھا۔ فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے:

کان خلقہ القرآن — آپ کا اخلاق سراسر قرآن تھا

(الطبقات الکبیر وغیرہ)

(باقی آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

اور خسارے کے علاوہ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کو اس کا مقام قرار دیا گیا ہے۔

بہر حال عرض یہ کیا جا رہا تھا کہ اطاعت تو محض حکم کی بھی ہو سکتی ہے مگر اتباع کے لیے نمونہ عمل کا ہونا ضروری ہے

حکم اور اس کا مفہوم

ہماری اس گفتگو کے دوران میں لفظ "حکم" کا بھی ذکر آیا ہے یہ لفظ ہمارے آج کے موضوع گفتگو میں تو شامل نہیں لیکن یہاں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اس کے معنی بھی اجمالاً بیان کر دیے جائیں

حکم کے لغوی معنی بقول امام راغب اصفہانی "المنع للاصلاح" کسی

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

گویا آپ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ جو قرآن مصحف کی صورت میں ہے وہ علمی قرآن ہے، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی عملی قرآن ہے۔ قرآن میں جو حکم ہوگا، اس کی عملی تفسیر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں پائی جائے گی۔ اسی بنا پر حدیث اور سنت کو قرآن کی شرح قرار دیا گیا ہے۔ خود آپ نے مرض الوفات سے قبل ارشاد فرمایا،

ترکت فیکم امرین کتاب اللہ وسنۃ رسولہ ان تمسکتم بھما لن تضلوا من بعدی

میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔ اگر تم ان کو پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔

(بخاری شریف وغیرہ)

Marfat.com

چیز کی اصلاح کے لیے اسے روک دینے کے ہیں [1]۔ بنابریں حکم کا یہ مفہوم ہوا کہ انسان کو اس کی اصلاح کے لیے کسی بُرے کام سے روک دیا جائے۔ اس طرح لفظ حکم کے مفہوم میں شریعتِ اسلامیہ کا پورا فلسفہ اور اس کی پوری فکر سمٹ آتی ہے۔ گویا ہر بُرے کام سے بغرضِ اصلاح روک دینا حکم کی تعریف میں شامل ہے۔

پس یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ شریعت میں وہی چیز منع اور حرام ہے جس سے حکماً روکا گیا اور منع کیا گیا ہو۔ جس چیز سے روکا نہ گیا ہو، اسے ممنوع تصور نہیں کیا جا سکتا۔ شریعتِ طیبہ کا یہی وہ آسان پہلو ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ شریعتِ اسلامیہ فطرتِ انسانیہ کے عین مطابق ہے۔ اسی بنا پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ [2] — میں آسان ترین دین لے کر مبعوث کیا گیا ہوں۔

اسی بنیاد پر اس شریعت میں ہر وہ چیز جائز ہے جس سے شریعت نے منع نہیں کیا اور فقط وہی امور ناجائز اور حرام ہیں، جن سے خدا اور رسولؐ نے منع کیا ہے۔ اس لیے شریعت تمام جائز اُمور کی فہرست مرتب نہیں کرتی کیونکہ ایسے اُمور بے شمار ہیں البتہ ناجائز امور کو بیان کر دیا گیا ہے لہٰذا جس چیز کے بارے میں

---

[1] اسی بنا پر لگام کو حکمۃ الدابۃ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اسے قابو میں رکھتی ہے۔ اس سے لفظ 'الحکم' وجود میں آیا ہے جس کے معنی کسی چیز سے متعلق فیصلہ کرنے کے ہیں، خواہ اس فیصلے کو لازم ٹھہرایا جائے یا لازم نہ ٹھہرایا جائے۔

(مفردات، ص ۲۳۷)

[2] البخاری

Marfat.com

شریعت خاموشی اختیار کر لیتی ہے، وہ چیز مباح اور جائز تصور کی جاتی ہے [1]۔
اس بنا پر اصولِ فقہ میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ،

الاصل فی الاشیاء الاباحۃ — اشیاء میں اصل چیز اباحت یعنی اجازت ہے۔

بہرحال حکم کا لغوی مفہوم تو بغرضِ اصلاح کسی کام سے رُک جانا ہے، مگر اس کے عرفی اور اصطلاحی معنی میں امر و نہی دونوں شامل ہیں۔

ایک لطیف علمی نکتہ

اب جس امر کی وضاحت مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ شریعت جس کام سے لوگوں کو روکنا چاہتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کام کا باقاعدہ ارتکاب ہو اور پھر اس سے روکا جائے مثلاً اگر شراب سے منع کرنا مقصود ہو تو یہ لازمی نہیں کہ کوئی خود شراب پی کر دکھائے اور پھر اس سے منع کرے۔ جھوٹ سے منع کرنا مطلوب ہو تو ضروری نہیں کہ پہلے انسان جھوٹ بول کر دکھائے پھر منع کرے وجہ یہ ہے کہ جو چیز بُری ہے اس کے متعلق رک جانے کا حکم دے دینا ہی کافی ہو سکتا ہے [1] البتہ نمونۂ عمل کی ضرورت زندگی کے ان معاملات میں پیش آتی ہے جہاں کسی

---

[1] بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز سے متعلق صراحت کے ساتھ منع کا حکم نہیں ہے مگر اس جیسی کسی دوسری چیز سے منع کیا گیا ہے۔ اس صورت میں اس حکم کی علت کو دلیل ٹھہرا کر، دوسری چیز کو بھی حرام تصور کیا جاتا ہے، مثلاً قرآن میں شراب کے متعلق حکمِ ممانعت آیا ہے مگر چرس، افیون وغیرہ کے متعلق کچھ مذکور نہیں، تو یہاں حدیثِ نبوی کے مطابق علتِ حکم یعنی نشے کو سبب قرار دے کر ان سب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

Marfat.com

کو کوئی کام کرنے کا حکم دیا جا رہا ہو مثلاً حکم ہے کہ نماز ادا کرو جب انسانوں کو یہ حکم دیا گیا تو اس وقت انہیں کیا خبر تھی کہ نماز ادا کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ انہوں نے تو کعبہ کے گرد ناچنے اور سیٹیاں بجانے ہی کو نماز تصور کر رکھا تھا۔ اس کے برعکس شراب لوگ پیتے تھے، اور جب اس سے اجتناب کا حکم آیا تو لوگوں نے اسے پینا ترک کر دیا۔ اسی طرح شرک کیا جاتا تھا، حکم آیا کہ خدا کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو، تو لوگوں نے غیر اللہ کی عبادت ترک کر دی۔ گویا محض منع اور نہی کے معاملے میں تو حکم ہی سے عمل ہو سکتا تھا مگر امر کے معاملے میں حکم اس وقت تک اطاعت کو کامل نہیں کر سکتا تھا جب تک حکم،

ﮦ یہاں یہ امر بھی پیشِ نظر رہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم کے ایجابی اور منفی دونوں پہلوؤں میں دنیا کے سامنے ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ آپؐ نے نہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر کے دکھایا، بلکہ ان اُمور سے اجتناب کی مثال بھی قائم کی جن سے شریعت نے منع کیا تھا۔ اور یوں آپ نے دشمنوں کا وہ اعتراض باطل کر دیا (جو وہ اس زمانے میں شریعت کے منفی اور مثبت احکام پر کرتے تھے) کہ یہ احکام توناقابلِ عمل ہیں۔ مثلاً یہ کہ شراب کے بغیر کوئی کیونکر زندہ رہ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آپ نے سب سے پہلے اُمورِ ممنوعہ سے خود اجتناب کیا اور پھر اسی اجتناب کی دوسروں کو دعوت دی۔ صاف ظاہر ہے کہ تبلیغ اسی صورت میں مؤثر ہو سکتی تھی کہ دعوت دینے والا پہلے ہر حکم پر خود عمل کرے۔

Marfat.com

فی الواقع عمل کے محسوس قالب میں ڈھل کر سامنے نہ آجائے۔ نماز ہی کے حکم کو لیجئے۔ یہ حکم تو قرآن میں جا بجا ملے گا کہ نماز قائم کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ لیکن قرآن مجید کو "الحمد" سے "والناس" تک پورا پڑھ جائیے، مقررہ افعال اور ارکان پر مشتمل مخصوص طرز کی نماز کا بیان قرآن کریم کی چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات میں سے کسی ایک آیت میں بھی نہیں ملے گا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اوقاتِ صلوٰۃ کے متعلق یہ حکم تو ملتا ہے،

إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا[1] — بے شک مومنوں پر اوقاتِ مقررہ پر نماز ادا کرنا فرض ہے۔

مگر یہ کہ فلاں نماز کا وقت کس گھڑی سے شروع ہو کر کس گھڑی پر اختتام پذیر ہوتا ہے، اس کا اشارہ کسی مقام پر بھی نہیں مل سکتا۔

سب سے اہم مسئلہ نماز کی رکعات کی تعداد کا ہے۔ قرآن کریم میں کسی جگہ نمازوں کی رکعات کی تعیین نہیں ملتی۔ قرآنِ حکیم میں جب نماز کا حکم نازل ہوا تو صحابہ کرامؓ پریشان ہوئے اور پوچھا؛

یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! ہم نماز کیسے پڑھیں؟

صحابہ کرامؓ کا یہ سوال اپنی جگہ درست تھا کیونکہ لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعا، گوشت بھوننے، پیٹھ پر مارنے، آگ جلانے اور مطلق پیٹھ وغیرہ کے تھے۔ اس کے علاوہ لغت والوں نے صلوٰۃ کے چھپن کے قریب لغوی معانی بیان کیے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ قرآن مجید ان میں سے صلوٰۃ کا کون سا مفہوم مراد لیتا ہے۔ جب تک عملاً اس خاص طریقے سے نماز پڑھ کر نہ دکھائی جائے جو مطلوبِ باری تعالیٰ تھا، اس وقت تک

---

[1] النساء (۴ : ۱۰۳)

Marfat.com

محض لغت اور زبان کے سہارے کوئی شخص نہیں جان سکتا تھا کہ صلوٰۃ کا لفظ کس معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ لغت کی کسی کتاب میں اصلاً لفظ "صلوٰۃ" کا وہ مفہوم نہیں ملتا جو شارع علیہ السلام نے اُمت کو سکھایا۔

صلوٰۃ بمعنیٰ دعا

صلوٰۃ کا ایک معنیٰ دعا بھی آتا ہے اور اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ ارشادِ باری ہے:

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ [1] — اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو کہ آپ کی دعا ان کے لیے موجبِ تسکین ہے۔

اس تمام بحث سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اگر وحیٔ ربانی محض علم تک محدود رہتی اور انسانی شکل میں عمل کا روپ نہ دھارتی تو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم پر بھی عمل کرنا ممکن نہ تھا جیسا کہ صلوٰۃ (نماز) جیسے دین کے اہم اور بنیادی رکن کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ بغیر نمونۂ عمل کے اس کی ادائیگی ممکن نہ تھی۔ پس صلوٰۃ کی ماہیت اور کیفیت کے بارے میں صحابۂ کرامؓ جب مضطرب ہوئے تو سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

صلوا کما رأیتمونی اصلی — جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو، ویسے ہی نماز پڑھو۔

چنانچہ حضورؐ نے عملی طور پر صحابۂ کرامؓ کو نماز کے تمام ارکان ادا کر کے سمجھایا اور اس میں پڑھی جانے والی ایک ایک دعا اور ایک ایک ادا کی تعلیم دی۔ تب کہیں جا کر اُمت کو صحیح طور پر نماز کا مفہوم سمجھ میں آسکا۔

---

[1] التوبہ (۹: ۱۰۳)

Marfat.com

زمانۂ جاہلیت کی نماز

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپ کے زمانۂ اقدس سے پہلے جو نماز ادا کی جاتی تھی، قرآن کریم اس کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کرتا ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ؁

اور اُن لوگوں کی نماز خانۂ کعبہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سامنے علمِ صلوٰۃ کو عملِ صلوٰۃ کی صورت میں پیش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اگر علم کو مثالی نمونے میں بدلنے والا کوئی نہ ہو تو اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنا بھلا کس طرح ممکن ہے۔

بہرحال رسالت کی ضرورت انسانیت کو اس بنا پر پیش آتی ہے کہ رسول منشائے خداوندی کو عمل کی صورت میں بیان کرکے لوگوں کے لیے قلبی و ذہنی تشفی کا سامان کرے۔

حج کا حکم اور طریقِ رسالت

قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ

اور لوگوں پر خدا کا حق (فرض) ہے کہ جو اس کے گھر تک جانے کا مقدور رکھے،

؁ الانفال (۸، ۳۵) جس طرح آج کے دور میں غیر مسلم اقوام کی نماز صرف موسیقی کی مسحور کن تانوں میں گم ہو چکی ہے اور گرجا گھروں میں ذکرِ الٰہی کے بجائے موسیقی کی تانیں اُبھرتی ہیں۔ (اعاذنا اللہ منہ)

Marfat.com

سَبِیْلاً ؂ وہ اس کا حج کرے۔

خداوند تعالیٰ کا یہ حکم تو سب کے سامنے تھا کہ حج کرو مگر کسی کو کیا خبر تھی کہ حج کے جملہ مناسک کیا ہیں؟ حج کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کو ان لفظوں میں مناسکِ حج کی تعلیم دی :

خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ مجھ سے حج کے مناسک سیکھو

مقصد یہ کہ میرے انداز و اطوار اور میری سنت کو دیکھ کر حج ادا کرنے کے طریقے کی تعلیم حاصل کرو۔ دیکھو کہ میں کعبۃ اللہ کا طواف کیسے کرتا ہوں۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کیسے کرتا ہوں، میدانِ عرفات میں کہاں کھڑا ہوتا ہوں اور حج کا یہ مقدس و متبرک دن کس حالت اور کس عالم میں بسر کرتا ہوں، مزدلفہ اور منیٰ میں کیسے آتا ہوں، کنکریاں کیسے مارتا ہوں اور پھر قربانی ادا کرکے اِحرامِ حج سے حلق کیسے اختیار کرتا ہوں۔

یہ تمام باتیں کسی لغت کی کتاب کے مطالعے سے دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں، یہ اُمور زمانۂ جاہلیت کی تاریخ اور احوال سے استنباط نہیں کیے جا سکتے تھے۔ بلکہ ان کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ کوئی اللہ کا نبی اور رسول آتا اور ان تمام مسائل میں بنی نوعِ انسان کی اس طریقے کی طرف رہنمائی کرتا، جو خود ذاتِ پروردگار کو مقصود اور مطلوب تھا۔ الغرض علم کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے نظامِ رسالت کی ضرورت تھی جو پوری کردی گئی۔

نماز کی رکعتیں بھول جانے کا واقعہ

حدیث شریف میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ

؂ آل عمران (۳ : ۹۷)

Marfat.com

وآلہ وسلم ظہر یا عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ نے دو رکعتوں کے بعد سلام پھیر دیا۔ صحابہؓ کو بڑا تعجب ہوا۔ جماعت میں گو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ بھی موجود تھے، مگر دربارِ نبوت میں لب کھولنے کی کسی کو جرأت نہ تھی۔ اس پر ایک صحابی ذوالیدینؓ (لمبے لمبے ہاتھوں والے) آگے بڑھے اور پوچھا:

یا رسول اللہ، اقصرت الصلوۃ ام نسیت [1]

کیا نماز چھوٹی کر دی گئی ہے یا پھر آپ بھول گئے ہیں۔

اس پر آپؐ نے دوسرے صحابہؓ کی طرف دیکھا۔ سب نے ذوالیدین کی تائید کی۔ چنانچہ آپؐ نے کھڑے ہو کر مزید دو رکعت نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد سلام پھیر کر سجدۂ سہو ادا کیا۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ اگر لوگوں سے کسی وقت بھول ہو جائے تو اس کی تلافی کی وہ صورت بھی ان کے سامنے موجود ہو جو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اختیار فرمائی۔

نماز میں بھول جانے کا مسئلہ

یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کوئی شخص چار رکعتوں پر مشتمل نماز میں بھول جائے اور دو رکعت پر سلام پھیر دے۔ اگر اس نے کسی سے گفتگو نہ کی ہو اور قبلہ سے کلیتہً رُخ نہ پھیرا ہو تو وہ شخص اپنی بقیہ نماز مکمل کر کے بعد ازاں سجدہ سہو کر لے تو نماز ادا ہو جاتی ہے اور اگر اس نے سلام پھیر کر کسی سے بات چیت کر لی یا قبلے کی طرف سے رُخ پھیر لیا تو اب اسے چاروں رکعتیں مکمل کرنا ہوں گی۔ یہ مسئلہ تو عوام کے لیے ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کلیے

---

[1] مسلم شریف ۱: ۲۰۳، حدیث ۵۷۳

Marfat.com

سے مستثنٰی ہیں۔ چنانچہ آپ نے بات چیت کرنے کے باوجود اسی نماز کو مکمل فرمایا اور بعد ازاں سجدہ سہو کر لیا جس کی وجہ یہ تھی کہ نماز نام ہے اللہ اور اس کے رسولؐ سے گفتگو کرنے کا۔ قیام، رکوع اور سجود میں نمازی خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہوتا ہے اور تشہد میں ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جانب متوجہ ہو کر عرض کرتا ہے:

السلام علیک ایہا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

اس لیے اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یا رسولِ پاکؐ کسی اور سے ہمکلام بھی ہو جاتے تو اس سے نماز کی حیثیت میں فرق نہیں پڑتا تھا بلکہ وہ نماز بدستور برقرار رہتی تھی۔

نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بلانے کا مسئلہ

اسی بنا پر یہ حکم تھا کہ اگر صحابہؓ نماز پڑھ رہے ہوتے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم انہیں آواز دیتے مگر صحابی نماز چھوڑ کر حضور کی بات نہ سنتے تو حضورؐ فرماتے: تم نے اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں سنا۔ وہ حکم یہ تھا کہ اگر حضور کسی کو بھی آواز دیں تو اسی وقت نماز چھوڑ کر حضورؐ کی بات سنی جائے۔ جس کام کا حضور حکم دیں وہ بتمام و کمال کر کے واپس آ کر اسی نماز کو مکمل کر لیا جائے، کیونکہ حضور کی ذات یا آپ کے حکم کی طرف راغب اور متوجہ رہنا نماز کا نقص نہ تھا بلکہ خود کمالِ نماز تھا۔ بنا بریں ایک صحابی نمازِ باجماعت میں بھی وفورِ محبت سے ہمیشہ حضور کا چہرۂ انور تکتے رہتے تھے اور کسی نے کبھی انہیں منع نہیں کیا۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ جب تک کوئی نبی مبعوث ہو کر انسانیت کی عملی رہنمائی نہ کرے، اس وقت تک وحیِ الٰہی کے منشا کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے ارشاد فرمایا:

Marfat.com

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ [1] — تمہارے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی میں اسوۂ حسنہ ہے۔

یہی حال روزہ، زکوٰۃ وصدقات، جہاد اور دیگر عبادات اور دینی معتقدات کا ہے۔ مگر اسلام تو دین اور دنیا دونوں کا جامع ہے۔ اسی وجہ سے آپ نے دینی مسائل بھی عمل سے واضح کیے اور دنیوی معاملات بھی خوش اسلوبی سے نباہ کر دکھائے۔

سنتِ مصطفویؐ کی صورت میں منشأ ایزدی کی تکمیل کی عملی مثالیں

٭ عدل بین الازواج کا حکم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

قرآنی حکم تھا کہ اپنی ازواج میں عدل اور برابری کرو۔ اب سوال یہ تھا کہ اس امرِ عدل کا صحیح معیار اور نمونہ کیا ہوگا جو اس حکمِ عدل کو عمل کے سانچے میں ڈھالے اور مثال قائم کر کے دکھا دے۔ چنانچہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اس سلسلے کی بہترین مثال بنے اور اپنی ازواجِ مطہرات میں اس حد تک عدل کیا کہ خود ازواجِ مطہرات نے برملا کہا:

ان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا اراد سفرا اقرع بین نسائہ [2] — نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج کو ساتھ لے جانے کے لیے قرعہ ڈالتے۔

اور جس کا قرعہ نکلتا، اسی کو ساتھ لے جاتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجی زندگی کا ایک ایک لمحہ ازواج میں اس طرح برابری کی بنیاد پر تقسیم کر رکھا تھا کہ کسی زوجۂ مطہرہ کو بھی اس میں شکایت کا کوئی موقع نہ تھا۔

---

[1] الاحزاب (۳۳ : ۲۱)

[2] البخاری، کتاب المغازی، قصۂ افک

Marfat.com

حدیث میں آتا ہے،

کان رسول اللہ — رسول اللہ اپنی ازواج میں وقت کو

یقسم بین ازواجہ فیعدل[۵] — عدل و انصاف سے تقسیم فرماتے تھے۔

گویا عدل بین الازواج کا حکم اسی وقت انسانیت کے لیے قابلِ اتباع ہو سکتا ہے جب کوئی پیکرِ عدل انسانیت کے سامنے عملی مثال کے طور پر موجود ہو۔

★ مخلوق پر رحم کرنے کا حکم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

اسی طرح خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ مخلوقِ خدا پر رحم کرو۔ جب تک رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عملاً وصفِ رحمت کو منتہائے کمال پر پہنچا کر نہیں دکھا دیا، اس وقت تک کیسے پتا چل سکتا تھا کہ رحم کی حقیقت اور اس کا کمال کیا ہے۔ نیز یہ کہ رحم کیسے، کس پر اور کس حد تک کیا جائے۔ حقیقتِ رحمت اور کمالِ رحمت کی مثال ذاتِ مصطفوی نے یوں انسانیت کے سامنے پیش کی کہ جب طائف کے بازاروں میں حضورؐ کے جسمِ اقدس کو پتھروں سے زخمی اور نڈھال کر دیا گیا، آپؐ کا لباس اطہر خون آلود ہو گیا اور آپ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر نیچے آرام فرما ہو گئے تو حکمِ ایزدی سے پہاڑوں کا فرشتہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا۔ یا رسول اللہ! اگر آپ چاہیں تو دو پہاڑوں کو نیچے گرا کر طائف کی بستی کو تباہ و برباد کر دیا جائے مگر آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا

انما بعثت رحمۃ — میں صرف رحمت بن کر آیا ہوں، زحمت

ولم ابعث لعاناً — نہیں۔

---

[۵] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی القسم بین النساء، ج ۲ : ۳۲۷، ابنِ ماجہ ایضاً

Marfat.com

آپ کے طرزِ عمل کے اس زاویے نے رحمت کے تصور کو ابدالآباد تک کیلئے نقطۂ کمال تک پہنچا دیا تاکہ رحم کرنے والے اس عظمت سے سبق سیکھتے رہیں۔

٭ سچ بولنے کا حکم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

خداوندِ تبارک وتعالیٰ نے حکم دیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ [1]

اے اہلِ ایمان خدا سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کے ساتھ رہو۔

سچائی کا وہ عظیم تصور جو منشائے ایزدی کی تکمیل کرتا، اس وقت تک انسانیت کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا جب تک سچائی کا پیکرِ اتم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شکل میں انسانیت کے سامنے نہ ہوتا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس حد تک سچ بولتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ نے کوہِ صفا پر کفار ومشرکینِ مکہ سے پوچھا کہ اگر میں تمہیں اس پہاڑی کے پیچھے سے کسی حملہ آور لشکر کی خبر دوں تو کیا تم یقین کر لوگے۔ سب نے بیک آواز کہا ہاں! اس لیے کہ:

مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كَذِبًا [2]

ہم نے آپ کی ذات میں جھوٹ نہیں دیکھا۔

٭ ایفائے عہد کا حکم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

اسی طرح خدا تعالیٰ نے حکم دیا:

---

[1] التوبہ (۹: ۱۱۹) [2] البخاری

Marfat.com

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ [1] — اے اہلِ ایمان اپنے وعدے پورے کرو۔

وعدے کس انداز سے پورے کیے جائیں کہ ایفائے عہد کے قرآنی حکم کی تعمیل ہو سکے جب تک کوئی اس معیار پر پورا اتر کر نہ دکھائے ایسا ممکن نہیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی الحسار کہتے ہیں۔

کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا اور آپ سے کہا آپ ذرا یہیں ٹھہریئے میں ابھی واپس آتا ہوں۔ خدا کی قدرت کہ میں گھر جا کر بالکل بھول گیا۔ تین دنوں کے بعد اتفاقاً اُدھر سے گزرا تو دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہیں قیام فرما ہیں اور انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھا تو فرمایا:

لقد شققت علیّ انا ههنا منذ ثلاث انتظرك [2] — اے عبداللہ تو نے مجھے بہت مشقت میں ڈالا ہے۔ میں تین دن سے یہیں کھڑا تیرا انتظار کر رہا ہوں۔

چنانچہ ایفاءِ عہد کا حکم محض حکم نہ رہا بلکہ آپ کے عمل سے باقاعدہ مثالی نمونۂ عمل کی صورت میں ڈھل گیا۔

★ سادہ زندگی کا حکم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

اسلام نے سادگی اپنانے کی تعلیم دی ہے۔ یہاں تک کہ اختیاری فقر کو بھی

---

[1] المائدہ (۵ : ۱)

[2] سنن ابی داؤد، ج ۴ کتاب الادب، باب فی الوعد ص ۴۱۰

Marfat.com

حضورؐ نے باعثِ فخر قرار دیا ہے لیکن اس حکم کی بجا آوری کا نقطۂ کمال کیا ہے۔ اس کا علم انسانیت کو تاجدارِ کائنات کی حیاتِ طیبہ کے اس گوشے پر نظر ڈالنے سے ہوتا ہے جس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں۔

کان یاتی علینا الشہر	ہم پر ایسے مہینے بھی گزرتے کہ ہم
ما نوقد فیہ نارًا انما ہو	ان میں آگ تک جلا کر نہ دیکھتے۔ صرف
التمر والماء ؎	کھجوروں اور پانی پر گزر ہوتی۔

★ محنت و مساوات کا حکم اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل

شریعت نے محنت و مشقت کو سراہا ہے اور تمام انسانوں کو خواہ کوئی بزعم خویش بڑا ہو یا چھوٹا، انسانی حیثیت میں برابر تسلیم کیا ہے۔ محنت کی عظمت اور انسانی مساوات کا یہ سبق تو سب کو معلوم تھا لیکن اس کا معیاری نمونہ کہاں سے میسر آئے؟ اس مقصد کی تکمیل خود ذاتِ نبوی نے یوں کی کہ حضورؐ نے غزوۂ خندق میں اپنے مبارک ہاتھوں سے خندق کھودی، پتھر اٹھائے اور اپنے کندھوں پر مٹی اٹھاتے رہے۔ حضرت براء بن عازبؓ کہتے ہیں:

کان رسول اللہ ینقل	رسول اللہ خندق کے دن مٹی اٹھا کر
التراب یوم الخندق	لے جاتے رہے حتیٰ کہ آپ کا بطن مبارک
حتی اغبر بطنہ ؎	غبار آلود ہوگیا۔

صحابہؓ نے اسی روز بھوک کی شکایت کرتے ہوئے اپنے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹا کر

؎ بخاری، ج ۳ ص ۴، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی

؎ بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق، ۵ : ۱۴۵

Marfat.com

ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا تو حضورؐ نے اپنے بطن مبارک پر سے کپڑا ہٹا دیا جہاں دو پتھر بندھے ہوتے تھے۔

حدیث کے الفاظ ہیں:

" فرفع عن بطنہ عن حجرین "

اسی طرح جب مدینہ منورہ میں مسجد تعمیر ہوئی تو حضور بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح پتھر، مٹی، لکڑی اور اینٹ اُٹھا کر لاتے رہے۔ لہ

صحابہ جنگِ بدر کیلئے نکلے تو حضورؐ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اونٹ پر اپنی باری پر سوار ہوتے اور اپنی باری پر پیدل چلتے۔ حضور (صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھیوں حضرت علیؓ اور حضرت مرثدؓ نے عرض کیا:

یا رسول اللہ نحن	یا رسول اللہ! آپ کے بجائے ہم
نمشی عنک	پیدل چلتے ہیں۔

تو آپ نے فرمایا:

ما انتما باقوی علی	تم مجھ سے چلنے میں زیادہ طاقتور نہیں
المشی منی وما انا باغنی	ہو اور نہ میں اُخروی اجر لینے میں تم سے
عن الاجر منکما	زیادہ بے نیاز ہوں۔

اب تک یہ امر اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا ہوگا کہ نظامِ رسالت ونبوت کی غرض وغایت جہاں انسانوں کی فکری وعلمی رہنمائی کرنا ہے، وہاں عملی اور واقعاتی رہنمائی بھی اسی سے ممکن ہے۔ جس طرح حواس اور قوائے انسانی ادراک میں ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے، اسی طرح انسانی جسم اور اس کے اعضا احکامِ الٰہی کی کامل تکمیل

لہ بخاری، باب ہجرۃ النبی الی المدینہ، ۵: ۸۰،

Marfat.com

سے قاصر رہتے ہیں تا آنکہ کوئی پیغمبر عملی راہنمائی کے ذریعے نمونۂ عمل فراہم نہ کردے۔ انبیاء و رسل کو بنی نوعِ انسان میں اسی لیے معبوث کیا گیا کہ عبادات و معاملات اور مناکحات و معاہدات الغرض زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق باری تعالیٰ کے احکامات کی عملی مثال ان نفوسِ قدسیہ کے ذریعے بنی نوعِ انسان تک پہنچ جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر انسانی ذہن ازخود نہ احکام کو عملی شکل دے سکتا ہے اور نہ کسی بھی عمل کی تکمیل کر سکتا ہے لہٰذا نظامِ رسالت کے ذریعے نہ صرف احکامِ الٰہی کی صورت گری کی گئی بلکہ انسانی عمل کی ایسی تکمیل بھی کر دی گئی کہ یہ ابدالآباد تک دنیائے انسانیت کے لیے نمونۂ تقلید بن گئی ہے۔ اس کی پیروی سے انسان کو عظمت و شوکت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے شرافت و برکت۔ اس کے بغیر نہ دنیا کی حقیقی کامیابی ممکن ہے نہ آخرت کی عظیم کامرانی۔

Marfat.com

باب سوم

ایمان بالرسالت کے تقاضے

Marfat.com

Marfat.com

ایمان بالرسالت کے عمومی اور خصوصی تصور کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور اس ایمان کے کامل ہونے کے بنیادی تقاضے کیا ہیں۔ ایمان باللہ کی طرح ایمان بالرسالت کے بھی دو مدارج ہیں؛

۱۔ اصلِ ایمان ——— یہ وہ اساسی ایمان ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کے ذریعے متحقق ہو جاتا ہے۔

۲۔ کمالِ ایمان ——— یہ ایمانِ کامل ہے جو بعض شرائط اور تقاضے صحیح طور پر پورے کئے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

ایمان بالرسالت اقرار و تصدیق کی شرط پوری کرنے کے علاوہ درج ذیل چار تقاضوں سے مرکب ہے۔

ا۔ محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
ب۔ تعظیمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
ج۔ نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
د۔ اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے تحقق اور ثبوت میں ایک قدر مشترک ہے اور ایک مختلف۔ جہاں تک اصل اور کمال کے مدارج کا تعلق ہے، دونوں

Marfat.com

ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابوامامہ اور حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ارشاد ہے:

من احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطی للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان
(ترمذی، ابوداؤد)

جس نے اللہ کے لیے کسی سے محبت کی اور اللہ ہی کے لیے کسی سے دشمنی کی اور اللہ کے لیے کسی کو کچھ دیا اور للہ ہی کے لیے کسی سے کچھ روکا، پس اس نے ایمان مکمل کرلیا۔

حالانکہ ان شرائط پر پورا نہ اُترنے کے باوجود اس کا اللہ پہ ایمان رکھنا اصلاً ثابت ہو سکتا ہے مگر ناقص رہ جاتا ہے۔ جہاں تک ایمان بالرسالت میں اصلِ ایمان اور کمالِ ایمان کے تعین اور ان کے ثبوت کی حدود کا تعلق ہے، اس میں اس کی حیثیت مختلف ہے۔ مذکورہ بالا چار شرائط اور تقاضوں میں سے پہلے دو (محبت اور تعظیم) اصلِ ایمان کا حصہ ہیں، جبکہ بقیہ دو (اطاعت اور نصرت) کمالِ ایمان کا۔ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ سرے سے محبت ہی نہ ہو بلکہ قلبی اور باطنی سطح پر ایک طرح کی لاتعلقی یا عدم رغبت کی کیفیت ہو اور نہ ہی دل میں آپ کی تعظیم کا کوئی داعیہ موجود ہو تو ان خصائص کا فقدان، مطلقاً ایمان ہی کی نفی کو مستلزم ہوگا۔ اس کے برعکس اگر محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تعظیمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عناصر انسان کی طبیعت میں پائے جائیں، مگر بدقسمتی سے اطاعت اور نصرت کی توفیق نہ ہو تو پھر ایمان اصلاً تو ثابت ہوگا مگر ناقص رہ جائے گا۔ اس کا کمال بلکہ خود داعیاتِ محبت و تعظیم کا کمال اطاعت اور نصرت کے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں محبت اور تعظیم میں پھر دو مدارج ہیں:

(۱) محض محبت و تعظیم

Marfat.com

(۲) شدید محبت و تعظیم

اگر حضور علیہ السلام کی ذات سے محض اس قدر محبت اور تعظیم کا تعلق ہو کہ انسان کا دل آپ کی یاد سے کچھ مانوس ہو، آپ کے ذکر سے کچھ لذت اور سکون پائے اور اس کے اندر ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی گستاخی و بے ادبی کا بھی شائبہ نہ ہو تو وہ صاحبِ ایمان تصور کیا جائے گا اور اگر یہی محبت و تعظیم اس کے قلب و باطن میں زور پکڑ جائے اور اتنی شدت اختیار کر جائے کہ نہ تو کسی مخلوق کی محبت واقعۃً آپ کی محبت کا مقابلہ کر سکے اور نہ ہی کسی کی تعظیم تو پھر اس ایمان کو ایمانِ کامل تصور کیا جائے گا۔ اب ہم ان چاروں تقاضوں کا اختصار کے ساتھ جداگانہ ذکر کرتے ہیں:

محبتِ رسول

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ

(التوبہ: ۲۴)

فرما دیجئے! اگر تمہارے باپ، دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہارا کنبہ اور تمہارے اموال جو تم کماتے ہو، اور تمہارا کاروبار جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ لگا رہتا ہے اور تمہاری پسندیدہ رہائش گاہیں، تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو اس وقت کا جب اللہ اپنا حکم (عذاب) نازل کرے۔ بیشک اللہ ایسے سرکشوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

Marfat.com

اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو دنیا و ما فیہا کی ساری محبتوں سے فائق و برتر قرار دیا گیا ہے اور اسے ہی علامت ایمان و ہدایت کہا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ارشاد فرماتے ہیں:

لا یؤمن احدکم	تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک
حتی اکون احب الیہ من	ایمان دار نہیں ہو سکتا جب وہ مجھ سے
والدہ و ولدہ و الناس	اپنے والدین، اولاد بلکہ تمام انسانوں سے
اجمعین [1]	بڑھ کر محبت نہ کرے۔

عبداللہ بن ہشام روایت کرتے ہیں کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور فرما رہے تھے:

لا یؤمن احدکم	تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک
حتی اکون احب الیہ من	ایمان دار نہیں ہو سکتا جب تک مجھے
نفسہ [2]	اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبوب نہ رکھے۔

کیونکہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان بالرسالت کی بنیاد تھی اس لیے صحابہ کرام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست اقدس پر "محبت" کی بیعت کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت صفوان بن قدامہ رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کیا:

یا رسول اللہ ناولنی	یا رسول اللہ! اپنا دست اقدس
یدك أبایعك فناولنی	میرے آگے کیجئے۔ میں آپ کی بیعت

---

[1] صحیح بخاری (۱: ۷)، صحیح مسلم (۱: ۴۹) رواہ انس

[2] الشفاء، (۲: ۱۹)

Marfat.com

بیدہ فقلت ، یارسول اللہ انی احبک — کرنا چاہتا ہوں۔آپ نے اپنا دستِ اقدس میرے آگے بڑھایا میں نے

قال[2] المرء مع من احب[1] — بیعت کرتے ہوئے عرض کیا: یارسول اللہ مجھے آپ سے محبت ہے۔حضور علیہ السلام نے فرمایا: آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہوگی۔

یہی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبد اللہ ابن مسعود، ابوموسیٰ اشعری، انس بن مالک اور ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حلاوتِ ایمان کی سب سے پہلی شرط یہ قرار دی:

ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما[2] — کہ انسان، کائنات کی ہر شے سے بڑھ کر محبت اللہ اور اس کے رسول سے کرے۔

قاضی عیاض نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بھی روایت کی ہے:

من احبنی کان معی فی الجنۃ[3] — جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا

محبت چونکہ دل کی کیفیت سے عبارت ہے، اس لیے آنکھوں سے دیکھی نہیں جاسکتی۔لہٰذا اس کی علامات سے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ائمہ حدیث نے محبت

---

[1] الشفاء (۲: ۲۰)

[2] صحیح بخاری، (۱: ۷) - صحیح مسلم، (۱: ۴۹)

[3] الشفاء (۲: ۲۱)

Marfat.com

کی درج ذیل علامات بیان کی ہیں جو صحابہ کرام کی زندگیوں میں بتمام وکمال دکھائی دیتی ہیں :

۱۔ کثرتِ ذکر ـــــــ محبت کی سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ محبوب کا ذکر اور اس کی یاد کثرت سے کی جائے بلکہ دل ہمہ وقت یادِ محبوب سے معمور رہے۔

۲۔ شوقِ زیارت ـــــــ دوسری علامت یہ ہے کہ محبوب کے جلوہ و دیدار کی خواہش ہمیشہ دل میں شدت سے رہے۔

۳۔ تعظیم و توقیر ـــــــ محبوب کی عزت و تکریم اور تعظیم و توقیر انتہا درجے کی ہو۔ محبوب کی شخصیت کے کسی بھی پہلو کو عیب دار یا ناقص تصور نہ کیا جائے تاکہ ادب و احترام میں کوئی کمی واقع نہ ہونے پائے۔ گویا اسے محبوب کی ہر خوبی منتہائے کمال پر دکھائی دے، کسی اعتبار سے بھی کم نظر نہ آئے۔

۴۔ خشوع و خضوع ـــــــ محبوب کا نام اور اس کے فضائل و محاسن سن کر دل میں بڑی راحت و سکون، لذت و حلاوت اور خشوع و خضوع کی کیفیت پیدا ہو اور محبوب کے لیے بڑی انکساری اور تواضع کا اظہار کیا جائے۔

۲۔ تعظیمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

قرآن حکیم کا اس سلسلے میں بڑا واضح حکم موجود ہے :

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(الاعراف : ۱۵۷)

پس جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، آپ کی تعظیم کریں، آپ (کے مشن) کی مدد کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو آپ کے ساتھ اُتارا گیا ہے، صرف وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ میں دوسرا تقاضائے ایمان تعظیمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید نے تعظیمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی آداب اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ [1]	اے اہلِ ایمان! (کسی بھی عمل کرنے میں) اللہ اور اس کے رسول سے پہل نہ کیا کرو

صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اس امر سے پاک ہے کہ کوئی شخص اس سے پہل کرے، پھر یہ حکم بھی اس وقت اتارا گیا جب کچھ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اپنی قربانی کر لی۔ یہ پہل تو فی الواقع صرف عملِ رسول سے تھی۔ جسے باری تعالیٰ نے اُمت کے لیے تقاضائے تعظیمِ رسالت کے خلاف سمجھا اور تعظیمِ رسول کی خلاف ورزی کو خود تعظیمِ اُلوہیت کی خلاف ورزی قرار دے دیا۔

۲۔ اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا [2]	تم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس طرح (عامیانہ انداز میں) نہ پکارا کرو جیسے ایک دوسرے کو آپس میں پکارتے ہو۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ باری تعالیٰ اپنے محبوب کے عامیانہ انداز سے پکارے جانے کی اجازت کس طرح دے سکتا ہے جب اس نے خود بھی پورے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ کو تعظیمی القاب اور پیار بھرے خطابات کے بغیر کبھی نہیں پکارا۔

---

[1] الحجرات (۴۹ : ۱)

[2] النور (۲۴ : ۶۳)

Marfat.com

کبھی وہ "یا ایھا النبی" کہہ کر پکارتا ہے، کبھی "یا ایھا الرسول" کبھی "یا ایھا المزمل" کہہ کر یاد کرتا ہے، کبھی "یا ایھا المدثر" کبھی "یٰسٓ"، کبھی "طٰہٰ" جبکہ دیگر تمام انبیا کو ہمیشہ نام لے کر بلایا جاتا ہے مثلاً "یا آدم"، "یا نوح"، "یا ابراھیم"، "یا موسیٰ"، "یا داؤد"، "یا عیسیٰ"۔

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نام لے کر پکارنے کے بجائے یا رسول اللہ اور یا نبی اللہ جیسے القاب سے پکارنے کی تلقین کی گئی ہے اسی میں پاسِ ادب ہے۔

مزید ارشاد فرمایا گیا:

لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ؂۱

(اے ایمان والو!) اپنی آوازیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے بلند نہ کرو، اور ان سے (اس طرح بے تکلفانہ انداز میں) پکار پکار کر بات کیا کرو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو، ایسا کرو گے تو تمہارے سب اعمال غارت ہو جائیں گے اور تمہیں خبر بھی نہ ہو گی۔

یہاں تعظیمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کتنا بڑا ادب سکھایا جا رہا ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کی جا رہی ہے کہ بارگاہِ رسالت مآب میں معمولی سی بے ادبی بھی جو صرف آواز بلند کرنے سے ہو سکتی ہے، ساری زندگی کے نیک اعمال اور عبادات کو غارت

؂۱ الحجرات (۴۹ : ۲)

Marfat.com

کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان، دولتِ ایمان سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کا یہ فیصلہ ہے کہ اعمال صرف کفر سے غارت ہوتے ہیں۔ اس کے سوا کسی بھی صورت میں ختم نہیں ہوتے۔ کیونکہ مسلمان جس قدر بھی گنہگار اور فاسق و فاجر کیوں نہ ہو، وہ اُخروی زندگی میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر بالآخر جنت میں ضرور جائے گا۔ چنانچہ اگر اسکے سارے اعمال غارت ہو جاتے تو نتیجۃً اس کا ایمان بھی نہ بچتا۔ لہٰذا وہ کبھی بھی دوزخ سے نکل کر جنت میں داخل نہ ہو سکتا کیونکہ اعمال غارت ہو جانے سے ہمیشہ دوزخ میں رہنا لازم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ	ان کے اعمال غارت ہو گئے اور وہ ہمیشہ
وَفِى النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ (التوبہ: ۱۷)	دوزخ میں رہیں گے۔

بڑے سے بڑا گناہ بھی اپنا اثر اور سزا تو ضرور مترتب کرتا ہے لیکن تمام اعمالِ صالحہ کی نفی نہیں کر سکتا۔ اس لیے مومن بالآخر جنت کا مستحق ہو جاتا ہے مگر بارگاہِ مصطفویت کی بے ادبی صرف گناہ نہیں بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ تمام اعمال کا غارت ہونا محض گناہ کی نہیں بلکہ کفر کی تاثیر ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ	اور جو کوئی ایمان کا انکار کر دے اور کفر کا
حَبِطَ عَمَلُهٗ (المائدہ: ۵)	مرتکب ہو پس اس کے اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ	اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کے وہ
مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ	عمل ضائع اور غارت ہو جاتے جو انہوں نے
(الانعام: ۸۸)	کیے ہوئے تھے۔

ایک اور مقام پر ارشادِ ایزدی ہے:

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا	جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا

Marfat.com

عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ‏ اللہ نے ان کے اعمال غارت کر دیے۔

جب مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں یہ امر طے پا گیا کہ بارگاہ نبوت کی بے ادبی، تمام اعمال کو غارت کرنے کا باعث ہوتی ہے، چونکہ تمام اعمال صرف کفر سے ہی غارت ہوتے ہیں، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی صریح کفر قرار پائی اور نتیجۃً آپ کی تعظیم عین ایمان۔

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور تعظیم، صرف ایمان کے کمال کا ہی نہیں بلکہ اصلاً ایمان کے ثبوت اور تحقق کا باعث ہیں۔ ان دو تقاضوں کو پورا کیے بغیر "ایمان بالرسالت" کا وجود ہی سرے سے محل نظر رہتا ہے۔

۳۔ نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ مشن کی خدمت کو قرآنی اصطلاح میں "نصرتِ رسول" صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ ایمان بالرسالت کا چوتھا تقاضا ہے "نَصَرُوْهُ" (اعراف: ۱۵۷) سے یہی مراد ہے۔ حضور علیہ السلام کی بعثت سعیدہ کا مقصد "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (اس دینِ حق کو تمام ادیانِ عالم پر غالب و فائق کرنا تھا) اس لحاظ سے آپ کے مشن کے دو پہلو تھے،

۱۔ دینِ اسلام کی ظاہری شوکت اور سیاسی تمکنت کے تحفظ کا پہلو

۲۔ دینِ اسلام کی علمی، اخلاقی اور روحانی اقدار کے تحفظ کا پہلو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اُمتِ مسلمہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت و نیابت دو طرح سے عطا کی گئی:

۱۔ ظاہری خلافت

۲۔ باطنی خلافت

اسلام کی مادی، سیاسی اور ظاہری شان و شوکت اور عظمت و تمکنت کے

Marfat.com

تحفظ اور فروغ کی جد و جہد ظاہری خلافت ہے۔ جب کہ اسلام کی علمی، مذہبی اور روحانی زندگی کے احیاء، تجدید اور تحفظ کی جد و جہد باطنی خلافت ہے۔ اپنی جان و مال، ممکنہ وسائل و ذرائع اور علم و عمل کی تمام صلاحیتوں کو بروئے لاکر مصطفوی مشن کی خدمت میں ہمہ وقت مستعد رہنا ہی حقیقی تبلیغ اور جہاد ہے۔ اسی لیے سورۂ توبہ کی آیت کریمہ میں "محبت" کے تین عناصر بیان کئے گئے ہیں "اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِہَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ" جس کا معنیٰ یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شی اور منفعت خدا کی محبت، رسول کی محبت اور جہاد کی محبت یعنی پیغمبرانہ مشن کی خدمت سے زیادہ عزیز اور محبوب نہیں ہونی چاہیے۔

پیغمبرانہ مشن کی خدمت و مدد کا یہی تصور کئی مقامات پر قرآن مجید میں یوں مذکور ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ	جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی، اور اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کے ہاں بہت بڑا درجہ رکھتے ہیں اور وہی کامیاب و بامراد ہونے والے ہیں۔

(التوبہ : ۲۲)

۴۔ اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

آیت مذکورہ بالا میں آخری شرط اور ادب کو "وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ" کے الفاظ کی صورت میں واضح کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اطاعت و اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان بالرسالت کا آخری اور تکمیلی تقاضا ہے۔ اس کے بغیر نہ محبت و تعظیم کا عنصر مکمل ہوتا ہے نہ نصرت و خدمت کا۔

Marfat.com

اس لیے ہر جگہ ایمان کے ساتھ اطاعت و اتباع کا حکم ضرور صادر کیا گیا ہے۔ ارشادِ ایزدی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ (الانفال: ۲۰)	اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔
أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (آل عمران: ۱۳۲)	اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جا سکے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

إِنْ تُطِيعُوهُ تَهْتَدُوا (النور: ۵۴)	اگر تم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غلامی و اطاعت کرو گے، تو ہدایت پا سکو گے۔
مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء: ۸۰)	جو کوئی رسول کی اطاعت کرے گا وہی اللہ کا مطیع ہو گا۔

اسی طرح حبِ الٰہی کی شرط بھی اتباعِ رسول قرار دی گئی ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (آل عمران: ۳۱)	فرما دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو، تو میری پیروی کرو، اللہ تمہیں اپنا محبوب بنا لے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مکمل غلامی اطاعت اور اتباع کو ایمان کی شرطِ لازم قرار دیتے ہوئے فرمایا:

لا يؤمن احدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به	تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی تمام خواہشات کو میری تعلیم کے تابع نہ کر دے۔

مذکورہ بالا چاروں تقاضے پورے ہوں گے تو ایمان بالرسالت مکمل ہو گا ورنہ ناقص و ناتمام رہ جائے گا۔

Marfat.com

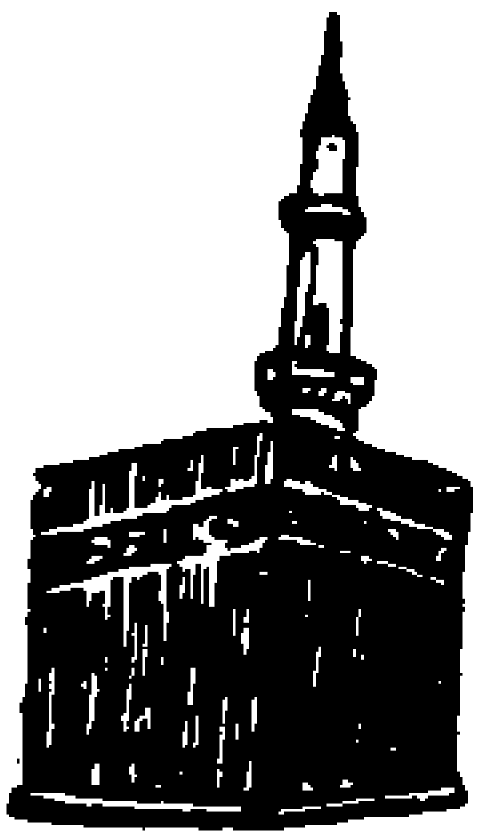

ایمان بالآخرت

Marfat.com

Marfat.com

باب چہارم

ایمان بالآخرت اور اُس کی حقیقت

Marfat.com

Marfat.com

ایمان کے پانچ بنیادی ارکان میں سے تیسرا اہم رکن ایمان بالآخرت ہے۔ قرآن کریم میں ایمان بالآخرۃ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے لوازم کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز انسانی زندگی پر اس عقیدے کے جو اثرات مرتب ہوتے ہیں، انہیں واضح کیا گیا ہے۔ اس لیے ایمان بالآخرت کے سلسلے کی گفتگو تین حصوں پر مشتمل ہو گی۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) ایمان بالآخرت کی حقیقت

(۲) ایمان بالآخرت کا قرآنی استدلال

(۳) ایمان بالآخرت کی ضرورت

ایمان بالآخرت کی حقیقت

قرآن حکیم ایمان بالآخرت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے واضح کرتا ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ

(کافرو) تم خدا کا کیونکر انکار کر سکتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں جان بخشی۔ پھر وہی تم کو مارتا ہے،

Marfat.com

اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ [1]
پھر وہی تم کو زندہ کرے گا۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیۂ مبارکہ میں حسب ذیل نکات قابلِ غور ہیں:

۱۔ کُنْتُمْ اَمْوَاتًا (تم مردہ تھے) مردہ ہونے کا بظاہر یہ مفہوم ہے کہ کوئی چیز موجود ہو کر مر جائے، مگر اس مقام پر انسانی زندگی کے عالمِ وجود (EXISTENCE) میں آنے سے پہلے کی حالت کو تشبیہاً موت قرار دیا جا رہا ہے۔

۲۔ فَاَحْیَاکُمْ (پھر اس نے تم کو زندہ کر دیا)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کو عدمِ محض سے نکال کر حالتِ وجود (EXISTENCE) میں لا کھڑا کیا، مگر یہ سمجھنا حماقت ہوگی کہ یہ زندگی اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔

۳۔ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ (پھر وہ تمہیں دوبارہ مارے گا) جس خدا نے تم کو عالمِ عدم سے نکال کر عالمِ وجود میں پہنچایا ہے، وہی تمہیں بارِ دگر عالمِ عدم یعنی موت سے دوچار کرے گا —— مگر یہ منزل بھی انسان کے سفر کی آخری منزل نہ ہوگی۔

۴۔ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ (پھر وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا) اگرچہ یہ زندگی جو دوسری موت کے بعد انسان کو دی جائے گی، پہلی زندگی سے ماہیتاً اور احوالاً مختلف ہوگی، مگر یہ بھی انسان کی آخری قرارگاہ نہ بننے پائے گی۔

۵۔ ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے) یعنی اس دوسری زندگی کے بعد انسان کو پھر دربارِ خداوندی میں حاضر کر دیا جائے گا۔

اس آیت میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا اور پھر خدا کی بارگاہ میں پیش کیے جانے کا، یعنی کل پانچ مرحلوں کا ذکر ہے جن سے انسان یکے بعد دیگرے گزرتا ہے۔

---

[1] البقرہ (۲:۲۸)

Marfat.com

ایمان بالآخرت سے جس زندگی پر ایمان مراد لیا جاتا ہے اس کی حقیقت سب سے آخر میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ [1] پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

دو موتیں قرآن کریم ابتداءً دو موتوں کا ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے ایک تو انسان کے سفرِ زندگی شروع کرنے سے پہلے کی عالت، حالتِ عدم ہے جبکہ دوسری موت سے مراد وہ حقیقی موت ہے جس کا نظارہ ہم اپنی روزمرّہ کی زندگی میں کرتے رہتے ہیں۔

دو زندگیاں جس طرح یکے بعد دیگرے انسان پر دو موتیں وارد ہوتی ہیں، اسی طرح یکے بعد دیگرے انسان کو دو زندگیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان میں سے پہلی زندگی تو واضح ہے کہ اس سے مراد عالمِ شہادت میں رنگ و کیف کی موجودہ زندگی ہے۔ یہ نور و ظلمت اور ہست و بود کی زندگی ہے۔ مگر دوسری زندگی سے مراد قیامت کی زندگی نہیں، بلکہ عالمِ برزخ [2] یعنی مرنے سے لے کر قیامت تک کی زندگی

---

[1] ترجعون، مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ جس سے یہ تأثر دینا مقصود ہے کہ انسان خواہ مرنے کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، وہ کافر ہو یا مسلمان، ہر شخص کو بہرحال خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے پیش کر دیا جائے گا۔ البتہ فرق یہ ہے کہ مومن اور برگزیدہ افراد ہنسی خوشی اس طرف بڑھیں گے، ان کے لیے جانے میں کوئی پریشانی نہ ہوگی، مگر کافر اور بدکار اس سے دور بھاگنا چاہیں گے۔ ان کی خواہش ہوگی کہ ہم کسی طرح اس مرحلے سے بچ جائیں، لیکن وہ کسی طور پر بھی اس زندگی کے نتائج و اثرات سے بچ نہ سکیں گے۔

[2] برزخ دو چیزوں کے درمیان روک اور آڑ کو کہتے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں اس سے

(باقی آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

ہے جس کے دوران میں منکر نکیر کے سوال و جواب ہوتے ہیں اور انسان عذابِ قبر سے دوچار ہوتا ہے یا رحمتِ خداوندی کا مستحق بنتا ہے۔ اس زندگی کا اصطلاحی نام "حیاتِ برزخی" ہے جبکہ اُخروی زندگی (آخرت) کا آغاز اس وقت سے ہو گا جب اس زندگی اور اس مادی کائنات کو کلیتہً فنا کر دیا جائے گا۔ پھر سیدنا آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر وقوعِ قیامت تک جتنے بھی انسان اس دنیا میں آئے ہوں گے، ان سب کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا۔ اور وہ سب عدالتِ الٰہیہ میں حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب و کتاب پیش کریں گے جس کے نتیجے میں یا تو وہ ابدی جنت کے مستحق ہوں گے یا جہنم کے سزاوار ٹھہرائے جائیں گے۔

ایمان بالآخرت اور اس کے اجزا

بہر حال انسانی زندگی کے سفر کے اس آخری مرحلے پر ایمان لانے کا نام ایمان بالآخرت ہے جو در اصل تین اجزا کا مجموعہ ہے، اور وہ درج ذیل ہیں:

(۱) بعث بعد الموت مرنے کے بعد مُردے کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ پھر وقت آنے پر تمام انسانوں کو ان کی قبروں سے نئی

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

مراد موت سے قیامت تک کا درمیانی عرصہ ہے، جو ایک طرح سے روک سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس درمیانی عرصے کے لیے برزخ کا اطلاق اس زندگی کی عمومیت پر دلالت کرتا ہے اور اس سے مراد فقط قبر نہیں بلکہ انسان کی ہر وہ حالت ہے جس سے وہ اس درمیانی عرصے میں دوچار رہتا ہے، خواہ قبر ہو، غرق ہو یا حرق (جلنا) یا کسی جانور کا نگل جانا ہو (آئندہ سطور میں مزید وضاحت کی جائے گی)

Marfat.com

زندگی کے ساتھ اُٹھایا جائے گا۔ ان کے حواس اور فہم و بصیرت سب کچھ بحال ہو گا، ان کا جسم پہلے کی مانند سلامت ہوگا۔ الغرض ایک بار پھر بھرپور زندگی کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں گے اور اس حالت میں ہر شخص بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوگا۔

(۲) شعورِ عینیت قیامت کے دن اُٹھنے کے بعد ہر شخص کو اس بات کا کامل شعور ہو گا کہ میں وہی شخص ہوں جو دنیوی زندگی میں فلاں اچھائی یا برائی کا مرتکب ہوا تھا۔ اس طرح اسے اپنی گزشتہ اور موجودہ شخصیت کے ایک ہونے کا پوری طرح احساس ہوگا۔

(۳) جواب دہی اور جزا و سزا انسان نے جو کچھ دنیا میں کیا ہوگا، اس کے لیے وہ جوابدہ ہوگا، اسے اسی کے مطابق جزا و سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ یہ ایمان بالآخرت کا تیسرا جزو ہے۔ ان تینوں اجزا پر مکمل ایمان رکھنے کا نام 'ایمان بالآخرت' ہے۔

ایمان بالآخرت کے اجزا اور قرآنی استدلال

★ بعث بعد الموت اور قرآنی استدلال

ایمان بالآخرت کا پہلا جزو بعث بعد الموت یعنی مرنے کے بعد دوبارہ جی اُٹھنا ہے۔ تصورِ آخرت کے اس اہم جزو کا قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر ذکر کیا گیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا [۱]

وہ دن جب خدا ان سب کو جلا اُٹھائے گا۔

---

[۱] المجادلہ (۵۸ : ۶)

Marfat.com

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ؕ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا [1]

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کے سب خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گے۔ اس نے سب کو گھیر رکھا ہے اور ایک ایک کو شمار کر رکھا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ [2]

اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے تو جان لو کہ ہم نے پہلے بھی مٹی جیسی بے جان شے سے تم کو پیدا کیا ہے۔

★شعورِ عینیت اور قرآنی استدلال

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات اور اپنے نفس کی پوری پوری پہچان ہوگی۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ [3]

پھر جو جو کام یہ کرتے رہے ہیں، قیامت کے دن وہ ایک ایک ان کو بتائے گا۔

---

[1] مریم (۱۹: ۹۳-۹۴)

[2] الحج (۲۲: ۵)

[3] المجادلہ (۵۸: ۷)

Marfat.com

مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تمہیں نہ صرف زندہ کرے گا کیونکہ محض زندہ کرنا بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں، بلکہ تمام انسانوں کو ان کی دنیوی زندگی کی کارگزاری سے آگاہ بھی کیا جائے گا۔ انہیں بتایا جائے گا کہ انہوں نے کیا کمایا، کیا پایا اور کیا کھویا۔ اس طرح ہر شخص کو یہ بتایا جائے گا کہ اس نے یہ برائی کی ہے اور یہ اچھائی۔ اور انسان کے دلوں میں ان کی سابقہ زندگیوں میں صادر ہونے والی ہر اچھائی اور برائی کا احساس پیدا کر دیا جائے گا۔ کیونکہ اگر دوبارہ زندہ کیے گئے اس فرد میں اپنی گزشتہ زندگی کا احساس نہ ہو، تو پھر جزا اور سزا کا کوئی مفہوم نہیں رہ جاتا۔ اس بنا پر جزا اور سزا کا کوئی مفہوم ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس فرد کے ذہن میں احساسِ عینیت بیدار کر دیا جائے۔ جس کے نتیجے میں وہ جانتا ہو کہ میں نے ہی اپنی گزشتہ زندگی میں یہ جرم کیا تھا اور آج اسی کا یہ بدلہ دیا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ممکن ہو گا کہ ہر شخص خود کو پہچان رہا ہو گا۔

ارشادِ ربانی ہے:

هُنَالِكَ تَبْلُوا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ [۱]

وہاں ہر نفس اپنے ان اعمال کو خود جانچ لے گا جو وہ پہلے کر چکا ہے۔

نیز فرمایا:

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ [۲]

وہ دن جب ہر نفس ہر اس نیکی کو جو اس نے کی ہے اور اس برائی کو جو وہ کر چکا ہے، اپنے سامنے موجود پائے گا۔

---

[۱] یونس (۱۰: ۳۰)

[۲] آلِ عمران (۳: ۳۰)

Marfat.com

اس دن ہر شخص کی علنیّت کے شعور کا یہ عالم ہو گا کہ:

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ [1]

اس دن ان پر خود ان کی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ اور پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو انہوں نے دنیوی زندگی میں کیے تھے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ ۔۔۔ (الآیۃ) [2]

حتیٰ کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان پر ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان اعمال کی گواہی دیں گی جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔ پھر وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی ہے وہ جواب دیں گی کہ ہم کو اللہ نے گویائی عطا کی ہے ۔۔۔ الآیۃ

اسی طرح یہ بھی ارشاد فرمایا:

وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ [3]

اور وہ خود اپنے خلاف شہادت دیں گے کہ وہ ناشکر گزار بندے تھے۔

---

[1] النور (۲۴ ، ۲۴)

[2] حٰم السجدہ (۴۱ ، ۲۰-۲۱)

[3] الاعراف (۷ ، ۳۷)

Marfat.com

٭جواب دہی اور جزا و سزا کا تصور اور قرآنی استدلال

جب انسان میں اپنی شخصیت و عینیت کا مکمل احساس بیدار ہو چکا ہوگا، گذشتہ زندگی اور اس کی تمام و کمال کارگزاری اس کے سامنے ہوگی تو اس احساس اور شعور کے ساتھ اسے خدا کے سامنے حاضر کیا جائے گا۔ وہاں اس کے گناہوں کی سزا، اور نیکیوں کی جزا دی جائے گی۔ یہ تصور قرآن مجید میں اس طرح مذکور ہے:

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ؕ[1]	بیشک تمہیں قیامت کے دن اپنی اس زندگی کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

مزید ارشاد فرمایا گیا:

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ؕ[2]	پھر ہر نفس کو قیامت کے دن اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔

اس امر کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ	اور قیامت کے روز ہم ٹھیک وزن کرنے والی ترازو رکھ دیں گے پھر کسی جان پر ظلم نہ ہوگا اور اگر کسی کا ایک رائی کے دانے کے برابر بھی عمل ہوگا تو ہم اس

---

[1] آل عمران (۳ : ۱۸۵)

[2] آل عمران (۳ : ۱۶۱)

Marfat.com

حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۚ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ [1]

کو بدلے کے لیے لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے کے لیے کافی ہیں۔

بالآخر جزا و سزا کی آخری صورت یوں دکھائی جائے گی کہ :

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۙ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ [2]

اور جنت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے سامنے کر دی جائے گی۔

عقیدۂ آخرت کے سلسلے میں ان تینوں اجزا پر کامل یقین رکھنا ایمان کی بنیادی شرط ہے۔

ایمان بالآخرت کی اہمیت

ایمان بالآخرت کی اہمیت کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص خدا پر ایمان رکھتا ہو، اس کے رسولوں پر ایمان رکھتا ہو، قرآن اور قرآنی تعلیمات پر بھی ایمان رکھتا ہو، مگر آخرت کی زندگی پر اس کے اجزا سمیت ایمان نہ رکھتا ہو تو ایسا شخص بلاشبہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اسی بنا پر قرآنِ مجید میں سورۃ البقرہ کے آغاز میں مؤمنین کے بارے میں کہا گیا ہے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ [3]

اور وہ آخرت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔

---

[1] الانبیاء (۲۱ : ۴۷)

[2] الشعراء (۲۶ : ۹۰-۹۱)

[3] البقرہ (۲ : ۴)

ذخیرہ
لاہور پاکستان

Marfat.com

اُخروی زندگی کے بارے میں چند اشکالات

یہاں ان اشکالات کا ذکر بھی ضروری ہے، جو بعض لوگوں کے ذہنوں میں حشر و نشر اور بعث بعد الموت سے متعلق پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر شخص کو مرنے کے بعد زمین میں دفن ہونا نصیب نہیں ہوتا، مثلاً کچھ لوگ ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ جہاز کو آگ لگ جاتی ہے اور افراد جل کر ختم ہو جاتے ہیں، بلکہ ان کے ذرات بھی ہوا میں منتشر ہو جاتے ہیں۔ اس طرح نہ ان کا جسم بچتا ہے اور نہ ہی ان کو باقاعدہ تدفین نصیب ہوتی ہے۔ اسی طرح سمندر میں ایک شخص سفر کر رہا ہوتا ہے، دورانِ سفر ہی میں اس کو موت آجاتی ہے۔ لوگ اُس کو اُٹھا کر سمندر میں پھینک دیتے ہیں، جہاں اسے مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔ مچھلیوں کو شکاری پکڑ لاتے ہیں اور کھا جاتے ہیں۔ اور پھر وہ کھانے والے بھی مر جاتے ہیں۔ اسی طرح قبر میں مردے کو دفنانے کی صورت میں بھی یہ بات مسلّم ہے کہ کچھ ہی برسوں میں مٹی انسانی جسم کو مکمل طور پر کھا جاتی ہے۔ اب وہاں نہ جسم ہے اور نہ جسم کے ذرات۔ سوال یہ ہے کہ ان حالات میں عالمِ برزخ اور عالمِ آخرت کی کیفیتیں کس طرح وارد ہوتی ہیں؟ کیسے اُٹھایا اور زندہ کیا جائے گا؟ اور کیسے ربِ ذوالجلال کی عدالت میں حساب و کتاب کے لیے پیش کیا جائے گا؟ اسی نوعیت کے اعتراضات کفار و مشرکینِ عرب بھی کیا کرتے تھے جن کا ذکر قرآنِ مجید ہے:

وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوثُونَ خَلْقًا جَدِيدًا[1]	اور انہی نے کہا کہ جب گل سڑ کر ہماری صرف ہڈیاں رہ جائیں گی اور ہم ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو

[1] بنی اسرائیل (۱۷: ۴۹)

Marfat.com

پیدا کر کے اُٹھائے جائیں گے۔

نیز کہا:

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ [1]

کیا جب ہم مر کر مٹی بن جائیں گے تو پھر بھی اُٹھیں گے۔ زندگی کی یہ واپسی بعید از عقل ہے۔

ایک دوسرے مقام پر آتا ہے:

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِى الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِىْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ [2]

اور انہوں نے کہا کہ جب ہم زمین میں گم ہو جائیں گے تو کیا ہمیں پھر نئے سرے سے پیدا کیا جائے گا۔

انہی اشکالات کی بنا پر اُنہوں نے آخرت کا انکار کر دیا:

وَقَالُوْا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ [3]

اور انہوں نے کہا کہ ہمیں دنیوی زندگی ہی کا سامنا کرنا ہے، کسی اور کا نہیں۔ ہم اس میں مرتے بھی ہیں اور جیتے بھی ہیں۔ اور ہماری موت کا باعث بھی صرف وقت اور زمانے کا طبعی نظام ہے۔

یعنی ان کا خیال تھا کہ اس دنیا اور اس کی زندگی کے علاوہ اور کوئی حقیقت

---

[1] ق (۵۰: ۳)

[2] الم السجدہ (۳۲: ۱۰)

[3] الجاثیہ (۴۵: ۲۴)

Marfat.com

موجود نہیں ہے۔

ایک اور مقام پر ان کا یہ قول یوں بیان کیا گیا ہے:

اِنْ هِیَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰی وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِیْنَ ؎۱ — ہم اس پہلی موت کے بعد کبھی نہیں اٹھائے جائیں گے۔

یعنی وہ کہتے تھے کہ انسان کے جملہ معاملات اس موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں، اس کے بعد نہ کوئی زندگی ہے، نہ حساب و کتاب اور نہ جزا و سزا۔

ازالۂ شبہات اور شعورِ عینیت کا تصوّر

بعث بعد الموت کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بعینہٖ اسی بدن اور اسی جسم کو دوبارہ انہی ذرات اور خلیوں (CELLS) کے ساتھ زندہ کیا جائے جن سے اس کا دنیوی وجود تشکیل پایا تھا۔ انسان کے موجودہ جسم کے ذرات اور خلیے بھی سات سال کے اندر مکمل طور پر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس مدت میں پرانے خلیے اندر ہی اندر پگھل جاتے اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں، جب کہ ان کی جگہ نئے خلیے اور نئے سیل (CELLS) لے لیتے ہیں۔ اس طرح انسانی زندگی کے دوران میں کئی مرتبہ (مثلاً ستر سال کی عمر میں کم از کم ۱۰ مرتبہ) یہ عمل دہرایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ہر سات سال کے بعد اس کے پرانے جسم کی جگہ مکمل طور پر نیا جسم لے لیتا ہے۔ اگر دنیوی زندگی میں انسانی جسم کے بنیادی ذرات کے بار بار تبدیل ہوتے رہنے کے باوجود اس کی شخصیت وہی رہتی ہے اور اس کی ہستی کا تشخص بھی قائم رہتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ آخرت میں اس انسان کا تشخص معرضِ وجود میں نہ آسکے۔ اس کی وجہ فقط انسان کا یہی "شعورِ عینیت" ہے جس نے

؎۱ الدخان (۴۴ : ۳۵)

Marfat.com

اسے اپنے نفس کے ادراک اور اپنی ذات کی شناخت پر قائم رکھا اور اس کے ظاہری بدن میں وسیع ترتوڑ پھوڑ کے باوجود اس کی شخصیت سلامت رہی۔ لہذا ثابت ہوا کہ انسان کی شخصیت حقیقت میں مادی ذرات کے اجتماع کا نام نہیں، بلکہ انسان کی شخصیت حقیقت میں اس شعورِ عینیت سے عبارت ہے، جو بدنی ذرات کے مکمل طور پر بدل جانے کے باوجود اسے برقرار رکھتا ہے۔

شعورِ عینیت کی ایک مثال

شعورِ عینیت کی حقیقت کو درست طور پر سمجھنے کے لیے نیند اور اس میں دکھائی دینے والے خوابوں سے رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ فرض کیجیے، آپ نہایت پُرسکون کمرے میں چارپائی پر دراز ہیں۔ آپ کو نیند آجاتی ہے اور آپ اس دوران یہ خواب دیکھتے ہیں کہ آپ نے کوئی جرم کیا ہے جس کی وجہ سے پولیس آپ کا تعاقب کر رہی ہے۔ اور وہ بالآخر آپ کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ پھر آپ دیکھتے ہیں کہ عدالت سے آپ کو کوڑوں کی سزا سنائی جارہی ہے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ آپ کو کوڑے لگائے جارہے ہیں۔ جیسے ہی کوڑا آپ کے جسم پر پڑتا ہے، آپ فرطِ تکلیف سے دوہرے ہو جاتے ہیں۔ اس تکلیف میں حلق خشک ہو جاتا ہے، جسم پسینے پسینے ہو جاتا ہے۔ آپ چیخنا چاہتے ہیں مگر آواز گلے میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ جب زیادہ تکلیف ہوتی ہے تو ایک زوردار چیخ بلند ہوتی ہے اور آپ کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ نہ آپ نے کوئی جرم کیا، نہ پولیس نے آپ کو پکڑا اور نہ سزا دی گئی۔ لیکن جسم پر لرزے کی کیفیت طاری ہے اور رونگٹے بھی کھڑے ہیں، بلکہ چیخ بھی فی الواقع آپ کے منہ سے نکل گئی۔

سوال یہ ہے کہ خواب کے دوران میں آپ کا جسم تو سلامت تھا، اس پر کوئی تکلیف وارد نہیں ہوئی مگر آپ خواب میں فرطِ تکلیف کی وجہ سے دوہرے

Marfat.com

ہوتے جا رہے تھے۔ جسم کے صحیح و سالم اور بستر پر محوِ خواب ہونے کے باوجود آپ نے تکلیف اور اذیت کا ذہنی اثر کیوں محسوس کیا؟ آپ پر یہ خوف کیوں طاری ہوا؟ آپ کا جسم پسینے میں کیوں اور کیسے نہا گیا؟ آپ کے جسم پر کپکپی کیوں طاری ہوئی؟ ظاہر ہے کہ تمام واردات کی ایک ہی وجہ اور ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے آپ کا شعورِ عینیت۔ کیونکہ جب آپ خواب کے دوران میں کرب والم کی خاص کیفیت سے گزر رہے تھے، اس وقت آپ کو قطعاً یہ احساس نہ تھا کہ جس جسم کو خواب میں سزا دی جا رہی ہے اور اس پر تکلیف وارد ہو رہی ہے، وہ کوئی دوسرا جسم ہے، اور حقیقی جسم چارپائی پر پڑا ہے۔ اگر خواب کے دوران شخصیت کی عینیت اور وحدتِ وجود کا یہ احساس نہ ہو، بلکہ جسموں کی ثنویت کا احساس ہو تو ایسی صورت میں خواب کے دوران میں بیتنے والی کیفیت کی کوئی علامت بھی لیٹے ہوئے شخص کو محسوس نہیں ہو سکتی

لیٹے ہوئے شخص پر سرور و فرحت یا رنج والم کی کیفیت اس بنا پر وارد ہوتی ہے کہ خواب میں شعورِ عینیت قائم رہتا ہے یعنی اصل جسم اور خواب میں دکھائی دینے والے جسم میں دوئی کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔

قبر میں دفنائے جانے والے شخص کی حالت

بعینہٖ اس شخص کی حالت اور کیفیت ہوتی ہے جسے قبر میں دفن کیا جاتا ہے۔ اس کے جسم کے مادی ذرات کو بلاشبہ مٹی کھا گئی، اس کی ہڈیوں کو زمین نے ختم کر دیا۔ بیشک اس کے جسمانی ذرات اور خلیوں میں سے کچھ نہ بچا، لیکن اس شخص کی روح تو باقی ہوتی ہے۔ وہ نہ فنا ہوئی اور نہ اسے مٹی نے نگلا ہے۔ مٹی انسانی جسم، بدنی ذرات اور خلیوں کو تو ختم کر سکتی ہے مگر روح اور اس میں پائے جانے والے احساسِ عینیت کو ختم نہیں کر سکتی۔ انسانی زندگی کا شعور اس کے جسم کی وجہ سے نہیں، اس کی روح کی وجہ سے موجود ہوتا ہے۔

Marfat.com

لہٰذا جسم انسانی کے گل سڑ جانے کے باوجود اس کی حقیقی شخصیت، اس کا شعور ذاتی اور اس کا ادراک نفس اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔ اور عالم برزخ میں اس کے بدن پر سزا و جزا کا جو سلسلہ مترتب ہوتا ہے، وہ اس کے ظاہری جسم اور مادی خلیوں پر نہیں بلکہ اس کی حقیقی اور اصلی شخصیت پر ہوتا ہے جو روح کے تشخص کے باعث مثالی جسم کی صورت میں موجود رہتی ہے۔ اسی طرح اگر جسم آگ میں جل گیا ہو یا سمندر میں ختم ہو گیا ہو، تب بھی اصل شخصیت باقی رہتی ہے جو جزا و سزا کے لیے کافی ہے۔

قبر اور برزخ کا حقیقی مفہوم

اگر کسی شخص کا یہ شعور عینیت بحال ہو تو اس کے مادی جسم کو خواہ قبر میں لٹایا گیا ہو، خواہ وہ آگ میں جل کر فنا ہو گیا ہو یا سمندر کی لہروں میں غرق ہو گیا ہو، یا جنگل کے شیروں اور چیتوں کے پیٹ میں چلا گیا ہو، اس کی اصلی اور حقیقی شخصیت ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ جوں کی توں باقی رہتی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا، مادی خلیوں سے تشکیل پانے والے ظاہری جسم پر ہوا۔ اگر جلے ہیں تو صرف جسمانی ذرات جلے ہیں اور سمندر میں غرق ہوئے ہیں تو فقط بدنی خلیات، مگر انسانی روح اور اس کا باطنی وجود اپنی جگہ درست، صحیح و سالم اور ہر نقصان سے محفوظ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حیات بعد الموت کا تعلق جسم کے خاکی ذرات کے ساتھ نہیں بلکہ اس کے باطنی تشخص اور روحانی تمثیل کے ساتھ ہے۔ اسی بنا پر اگر وہ جسم قبر میں پڑا ہو یا سمندر کی مچھلیوں کی خوراک بن چکا ہو، جل کر دھوئیں اور ہوا میں منتشر ہو گیا ہو یا اڑ کر پانی کی نذر ہو گیا ہو، پھر بھی وہ جسم وحدت اور عینیت کے شعور کے ساتھ قیامت کے دن تک قائم رہتا ہے۔ اسی بنا پر یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ قبر سے مراد وہ مخصوص گڑھا نہیں جہاں لاش کی تدفین ہوتی ہے، بلکہ اس سے مراد انسان کے حقیقی جسم کا وہ مسکن ہے جہاں اسے ٹھکانہ ملا ہو۔ اب خواہ اسے ٹھکانہ ہواؤں کے

Marfat.com

آغوش میں ملا ہو یا جنگلی درندوں کے پیٹ میں، خواہ زمین کے بطن میں ملا ہو یا پانیوں کی متلاطم امواج میں، جہاں کوئی مدفون ہو گیا وہی اس کی قبر قرار پائی۔ جب قیامِ قیامت کا اعلان ہو گا تو انسان اپنے حقیقی جسم کے ساتھ وحدت اور عینیت کا شعور لیے ہوئے اسی جگہ سے اٹھایا جائے گا۔ یہی اس کا 'بعث بعد الموت' ہو گا۔

شعورِ عینیت کی انسانی زندگی میں اہمیت

"شعورِ عینیت" حشر و نشر کا وہ جزوِ اعظم ہے کہ اگر یہ موجود نہ ہو تو سزا و جزا کا پورا نظام بیکار اور بے فائدہ ہو کر رہ جائے۔ یہ بات صرف اُخروی زندگی تک ہی محدود نہیں، خود ہماری موجودہ زندگی بھی اسی "احساس" کی محتاج ہے۔

اگر کسی شخص کو ایسا انجکشن لگا دیا جائے، جس سے اس میں موجود شعورِ نفسی اور احساسِ ذات ختم ہو جائے اور اس طرح اس میں الم یا سرور کی کیفیت کو محسوس کرنے کی قوت ہی مفلوج ہو کر رہ جائے تو اب آپ چاہیں تو اس کے بازوؤں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، اس پر چھریوں سے وار کریں، اس کا ایک ایک عضو کاٹ ڈالیں، اس کو تکلیف محسوس نہیں ہو گی۔ اسی لیے ڈاکٹر آپریشن سے پہلے مریض کو انجکشن دے کر اس کے جسم کو بے حس کر دیتے ہیں، جس کے بعد اس مریض پر چیرنے پھاڑنے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ کبھی آپ نے سوچا، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کاٹنے کے باوجود جسم کو اذیت محسوس نہ ہو؟ اس کی وجہ فقط یہی ہوتی ہے کہ انسانی جسم تو قائم رہتا ہے، مگر اس میں وہ شعور باقی نہیں رہتا جس سے تکلیف اور اذیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

انسانی زندگی حقیقت میں اس احساس اور شعور ہی سے عبارت ہے جس نے اس کے اندر تمام کیفیات کو زندہ کر رکھا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں یہ امر واضح کر دیا

Marfat.com

گویا کہ قیامت کے روز انسانی جسم کے اسی احساسِ عینیت کو بیدار کیا جائے گا۔ ارشاد ہوتا ہے:

فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا[1] پس وہ تم کو اچھی طرح آگاہ کر دے گا کہ تم کیا کام کرتے رہے ہو۔

یہ الفاظ اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اٹھایا جانا صرف جسم سے نہیں ہو گا بلکہ روح اور اس شعورِ عینیت کے ساتھ ہو گا جس سے انسان اپنے کیے دھرے کو بھی دیکھ رہا ہو گا اور اس کی جزا و سزا کی فرحت و تکلیف بھی محسوس کر رہا ہو گا۔

اعمال نامے تھمائے جانے کا تصور

اسی بنا پر یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ قیامت کے روز ہر نیکوکار شخص کو اس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائیگا جبکہ بدکار کو اُسکا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں۔ اُن کے سامنے ان کی گزشتہ زندگی کا ایک ایک لمحہ ہو گا انہیں اپنے جرم کی ایک ایک واردات ازبر ہوگی۔ انہیں احساس ہو گا کہ وہ جس جرم کو رات کی تاریکیوں میں دنیا کی نگاہوں سے چھپ کر کیا کرتے تھے۔ آج وہ پوری طرح بے نقاب ہو چکا ہے۔ آج وہ لمحے اور وہ گھڑیاں ان کے خلاف شہادت دے رہی ہیں کہ کس ماحول میں انہوں نے جرم کیا تھا۔ وہ ماحول بلکہ خود ان کا پورا جسمانی نظام انہیں مجرم ٹھہرا رہا ہو گا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

بہر حال انسان میں یہ شعورِ عینیت اور احساسِ وحدتِ شخصیت ہو گا تو اسے

---

[1] النور (۲۴: ۶۴)

Marfat.com

بعز او سزا دی جا سکے گی ورنہ اس کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔

اسی جسم سے زندہ کیا جانا

بہ ترسہ اشکال کے جواب کا ایک رُخ تھا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ذات شعور بعینیت کے ساتھ ساتھ انسان کو قبر سے من وعن اسی جسم کے ساتھ اُٹھانے پر بھی قادر ہے جس جسم پر موت وارد ہوئی تھی، خواہ اس کا ایک ذرہ بھی ظاہراً باقی نہ رہا ہو۔ اور قیامت کے دن باری تعالیٰ کی اسی قدرتِ مطلقہ کا ظہورِ عام ہوگا۔ قرآنِ حکیم اس امر کو یوں واضح کرتا ہے:

إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ [1]

اگر تمہیں مرنے کے بعد جی اُٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے پہلے بھی تمہیں مٹی سے پیدا کیا ہے۔

لہٰذا جو ذات انسان کی پہلی تخلیق مٹی سے کر سکتی ہے وہ اس کی نشأۃ ثانیہ مٹی یا کسی اور چیز سے کیوں نہیں کر سکتی ہے

مزید فرمایا:

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ [2]

اس نے کہا کہ کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا جب کہ وہ بوسیدہ ہو چکی ہوں گی۔ فرما دیں، ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی بار انہیں زندگی بخشی تھی۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

---

١ الحج (٢٢ ، ٥)

٢ یٰس (٣٦ ، ٧٨ - ٧٩)

Marfat.com

قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْحَدِيْدًا اَوْخَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِیْ صُدُوْرِكُمْ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا قُلِ الَّذِیْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ [1]

ان سے کہو خواہ تم پتھر بن جاؤ یا لوہا یا کوئی ایسی چیز جس کا زندہ ہونا تمہارے خیال میں ناممکن ہو، پھر وہ پوچھیں کہ ہمیں دوبارہ کون زندہ کرے گا ؟ تو کہہ دو کہ وہی جس نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا۔

ان تمام آیات میں ایک ہی حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ انسان کی پہلی تخلیق جو عدم سے وجود میں لانے کا اہتمام تھا اگر باری تعالیٰ پر مشکل نہیں تو بعد از مرگ وانتشارِ ذرات، انہیں پھر جمع کر دینا اور زندہ کر کے اٹھانا کیونکر مشکل ہوگا۔ کیونکہ پہلی تخلیق سے قبل تو کچھ بھی نہیں تھا۔ جب کہ اس مرتبہ صرف جسم ہی ناپید ہوا ہے، شخصیت کے باقی پہلو (مثلاً روح وغیرہ) تو موجود ہیں۔ اگر سب کچھ ختم ہو جانے کے بعد ذات حق تخلیق پر قادر نہ ہوتی تو ہمیں پہلا وجودِ خلقت بھی نصیب نہ ہوا ہوتا۔ اگر ہمیں پہلی مرتبہ عدمِ محض سے تخلیق کر لیا گیا ہے تو یقین کر لینا چاہیے کہ ہمیں بعد از مرگ بھی زندہ کرنا اور روزِ قیامت کو دوبارہ اٹھانا اس قادرِ مطلق اور خلاقِ اعظم کے لیے دشوار نہ ہوگا۔

---

[1] بنی اسرائیل (۱۷: ۵۰۔۵۱)

Marfat.com

باب پنجم

ایمان بالآخرت

اور

قرآنی استدلال

Marfat.com

Marfat.com

قرآنِ حکیم نے آخرت کی زندگی پر جو دلائل قائم کیے ہیں، ان کا اسلوب ہر موقع پر منفرد ہے جس سے قاری ہر بار نئی لذت اور نئی تازگی پاتا ہے۔ ان تمام دلائل کی مجموعی تعداد تو سینکڑوں سے متجاوز ہے، جن کا استقصاء اس مختصر کتاب میں ممکن نہیں۔ البتہ ان تمام دلائل کو ہم تین بنیادی اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) ارتقائے حیات کا قرآنی تصور اور عقیدۂ آخرت

(۲) نظامِ کائنات کی بقا اور تصورِ آخرت

(۳) قانونِ مکافاتِ عمل اور تصورِ آخرت

(۱) ارتقائے حیات کا قرآنی تصور اور عقیدۂ آخرت

ایمان بالآخرت کے سلسلے میں قرآنِ کریم ارتقائے حیاتِ انسانی کا ایک مخصوص نظریہ پیش کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ	بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا
حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ	وقت بھی گزر چکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر
يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا [۱]	چیز نہ تھا۔

گویا انسانی زندگی کا آغاز عدمِ محض کی حالت سے ہوا، یعنی اس وقت سے جب

---

[۱] الدھر (۷۶: ۱)

برائے نام بھی کوئی انسانی وجود نہ تھا بلکہ خود کائنات کا نشان تک نہ تھا، زندگی کے کوئی آثار نہ تھے، ہستیٔ باری تعالیٰ کے سوا ہر چیز نیست اور عدم محض تھی۔ پھر یہ کائنات رفتہ رفتہ کئی تدریجی مراحل میں تخلیق کی گئی۔

کائنات کے تخلیقی مراحل

ارشادِ باری ہے،

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ [1]

اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے فرما دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔

حالتِ عدم حالتِ وجود میں بدلی اور موت حیات کی سمت بڑھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ سفر کیسے طے ہوا۔ اس سلسلے میں مندرجہ بالا آیت کے دو الفاظ قابلِ غور ہیں:

"أَرَادَ" اور "شَيْئًا"

حرفِ کُن سے پہلے کیا تھا

اس آیت میں لفظ "شیٔ" آیا ہے جو شَاءَ یَشِیْءُ یعنی چاہنا سے مشتق ہے۔ شیٔ (جو اصل میں شَیِیْءٌ بروزن فعیلٌ تھا) کے معنی ہیں وہ چیز جسے چاہا گیا، جس کا ارادہ کیا گیا۔ گویا اس وجود کو جس کے پیدا کرنے کا خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا، شیٔ کہا جاتا ہے۔ بظاہر اس آیت میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ یعنی اراد (اس نے ارادہ کیا) اور شیٔ (جسے چاہا گیا)، ہم معنی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ جب کچھ بھی موجود نہ تھا، ہر چیز عدم کے پردے میں مستور تھی، اس وقت شیٔ کا کوئی وجود ہی نہ تھا، تو پھر اللہ تعالیٰ نے "شیٔ" کا ارادہ کیسے کیا؟ نیز یہ کہ

---

[1] یٰسٓ (۳۶ : ۸۲)

Marfat.com

جب سرے سے کوئی چیز ہی موجود نہیں تھی تو پھر عدم کی حالت میں یہ حکم کیسے دیا گیا کہ ہو جا اور یہ حکم کس کو دیا گیا؟ کیونکہ ہر حکم کے لیے محکوم علیہ کا ہونا ضروری ہے جسے مخاطب کہا جاتا ہے۔ سائنس دان اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ کائنات میں کوئی وقت ایسا بھی آیا ہو جب خدا کی ذات کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی۔

اس اشکال کا صحیح جواب

غور کیا جائے تو دونوں سوالات کا جواب اسی آیت میں موجود ہے، کیونکہ اس میں "اَرَادَ" کے بعد لفظ "شئ" آیا ہے اور شئ کا معنی ہے "وہ چیز جس کا ارادہ کیا گیا"۔ ارادہ ایک ذہنی عمل ہے۔ اللہ رب العزت جسم اور جسمانی عمل یا ذہن اور ذہنی عمل وغیرہ سے پاک ہے، لیکن محض اس مسئلے کو سمجھانے کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ یوں سمجھیں جب اللہ رب العزت نے اس کائنات کو تخلیق کرنا چاہا تو اس وقت ظاہر میں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کچھ بھی موجود نہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کائنات کا اور اس میں پیدا کی جانے والی اشیاء و موجودات کا مکمل نقشہ اور خاکہ موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ اسے کیا چیز پیدا کرنی ہے اور کس شکل وصورت پر پیدا کرنی ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں موجود تخلیق کے اس خاکے اور نقشے کو جسے صورِ اجمالی کہا جا سکتا ہے، جب خارجی وجود دینا چاہا تو وہ ذہنی "شئ" قرار پا گیا اور اسے یہ امر کیا گیا کہ ہو جاؤ۔ پس وہ نقشۂ تخلیق اور خاکہ وجود عالم خارج میں شکل پذیر ہو گیا۔ اسی توجہِ الٰہی کا نام "امرِ کُن" تھا۔

حرفِ کُن تکوینیات میں سے ہے۔ جس کا مطلب ظاہری حکم اور امر نہیں، بلکہ ذاتِ باری کی توجہ اور عنایت ہے۔

بہر حال خدا تعالیٰ نے اس کائنات کی مختلف مخلوقات کے وجودِ علمی کو جب اپنی خاص توجہ کا مرکز بنایا اور ارادۂ تخلیق کی عنایات اس پہ مرکوز کیں، تو اسے دو صفات عطا فرما دیں:

(۱) صفتِ استمرار (۲) صفتِ منظوریت

(۱) صفتِ استمرار (PERSISTENCE) جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس شئ

Marfat.com

یعنی علمی وجود کو اللہ تعالیٰ نے ظاہری وجود میں متشکل کر کے باقی رہنے کی قوت بخش دی ہے۔

۲۔ منظوریت (OBJECTIVITY) اسکا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی اس چیز کو دیکھنا چاہے تو اسے دیکھ سکے یعنی وہ وجود عالم خارج میں قائم بھی رہے اور دیکھنے والے کو دکھائی بھی دے۔

سائنس کا نظریہ

یوں کائنات کو ظاہری اور ابتدائی وجود (FIRST PHYSICAL EXISTENCE) تو مل گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ابتدائی تخلیق کیا جانے والا وجود کیا تھا؟ علم حیاتیات (سائنس آف بیالوجی) کا خیال ہے کہ اس کائنات کا آغاز کسی "UNICELLUR" وجود سے ہوا، وہ وجود صرف ایک خلیے (cell) پر مشتمل تھا یعنی مطلق وحدت کا آئینہ دار تھا۔ سائنس میں اس وجود کی زیادہ صراحت نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وجود، جو وحدتِ الٰہی کا آئینہ دار تھا، جس سے تخلیقِ کائنات کا آغاز ہوا اور جو باری تعالیٰ کے پہلے ارادہ تخلیق کا پرتو قرار پایا، نورِ محمدی تھا۔ جیسا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اول ما خلق اللہ نوری ۱ — سب سے پہلے میرا نور پیدا کیا گیا۔

یہاں سے اس کائنات کا رفتہ رفتہ آغاز ہوا۔ اس کے بعد کائنات کی تخلیق کا عمل تسلسل اور تدریج سے جاری رہا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنی اولین تخلیق نورِ محمدی علیہ التحیۃ والسلام کو قرار دیا اور آپ کے نور کی تخلیق سے اس دنیائے ہست و بود کا باقاعدہ آغاز کیا۔

---

۱ مدارج النبوۃ، شیخ عبد الحق محدث دہلوی ج ۲ ص ۳

Marfat.com

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا ؛

یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم بابی انت و امی - اخبرنی عن اول شئ خلقہ اللہ

یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں - بتائیے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے کون سی چیز پیدا کی -

اس پر آپ نے ارشاد فرمایا ؛

ان اللہ خلق قبل الاشیاء نور نبیک من نورہ فجعل ذالک النور یدور بالقدرۃ حیث شاء اللہ تعالیٰ و لم یکن فی ذالك الوقت لوح ولا قلم ولا جنۃ ولا نار ولا ملك ولا سماء ولا ارض ولا شمس ولا قمر و لا جن ولا انس [1]

بیشک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز سے پہلے تیرے نبی کا نور اپنے نور کے براہِ راست فیضان سے پیدا کیا - پھر وہ نور قدرتِ الٰہیہ سے، جہاں اللہ کو منظور ہوا سیر کرتا رہا - اس وقت نہ لوح تھی، نہ قلم، نہ بہشت تھی، نہ دوزخ، نہ فرشتہ تھا، نہ آسمان، نہ زمین تھی، نہ سورج، نہ چاند تھا نہ جن تھا اور نہ انسان -

اسی حدیث میں اس کی مزید وضاحت آتی ہے ؛

کہ جب میرا نور پیدا کیا جا چکا تو اس سے اللہ تعالیٰ نے قلم کو تخلیق کیا، اسی سے لوحِ محفوظ کو پیدا کیا، اسی سے پھر عرش کو اور علیٰ ہٰذا القیاس دیگر موجودات کو ... الیٰ آخر الحدیث -

---

[1] مصنف عبدالرزاق بحوالہ المواہب اللدنیہ - امام قسطلانی ج ۱ ص ۹ -

Marfat.com

قرآن مجید کی درج ذیل آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ [1]	کہیے کہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب کچھ خدائے رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلا مسلمان ہوں۔

اس آیت مبارکہ میں جملہ "و انا اول المسلمین" (میں تیرے سامنے سب سے پہلے گردنِ اطاعت جھکانے والا ہوں) سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی ذات اس کائنات کی سب سے پہلی مخلوق تھی۔ اسی لیے آپ کو سب سے پہلا مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ جس کی وجہ خود قرآنِ حکیم میں دوسرے مقام پر بیان کی گئی ہے :

اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا [2]	تمام مخلوقات جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، سب خدا کے روبرو بندے ہو کر آئیں گی۔

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا :

کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلٰوتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ [3]	کائنات کی ہر شے کو اپنی عبادتِ الٰہی اور اپنی تسبیح کا علم ہے۔

---

[1] الانعام (۶ : ۱۶۲ تا ۱۶۳)

[2] مریم (۱۹ : ۹۳)

[3] النور (۲۴ : ۴۱)

Marfat.com

جب ہر مخلوق خدا کی بندگی پر متعین ہے اور اس کائنات کا ہر وجود اپنے اپنے حسب حال اللہ کی بارگاہ میں گردنِ اطاعت جھکا رہا ہے۔ تو اس بدیہی حقیقت کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ کہ اگر آپ سے پہلے کوئی اور وجود تخلیق پذیر ہو گیا ہوتا تو لازمی طور پر وہ خدا کے سامنے پہلے جھکنے اور اطاعت بجالانے کا شرف حاصل کر چکا ہوتا۔ پھر آپ کے متعلق اس تصریح کی گنجائش کہاں باقی رہ جاتی کہ آپ ربّ ذوالجلال کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے اولیں وجود تھے۔

بہرحال حضور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس سے باقاعدہ طور پر تخلیق کائنات کا آغاز ہو گیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے امرِ کُن سے عالمِ طبیعی (PHYSICAL WORLD) کو پیدا کیا جس میں لوح، قلم اور عرش و کرسی سمیت ہزاروں، کروڑوں اشیا شامل ہیں۔

عالمِ غیر نامی سے عالمِ نامی کی طرف

تاہم کائنات کی اشیا اولاً عالمِ غیر نامی کی صورت میں تخلیق کی گئیں۔ چنانچہ سائنس کی اصطلاح کے مطابق INORGANIC WORLD وجود میں آگئی۔ یہ وہ موجودات ہیں جن میں نشوونما پانے، حرکت اور انجذاب وغیرہ کی صلاحیتیں مفقود ہوتی ہیں۔ یہ اشیا جامد و ساکت حالت میں موجود رہتی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے "عالمِ غیر نامی" کو اپنے امرِ کُن کی توجہ سے صفتِ نشوونما عطا فرمادی اور ان میں حرکت پذیری، انجذاب اور نشوونما وغیرہ کی صلاحیت پیدا کر دی۔ اس سے عالمِ نامی (ORGANIC WORLD) کو وجود مل گیا۔

عالمِ نامی کے اوصاف

عالمِ نامی، اشیاءِ کائنات کی وہ حالت ہے جس میں وہ کسی چیز کو اپنے اندر جذب کر سکتی ہیں، کسی چیز کو اپنے اندر

Marfat.com

سے خارج بھی کر سکتی ہیں، اور اپنے تکمیلی مراحل طے کر لینے کے لیے حرکت پذیر بھی ہو سکتی ہیں۔ اسے ہم نباتاتی زندگی کے نام سے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اب کائنات کو اصل زندگی کا سُراغ مل گیا اور اس کے پہلوؤں میں ظاہری طور پر بھی حقیقی زندگی پرورش پانے لگی۔

لیکن اس عالمِ نامی (ORGANIC WORLD) کو شعور و آگہی حاصل نہ تھی۔ یہ عالم نباتات تھا۔ اب اللہ ربُّ العزت نے عالمِ نامی کو اگلے مرحلۂ تخلیق میں داخل کیا، جہاں اسے شعور (CONSCIOUSNESS) کی صفت سے نوازا گیا۔

عالمِ حیوانات کی تخلیق

اس شعور کے حاصل ہونے پر عالمِ نامی سے عالمِ حیوانات وجود میں آگیا اور یوں عالمِ نباتات کے بعد عالمِ حیوانات (ANIMAL WORLD) کی تخلیق معرضِ عمل میں آئی اور مختلف قسم کی حیوانی زندگی سینۂ کائنات پر پنپنے لگی۔ یہ سب کچھ پہلے سے طے شدہ اور پہلے سے مرتب کردہ منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ یہ سوچی سمجھی سکیم تھی، محض بے مقصد اور بے جان عمل نہ تھا، جیسا کہ بعض مادہ پرست ذہن اس ارتقا کو محض اتفاق و حادثہ قرار دیتے ہیں۔

ادھر آسمانی دنیا میں فرشتوں کی تخلیق کی جا رہی تھی۔ زمینی دنیا پر قسم قسم کی حیواناتی مخلوق کے علاوہ جنات کو پیدا کیا گیا، مگر یہاں کی حیوانی زندگی کو شعور و ادراک کی بھرپور صلاحیتیں حاصل نہ تھیں۔ ہاں ایک ابتدائی قسم کا شعور انہیں ضرور حاصل تھا۔

Marfat.com

عالمِ انسانی کی تخلیق

خلاقِ اعظم نے اپنی خلاقانہ صفات کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک طرف آسمانی مخلوق یعنی فرشتوں کو تخلیق کر دیا اور دوسری طرف دنیا میں متنوع قسم کی حیوانانی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک لطیف قسم کی جناتی زندگی کو مکمل فرمالیا اور مختلف عناصرِ وجود کو

باہم ملا کر حسین وجمیل کائنات کی یہ محفل منصۂ شہود پر برپا کر دی

باہم ملا جلا کر یہ پوری کائنات اپنی موجودہ حسین وجمیل صورت میں منصۂ شہود پر برپا کر دی۔ اب یہ موقع تھا کہ دنیائے حیوانیت کو خود شعوری اور خود آگہی کی صفت عطا کر کے کائناتِ ارضی کی زندگی کو اپنے درجۂ کمال پر پہنچا دیا جائے۔ یہ تخلیق کا آخری درجہ تھا جو حضرتِ انسان کے معرضِ وجود میں لائے جانے سے عبارت تھا۔ انسان یہ صحیح معنوں میں خدا تعالیٰ کی صناعی اور خلاقیت کا مظہرِ اتم ہونے کے ساتھ ساتھ اس دنیائے بحر و بر کا حکمران اور بادشاہ بھی ہے [۱]

---

[۱] قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اللہ رب العزت نے بنی نوع انسان کی تخلیق سے پہلے فرشتوں اور جنات نیز مختلف الانواع کے جانوروں کی تخلیق مکمل کر لی تھی۔ گویا پوری کائنات یعنی چاند ستارے، سیارے، جنگل، درخت اور طرح طرح کے چرند و پرند اپنے مخدوم و مطاع انسان کی خدمت کے لیے تیار کیے جا چکے تھے۔ جب یہ عمل مکمل ہو گیا تو اب اللہ رب العزت نے نائب خداوندی یعنی حضرتِ انسان کی تخلیق فرمائی۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات کو اپنے حرفِ کن سے تخلیق فرمایا مگر حضرتِ انسان خدا کی واحد مخلوق ہے جس کے متعلق یہ صراحت کی گئی ہے کہ:

لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (ص، ۳۸: ۷۵) میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا۔

یہ خاص اہتمام صرف انسان کی تخلیق کے لیے کیا گیا۔

Marfat.com

انسانی زندگی میں پیش آنے والے مرحلے

انسانی زندگی کائنات کی دیگر اشیا کی زندگیوں سے ارتقا کے اعتبار سے مختلف ہے۔ اس زندگی پر کئی مرحلے آئے، اسے موت وحیات کے کئی ادوار میں سے گزارا گیا۔ اس سلسلے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ [1]

آپ فرما دیجیے کہ زمین کی سیر کرو اور دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح آفرینش کی ابتدا کی، پھر وہی اللہ چیزوں کو دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔ یقیناً اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

ایک مقام پر یوں ارشاد ہے:

تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ [2]

اے اللہ! تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے۔

کبھی تو زندگی میں حیات کا مرحلہ آیا اور کبھی موت کا، لیکن نہ حیات انسان کی زندگی کی آخری منزل تھی اور نہ موت اس کی آخری کڑی ہوگی۔

ابتداً اسے عالمِ ارواح میں سے شکمِ مادر میں منتقل کیا گیا، جہاں ایک خاص عرصہ گزار لینے اور نشوونما کے ابتدائی مرحلے مکمل کر لینے کے بعد اسے عالمِ شہادت کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس سے انسان موجودہ حالت میں گزر رہا ہے۔ اس

---

[1] العنکبوت (۲۹: ۲۰)

[2] آل عمران (۳: ۲۷)

Marfat.com

مرحلے کے اختتام پر پھر ایک موت آنے والی ہے۔ یہی وہ موت ہے جس کے بعد کی زندگی حیاتِ برزخی کہلاتی ہے اور اس کا اختتام جس زندگی پر ہو گا، اسے حیاتِ آخرت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم انہی مختلف مراحلِ حیات اور مراتبِ وجود کے حوالے سے اعلان کرتا ہے:

اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی [1]	جس خدا نے تمہیں اِن مراحل سے گزارا ہے، کیا وہ اِس بات پر قادر نہیں ہے کہ مُردوں کو جلا اُٹھائے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ [2]	بھلا جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، کیا وہ اِس بات پر قادر نہیں کہ پھر ویسے ہی پیدا کر دے۔ کیوں نہیں، وہ تو بڑا پیدا کرنے والا اور علم والا ہے۔

کائنات کی زندگی کے آغاز اور ارتقا کی اسی دلیل کو بنیاد ٹھہراتے ہوئے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ ۚ اَحْیَیْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ یَاْكُلُوْنَ [3]	اور ان کے لیے ایک دلیل تو مردہ زمین کی ہے جس کو ہم نے زندگی بخشی اور اس میں سے غلّہ نکالا۔ پس اسی سے لوگ کھاتے ہیں۔

---

[1] القیامۃ (۷۵ : ۴۰)

[2] یٰسٓ (۳۶ : ۸۱)

[3] یٰسٓ (۳۶ : ۳۳)

Marfat.com

مزید ارشاد ہے:

فَانْظُرْ اِلٰٓی اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰہِ کَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا اِنَّ ذٰلِکَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰی وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ [1]

پس اللہ تعالیٰ کی رحمت کے آثار دیکھیے وہ کس طرح زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً وہ ضرور مُردوں کو بھی زندگی عطا کرنے والا ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسی تصور کو ایک جگہ یوں واضح کیا گیا ہے:

وَاللّٰہُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰہُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا ؕ کَذٰلِکَ النُّشُوْرُ [2]

اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو چلاتا ہے، پھر وہ ہوائیں بادلوں کو اُبھارتی ہیں۔ پھر ہم ان بادلوں کو ایسی بستی کی طرف لے جاتے ہیں جو مردہ (یعنی بے آب و گیاہ) ہو۔ پھر اس مردہ زمین کو موت کے بعد بارش کے ذریعے زندہ کر دیتے ہیں۔ بس ایسا ہی قیامت کے دن جی اُٹھنا ہو گا۔

حیاتِ کائنات معرضِ ارتقا میں ہے

گویا قرآنِ کریم اس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ حیاتِ کائنات مسلسل

---

[1] الروم (۳۰: ۵۰)

[2] فاطر (۳۵: ۹)

Marfat.com

معرضِ ارتقا میں ہے۔ اس پر کبھی دائمی جمود اور تعطل طاری نہیں ہوا۔ زندگی تو نام ہی مسلسل حرکت پذیری کا ہے جس طرح کائنات کروڑوں برس کے ارتقائی سفر میں مختلف رنگوں اور زاویوں سمیت مسلسل ترقی پذیر رہی ہے۔ اسی طرح حیاتِ انسانی کا ارتقائی سفر بھی اس بات کا مقتضی ہے کہ موت حیاتِ انسانی کو کلی طور پر فنا نہ کر سکے لہٰذا موت کے بعد پھر ایک نئی زندگی شروع ہوگی جسے حیاتِ برزخی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اسی طرح حیاتِ برزخی کے اختتام پر حیاتِ انسانی کا ایک اور دور شروع ہوگا جو حیاتِ انسانی کے سفرِ ارتقاء کا نقطۂ کمال ہوگا۔ قرآن حکیم میں ایک مقام پر تصورِ آخرت کا استدلال کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:-

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ [1]

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بے فائدہ پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے۔

"تُرْجَعُوْنَ" سے اس امر کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جس کائنات کا آغاز اتنے اہتمام سے ہوا ہو، جس کائنات میں زندگی متعدد مراحل طے کر کے اس منزل تک پہنچی ہو، جہاں کئی مرتبہ زندگی سے موت نکلی ہو اور کئی دفعہ موت سے زندگی نکلی ہو، وہاں انسانی زندگی کا یہ ارتقا ارضی اور طبعی موت پر جا کر یوں ختم ہو جائے کہ اس کے بعد نہ کسی کا مٹی سے اُٹھنا واقع ہو اور نہ کسی کا حساب و کتاب ——— پھر تو یہ سارا نظامِ کائنات درہم برہم ہو کے رہ جاتا ہے۔ کیونکہ ایک مربوط و مستحکم نظامِ کائنات حیات کے بامقصد اختتام کا مقتضی ہے۔ اگر کائناتِ حیات کسی مقصد پر منتہی نہیں ہوتی تو پھر زندگی کی تمام تگ و دو اور خلاقِ کائنات کی یہ تمام صناعی اور خلاقی

---

[1] المومنون (۲۳ : ۱۱۵)

Marfat.com

(معاذ اللہ) بے معنی ہو کے رہ جاتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا [1]

اے ہمارے رب! تو نے اس کائنات کو بے مقصد اور بے سود پیدا نہیں کیا۔

(۲) نظامِ کائنات کی بقا اور تصوّرِ آخرت

ارتقاءِ حیات کے حوالے سے قرآنی استدلال کی بات کی جا چکی ہے اسی ضمن میں قرآن مجید نظامِ کائنات کی بقا سے بھی تصوّرِ آخرت پر استدلال کرتا ہے وہ یوں کہ:

قدرت نے خدا جانے کتنے کروڑوں، بلکہ اربوں برسوں کے بعد زمین کو جلتے ہوئے سورج کی حرکت کے دائرے سے خارج کیا، پھر کروڑوں سال میں دہکتی ہوئی زمین کو ٹھنڈا کیا [2]۔ اور جب اس کا سینہ زندگی کے آثار کے قابل ہو گیا تو ابتداءً

---

[1] آل عمران (۳ : ۱۹۱)

[2] قرآنِ کریم تخلیقِ کائنات کی مدت بیان کرنے سے سکوت اختیار کیے ہوئے ہے، البتہ ایک دو مقام پر یہ صراحت کی گئی ہے کہ تخلیقِ کائنات کا یہ عمل چھ یوم میں پایۂ تکمیل کو پہنچا (الحدید ۵۷ : ۴) الفرقان (۲۵ : ۵۹)، السجدہ (۳۲ : ۴) ق (۵۰ : ۳۸)، مگر اس زمانے میں نہ سورج تھا نہ چاند اور نہ ہی کوئی اور سیارہ اور ستارہ جس کی گردش سے دن کی تعیین کی جا سکتی۔ البتہ سورۂ معارج (۷۰ : ۴) میں قیامت کے ایک دن کو ۵۰ ہزار برسوں کے برابر قرار دیا گیا ہے جس سے یہ ثابت ہوا کہ ایک دن سے مراد صرف ۲۴ گھنٹوں کا دن ہی نہیں بلکہ زمانۂ طویل بھی ہو سکتا ہے۔ ۵۰ ہزار سال کی مدت کو تو یومِ حشر قرار دیا گیا ہے، تخلیقِ کائنات کے عمل کے لیے خدا جانے کتنے لاکھوں کروڑوں سال صرف ہوئے ہوں گے جسے قرآن "خلق السمٰوٰت والارض و ما بینہما فی ستۃ ایام" سے تعبیر کر رہا ہے۔

Marfat.com

جمادات کی صورت میں، پھر نباتات، پھر حیوانات اور سب سے آخر میں انسانی زندگی کی صورت میں یہاں "حیات" کو پیدا کیا۔ پھر انسانی زندگی کو اعلیٰ مراتب حیات سے روشناس کرانے کے لیے انبیاء ورسل مبعوث کیے اور انسانی فکر کو الہامِ غیبی سے مدد پہنچائی جاتی رہی۔ انسانی زندگی کے رہن سہن کے لیے اس کائنات کے لیل ونہار کو شمس و قمر کے ایک وسیع اور مربوط نظام کے ساتھ پابند کر دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ [1]

اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ خدائے غالب و دانا کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کی ہیں، یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج کے لیے ممکن ہے کہ چاند کو پکڑے اور نہ ہی رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ سب سیارے اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

نیز فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ

یہ اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمانوں سے پانی برسایا۔ پھر اس کی تاثیر سے تمہاری غذا کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا

---

[1] یٰس (۳۶) ۳۸-۴۰۔

Marfat.com

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ۔[1]

کیے۔ اسی طرح سمندروں میں جہاز تمہارے زیرِ فرمان کر دیے کہ اُس کے حکم سے تمہاری منفعت کے لیے چلتے رہتے ہیں۔ دریا بھی تمہاری کاربرآریوں کے لیے مسخر کر دیے۔ سورج اور چاند بھی تمہارے لیے مسخر کر دیے ہیں کہ ایک خاص ڈگر پر گردش میں رہیں اور رات اور دن بھی تمہارے فائدے کے لیے مسخر کیے۔ غرضیکہ جو کچھ مطلوب تھا، وہ سب کچھ اس نے تمہیں عطا کر دیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتیں شمار کرنا چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ ہرگز شمار نہ کر سکو گے۔ بلاشبہ انسان بڑا ہی ناانصاف، بڑا ہی ناشکرا ہے۔

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے سیاروں اور ستاروں کو خاص راستوں پر گامزن کر دیا، چاند کو خاص منزلیں عطا کر دیں اور پھر سورج کے طلوع و غروب کے حوالے سے اوقات کو تقسیم کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ گرمی اور سردی، بہار اور خزاں کے موسم تخلیق فرمائے مختلف ہوائیں چلائیں۔ کہیں خشکی اور کہیں تری یعنی زمین اور سمندر کی تہہ بچھا دی، آسمان کو بلا ستون چھت کی طرح معلق کر دیا۔ پھر زمین میں غذا اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کیلئے طرح طرح کے غلّے، سبزیاں اور پھل وغیرہ پیدا کیے۔ الغرض یہ سب کچھ کس

---

[1] ابراہیم (۱۴: ۳۲-۳۴)

Marfat.com

لیے پیدا کیا گیا اور کس کے لیے باقی رکھا گیا؟ صرف اور صرف انسان کے لیے پوری کائنات کو انسان ہی کے تابع کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ؕ[1] — اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو ہم نے تمہارے تابع کر دیا۔

اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ جس انسان کے لیے کائنات کا ایک ایک ذرہ فرش راہ کیا گیا ہو، ایک ایک شے اس کے تابع فرمان کر دی گئی ہو، اس کی زندگی کی تمہید تو کروڑہا برس پر مشتمل ہو، مگر خود انسان کی اپنی عمر ساٹھ، ستر برس کے بعد یوں ختم کر دی جائے کہ گویا وہ کبھی آیا ہی نہ تھا۔ نیز یہ کہ وہ پوری کائنات کا مخدوم و متاع اور متصرف ہونے کے باوجود بغیر حساب وکتاب کے چھوڑ دیا جائے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ؕ[2] — کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔

نیز کائنات کو اس کے تابع کر دیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا ؕ[3] — وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں، اسے بنی نوع انسان! تمہارے لیے پیدا کیں۔

---

[1] الجاثیہ (۴۵ : ۱۳)

[2] القیامۃ (۷۵ : ۳۶)

[3] البقرہ (۲ : ۲۹)

Marfat.com

کیا عقل اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ پوری کائنات کی نعمتوں سے استفادہ کرنے والا بغیر پوچھ گچھ کے ختم ہو جائے اور کوئی اس سے جواب طلبی تک نہ کرے۔ اگر یہی بات ہے تو آخر اس نظام حیات کا کیا فلسفہ اور حکمت باقی رہ جاتی ہے۔ قرآن اس امر کی وضاحت کر رہا ہے کہ جس خدا نے انسان کو زندگی دی، پوری کائنات کو اس کے تابع اور زیرِ تصرّف کیا، اسے اچھے اور بُرے کا شعور بخشا، ہر اعتبار سے اس کی زندگی کو بامقصد بنایا پس یہ اپنے اعمال اور اختیارات کے محاسبے سے بھلا کیسے اور کیونکر بچ سکتا ہے۔ ایک دوسری جگہ اسی پہلو کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ [1]

تو اس وقت کیا حال ہوگا جس روز ہم ان کو جمع کریں گے۔ اس روز کے آنے میں کچھ شک نہیں۔ اور ہر نفس اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

قرآن کریم میں ایک مقام پر کائنات کی قسم کھا کر تصوّرِ آخرت پہ استدلال کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ [2]

آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی قسم! روزِ قیامت اور آخرت کا آنا اسی طرح قابلِ یقین، یعنی مبنی بر حق ہے، جس طرح تم بات کرتے ہو۔

---

[1] آل عمران (۳ : ۲۵)

[2] الذاریات (۵۱ : ۲۳)

Marfat.com

جس طرح کسی شخص کا بولنا اس کی قوتِ گویائی اور قوتِ نطق کی دلیل ہے، اسی طرح اس کائنات کا ہونا اور اس کائنات کے خالق اور پروردگار کا موجود ہونا، آخرت اور جزاو سزا پر مبنی زندگی کی دلیل ہے۔

اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اتنے وسیع و عریض اور جامع نظامِ کائنات کا ایک ایک وجود صرف اور صرف انسان کے لیے تخلیق کیا گیا ہے اور اسی کے لیے باقی ہے، مگر یہ امر ناقابلِ یقین ہے کہ انسان فانی ہو اور موت کے بعد اس کی زندگی کا کوئی پہلو باقی نہ رہے جبکہ باقی ساری کائنات اس کی خاطر باقی رہے۔ یعنی مقصود بغیر کسی نتیجہ خیز انجام کے ختم ہو جائے اور ذریعہ ہمیشہ باقی رہے۔

لہٰذا اس نظامِ کائنات کا باقی رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان بھی کسی نہ کسی صورت میں اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اس کائنات کی زندگی موجود ہے۔ مزید یہ کہ چونکہ کائنات کا نظام بامقصد ہے اس لیے انسان کی زندگی اور موت دونوں بامقصد ہیں۔ اس کا جینا بھی ایک مقصد کے لیے ہے اور مرنا بھی ایک مقصد کے لیے ہے۔

(۳) قانونِ مکافاتِ عمل اور عقیدۂ آخرت

قانونِ مکافات کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے فطرت کے ہر گوشے میں عمل (ACTION) اور ردِ عمل (REACTION) کی صورت میں ہر انسانی عمل اور اس کی جزاو سزا کا ایک وسیع نظام برپا کیا ہوا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی عمل تو ہو مگر اس پر اس کا نتیجہ مرتب نہ ہو۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ پانی پئیں، مگر اس کی ٹھنڈک آپ کو محسوس نہ ہو اس سے رطوبت پیدا نہ ہو۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈالیں مگر سوزش اور تپش محسوس نہ کریں۔

Marfat.com

دودھ کی تاثیر عموماً طاقت اور قوت دینا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ دودھ پئیں مگر اس کے پینے سے جسم میں طاقت اور توانائی نہ آئے۔ علیٰ ہٰذا القیاس زہر کی تاثیر مہلک ہونا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ زہر کھائیں، مگر اس کے باوجود ہلاکت و نقصان سے محفوظ رہیں۔ یہ فطرت کا نظامِ مکافات ہے۔ ہر کام اپنی کوئی نہ کوئی وقوعی تاثیر رکھتا ہے۔ جب بھی وہ کام کیا جائے گا، بالیقین اس کی وہی تاثیر اور وہی نتیجہ برآمد ہو گا جو اس کی سرشت میں داخل ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل دنیا کے نظام کی بقا میں اہم کردار ادا کر رہا ہے، اگر افعال کے یہ خواص اور اعمال کی یہ تاثیرات نہ ہوتیں تو نظامِ کائنات کبھی کا درہم برہم ہو چکا ہوتا۔ کسان اپنے کھیت میں گیہوں کاشت کر رہا ہو اور بجا طور پر یہ اُمید لگائے بیٹھا ہو کہ اس سے گیہوں پیدا ہو گا، مگر اسے کوئی شخص آ کر یہ باور کرانے کی کوشش کرے کہ اس گیہوں سے تو جوار اُگے گی۔ کسان اس شخص کو پاگل قرار دے گا۔ اس لیے کہ اسے قدرت کے نظامِ مکافات کا اچھی طرح یقین ہے۔ وہ وثوق کے ساتھ جانتا ہے کہ گیہوں کا بیج کاشت کیا جائے تو اس سے گیہوں ہی پیدا ہوتا ہے۔

آپ کو ان اشیا کی مکافات پر کبھی تعجب نہیں ہوتا کیونکہ یہ آپ کی عینیت اور تجربات و مشاہدات میں سے ہیں، تو پھر اعمال کے مکافات پر کیوں تعجب ہوتا ہے۔ کیا فطرت معاذ اللہ اتنی بے انصاف ہے کہ اس نے کائنات کی ہر چیز، ہر حالت اور ہر فعل میں تو مکافات رکھ دی ہے مگر اعمالِ انسانی کی دنیا میں نہیں؟ —— ایسا ہرگز ممکن نہیں۔ جو حسنِ اعتدال انسانی زندگی اور اس کے اعمال و نتائج کو حاصل ہے، شاید ہی اس کی مثال کہیں اور دکھائی دے سکے۔ کیونکہ جو حُسن و خوبی انسان کے باہر کائنات میں دکھائی دے رہی ہو، ضروری ہے کہ بطریقِ اولیٰ انسان کے اندر کی کائنات میں بھی پائی جائے۔ ارشادِ ایزدی ہے:

Marfat.com

سَنُرِيهِمْ اٰيَاتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ [1]

ہم ان کو اپنی قدرت کی نشانیاں آفاقی کائنات میں بھی دکھائیں گے اور ان کی اپنی کائنات یعنی ان کے نفوس میں بھی، تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہی حق ہے۔

لہٰذا جس طرح دنیا کی ہر چیز ایک فطری تاثیر اور مکافات رکھتی ہے، اسی طرح انسان کا ہر عمل بھی اچھی یا بری تاثیر رکھتا ہے [2]۔ اسی نظامِ مکافاتِ عمل کی تفسیر قرآن کریم میں یوں کی گئی ہے:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ [3]

جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم انہیں ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ اور کیا ان کا یہ گمان ہے کہ ان کی زندگی اور موت دونوں یکساں ہو جائیں گی۔ اگر ان کی سوچ یہی ہے تو افسوس ہے ان کے فیصلے پر۔

یہاں واضح کر دیا گیا کہ نیکی کرنے والوں اور برائی کرنے والوں کا انجام ایک جیسا ہونا ممکن

---

[1] حٰم السجدہ (۴۱ : ۵۳)

[2] اسی بنا پر علامہ اقبال فرماتے ہیں:

گندم از گندم بروید جو ز جو

از مکافاتِ عمل غافل مشو

[3] الجاثیہ (۴۵ : ۲۱)

Marfat.com

ہی نہیں۔ جہاں تک دنیا کی عدالتوں اور قانون کا تعلق ہے، عین ممکن ہے کہ کوئی شخص ظالم اور جفاکار ہونے کے باوجود، محض اپنی چرب زبانی، سرمایہ و دولت، جاہ و منصب، ذاتی اثر و رسوخ اور اپنے تعلقات و سفارشات کی بنا پر سزا پانے سے بچ جائے، اور وہ عدالت کا فیصلہ غلط طور پر اپنے حق میں کروانے میں کامیاب ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی مظلوم کی دادرسی نہ ہو اور ظالم اپنے کیفر کردار کو نہ پہنچ سکے، اور یوں قانون کی نظروں میں ظالم و مظلوم، گناہ گار و نیکوکار اور اطاعت گزار و نافرمان یکساں نظر آئیں۔ اگر اس دنیا کے بعد کوئی اور دنیا نہ ہو، یہاں کی عدالتوں سے ماورا کوئی اور عدالت نہ ہو اور ظالم و مظلوم دونوں مرنے کے بعد بالکل مٹی اور خاک ہو کر رہ جائیں اور ان کا کوئی اُخروی انجام نہ ہو، تو پھر قدرت کا نظامِ مکافات کیسے درست تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ کیا ظالم ظلم کرنے اور مظلوم ظلم سہنے کے باوجود یکساں قرار دے دیے جائیں اور ان میں کوئی تفریق نہ ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات ناممکن اور قدرت کے نظامِ مکافات کے سراسر خلاف ہے۔ اگر دنیا میں ظالم اپنے انجام سے بچ بھی گیا اور مظلوم کی دادرسی نہ بھی کی جا سکی تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہمیشہ ان کے درمیان برابری اور یکسانیت رہے گی۔ کیونکہ اس زندگی کے اختتام پر ایسی عدالت بھی بپا ہونے والی ہے، جہاں کسی کا جرم سزا پائے بغیر نہ رہے گا اور کسی کی بھلائی جزا پائے بغیر نہ رہے گی۔

قرآنِ کریم خبردار کرتا ہے کہ موت انسانی زندگی کی انتہا نہیں بلکہ اگلی زندگی کا دروازہ ہے۔ موت سے ایک زندگی کا رشتہ منقطع ہوتا ہے اور دوسری زندگی کا باب شروع ہو جاتا ہے۔

ایک لطیف علمی نکتہ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ قرآنِ کریم کی محولہ بالا آیت میں ارشاد فرمایا گیا، جس طرح اچھے اور برے لوگ

Marfat.com

یکساں نہیں ہو سکتے، اسی طرح ان کی موت و حیات بھی یکساں نہیں ہو سکتی۔ اگر موت محض فنا اور ختم ہو جانے کا نام ہو، تو وہ تو ہر ایک کی یکساں ہوتی ہے۔ آخر موت میں وہ کون سا پہلو ہے جو نیک و بد کے انجام کا فرق قائم رکھتا ہے اور جس میں دونوں کی موت باہم ممتاز رہتی ہے۔ سُن لیجیے! وہ پہلو حیات بعد الموت کا ہے۔ یعنی نیک شخص کی موت جس آئندہ زندگی کا پیش خیمہ بنتی ہے، وہ یقیناً بدکار کی آئندہ زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ اگر یہ خیال درست ہو کہ موت مکمل فنا ہے تو پھر قرآن کریم کی اس صراحت کی کیا تاویل کی جائے گی کہ اچھے اور بُرے کی موتیں یکساں نہیں ہو سکتیں۔ قرآن ان دونوں کے درمیان جو تمیز پیدا کر رہا ہے، اگر ان کے انجاموں کے مابین فی الواقع کچھ فرق ہو، جبھی یہ تمیز درست ہو سکتی ہے، ورنہ یہ تمیز محض مرنے اور فنا ہونے میں ہرگز نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت قرآن یہ واضح کر رہا ہے کہ مرنے کے بعد انسان فنا نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی زندگی کے اگلے مرحلے میں منتقل ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے۔ جس طرح نیک و بد کے اعمال ان کی زندگی میں انہیں ایک دوسرے سے مختلف اور ممتاز کرتے تھے، اسی طرح ان کی جزا و سزا ان کی موت کے بعد انہیں ایک دوسرے سے مختلف اور متمیز رکھے گی۔

حیات بعد الموت کی خصوصیت

یہیں آکر بعد از موت زندگی کی مابہ الامتیاز خصوصیت اُجاگر ہوتی ہے کہ یہ زندگی ہر نیک و بد میں حتمی طور پر تفریق کرنے والی ہوگی۔ وہاں ہر شخص سے پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔ وہاں نہ کوئی ظالم اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے اپنے ظلم کے انجام سے بچ سکے گا اور نہ کوئی مظلوم اپنی بے بسی کے باعث دادرسی سے محروم رہ سکے گا۔ وہاں کی عدالت کے فیصلوں پہ نہ کسی کی امارت اثر انداز ہوگی، نہ کسی کی عزبت و افلاس۔

Marfat.com

نہ کسی کا جاہ و منصب اُخروی عدالت کو متاثر کر سکے گا، نہ ہی کسی کا سیاسی دباؤ۔

اس دن نیک لوگوں کی پہچان یہ ہوگی کہ ان کے چہروں پر ان کی نیکی کے سبب سے نور جھلک رہا ہوگی جبکہ بدکاروں کے چہروں پر کالک دکھائی دے گی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں یہ واضح فرمایا ہے کہ نیکوکار امن و سکون کی دولت سے بہرہ یاب ہوں گے، جبکہ سرکش اور باغی اس دولت سے محروم ہوں گے۔ ان پہ خوف و ہراس کی کیفیت طاری ہوگی۔

باری تعالیٰ نے اسی قانونِ انصاف کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ [۱]	ہر نفس کو جیسا اس نے کیا ہوگا، اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

دوسری جگہ فرمایا:

يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ [۲]	اس دن نہ کسی کو مال کچھ فائدہ دے گا اور نہ اولاد۔ نجات صرف اس کی ہوگی جو خدا کے پاس قلبِ سلیم لے کر حاضر ہوگا۔

بہرحال اُخروی زندگی خیر اور شر میں امتیاز پیدا کرنے اور اس کی واضح پہچان کرنے کی ضمانت رکھتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اسلام صرف آخرت میں اچھے یا بُرے نتائج کی ضمانت دیتا ہے، اس دنیا میں نتائج کی ضمانت نہیں دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں بھی قدرت کا نظامِ مکافات جاری ہے، ظالموں کو دنیا میں بھی ان کے

---

[۱] آل عمران (۳ : ۲۵)

[۲] الشعراء (۲۶ : ۸۸ - ۸۹)

Marfat.com

ظلم کی سزا ملتی ہے، جیسا کہ تاریخ عالم اس امر پر شاہد ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں کسی کا مکافاتِ عمل سے بچ نکلنا بھی ممکن ہے جب کہ آخرت میں ہرگز ممکن نہیں۔

زندگی کی طرح موت کی بھی تخلیق ہوئی

یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہے کہ انسانی زندگی کی طرح موت کی بھی تخلیق کی گئی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ — اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ — تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے

عَمَلًا [1] — اچھے عمل کون کرتا ہے۔

کائنات کی ان دونوں حقیقتوں (موت اور حیات) کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کے عمل کو اچھی طرح پرکھا اور ٹھونک بجا کر دیکھا جاسکے۔ چونکہ اس مقصد کے لیے محض دنیوی زندگی ناکافی تھی، اسی لیے جزا و سزا کی تکمیل کی خاطر ایک وسیع تر دنیا تخلیق کی گئی۔ اگر وہ زندگی پیدا نہ کی گئی ہوتی تو موت و حیات دونوں بے معنی ہو کر رہ جاتیں۔

عقیدۂ آخرت کا انسانی سیرت پر اثر

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے تقوٰی کا حکم دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا — اے اہلِ ایمان خدا سے ڈرو، جیسا کہ اس سے

اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ [2] — ڈرنے کا حق ہے یعنی حتی المقدور تقوٰی اختیار کرو۔

---

[1] الملک (۶۷ : ۲)

[2] آل عمران (۳ : ۱۰۲)

Marfat.com

پھر اپنے اندر تقویٰ پیدا کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ دل و دماغ میں آخرت اور جزا و سزا کا پختہ یقین پیدا کرو۔ ساتھ ہی یہ واضح کر دیا گیا کہ جس کے دل میں خوفِ آخرت موجود نہیں، وہ شخص صفتِ تقویٰ سے ہمکنار نہیں ہو سکتا، ارشاد فرمایا:

فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا ۝ السَّمَاءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ ۭ كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا [۱]

پھر تم کیسے صاحب تقویٰ ہو سکتے ہو، اگر اس دن کا انکار کرو جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا اور جس سے آسمان پھٹ جائے گا۔ اس کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

یعنی آخرت پر ایمان لانے کا معنی یہ ہے کہ جزا و سزا پر پختہ یقین رکھا جاتے۔

قرآنِ حکیم میں محض ایمان بالآخرت کا ذکر نہیں، بلکہ یقین بالآخرت کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ البقرہ کے بالکل آغاز میں متّقین کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ [۲]

اور وہ آخرت پہ پختہ یقین رکھتے ہیں۔

یقین کے معنی و مقصود

یقین ذہنی اطمینان کی اس کیفیت کا نام ہے جس کے بعد بر اسے نام بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ گویا قرآنِ حکیم بنی نوعِ انسان سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ آخرت کی زندگی اور جزا و سزا کے نظام پر اسی طرح پختہ یقین رکھیں، جس طرح انہیں اپنی موجودہ زندگی کے حتمی طور پر واقع ہونے کا یقین ہے۔

---

[۱] المزمل (۷۳ : ۱۷ - ۱۸)

[۲] البقرہ (۲ : ۴)

Marfat.com

انسان کے اخلاقی کمال کی تکمیل

انسانوں کو اللہ رب العزت نے یہ عقیدہ کیوں دیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ (معاذ اللہ) وہ اپنی انانیت کی تسکین چاہتا ہے بلکہ اس عقیدے کا اصل مطمع نظر انسانی اخلاق کی تکمیل وتحسین ہے۔ کیونکہ اگر ساری دنیا ایک متقی اور پرہیزگار شخص کی طرح اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور غلامی اختیار کر لے، تو بھی اس سے خدا تعالیٰ کی بادشاہی اور اس کی حاکمیت و مالکیت میں ایک رائی کا اضافہ نہیں ہو سکتا اور اس کے برعکس ساری دنیا اگر اس کی نافرمان ہو جائے تب بھی خدا کی بادشاہی میں کچھ کمی واقع نہیں ہوتی، چنانچہ حضرت ابو ذرؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث قدسی نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اگر تمام لوگ، اولین بھی اور آخرین بھی اور تمام انسان اور تمام جن سب مل کر ایک متقی اور پرہیزگار شخص کے دل کی طرح متقی و پرہیزگار اور عبادت گزار ہو جائیں، تو اس کے باوجود میری خدائی میں ذرہ بھر اضافہ نہیں ہوگا اور اگر سارا جہان انس و جن، اولین بھی اور آخرین بھی، ایک فاسق و فاجر شخص کے دل کی طرح گناہ گار اور بدکار ہو جائیں تو اس کے باوجود میری الوہیت اور ربوبیت میں ذرہ بھر کمی واقع نہ ہوگی۔ اگر تمام دنیا کے جنات و انسان، اولین بھی اور آخرین بھی، ایک بڑے میدان میں جمع ہو جائیں اور ہر شخص مجھ سے اپنی ہر خواہش کی تکمیل چاہے اور میں ہر ایک کی خواہشات کی تکمیل کر دوں اور ہر ایک کو منہ مانگی مراد عطا کر دوں تو اس کے باوجود میرے خزانۂ رحمت میں اتنی بھی کمی واقع نہ ہوگی جتنی ایک بھرے ہوئے سمندر میں سوئی کو ڈبونے کے بعد اس کے ناکے سے پانی کی ہلکی سی بوند کے خارج ہونے سے ہوتی ہے۔ اے میرے بندو! یاد رکھو، یہ تمہارے اعمال ہی ہیں، جنہیں میں تمہارے لیے محفوظ کر کے رکھتا ہوں اور پھر انہی کے نتائج کسی کمی بیشی کے بغیر تمہیں لوٹا دیتا ہوں۔ پس تم میں جو کوئی

Marfat.com

اچھائی پائے، اُسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے اور جس کسی کو کوئی برائی پیش آئے، وہ اپنی ذات کے سوا کسی اور کو ملامت نہ کرے[1]

اسی لیے باری تعالیٰ نے اعلان فرمایا،

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ[2]

جس کسی نے نیک کام کیا، وہ اپنی ہی بہتری کے لیے کرتا ہے اور جس کسی نے برائی کی، وہ خود ہی اس کے آگے آئے گی۔ اور تیرا رب انسانوں پر ظلم کرنے والا نہیں

گویا واضح کر دیا گیا کہ خدا تعالیٰ انسان کی عبادت و اطاعت کا محتاج نہیں اور نہ ہی اس کی دعاؤں اور ان کی خواہشات کی تکمیل سے خائف ہے۔ بلکہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، محض اپنی بھلائی اور اپنی تکمیل کے لیے کرتا ہے اور یوم آخرت اسی امر کے یقین کے لیے مقرر ہے۔ لہٰذا آخرت کا تصور اگر حقیقی طور پہ ذہن میں راسخ ہو تو اس سے سیرتِ انسانی تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہوتی ہے۔ بصورتِ دیگر حسنِ سیرت کا یہ کمال ممکن نہیں۔

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب۔ باب تحریم الظلم۔

[2] حم السجدہ (۴۱: ۴۶)

Marfat.com

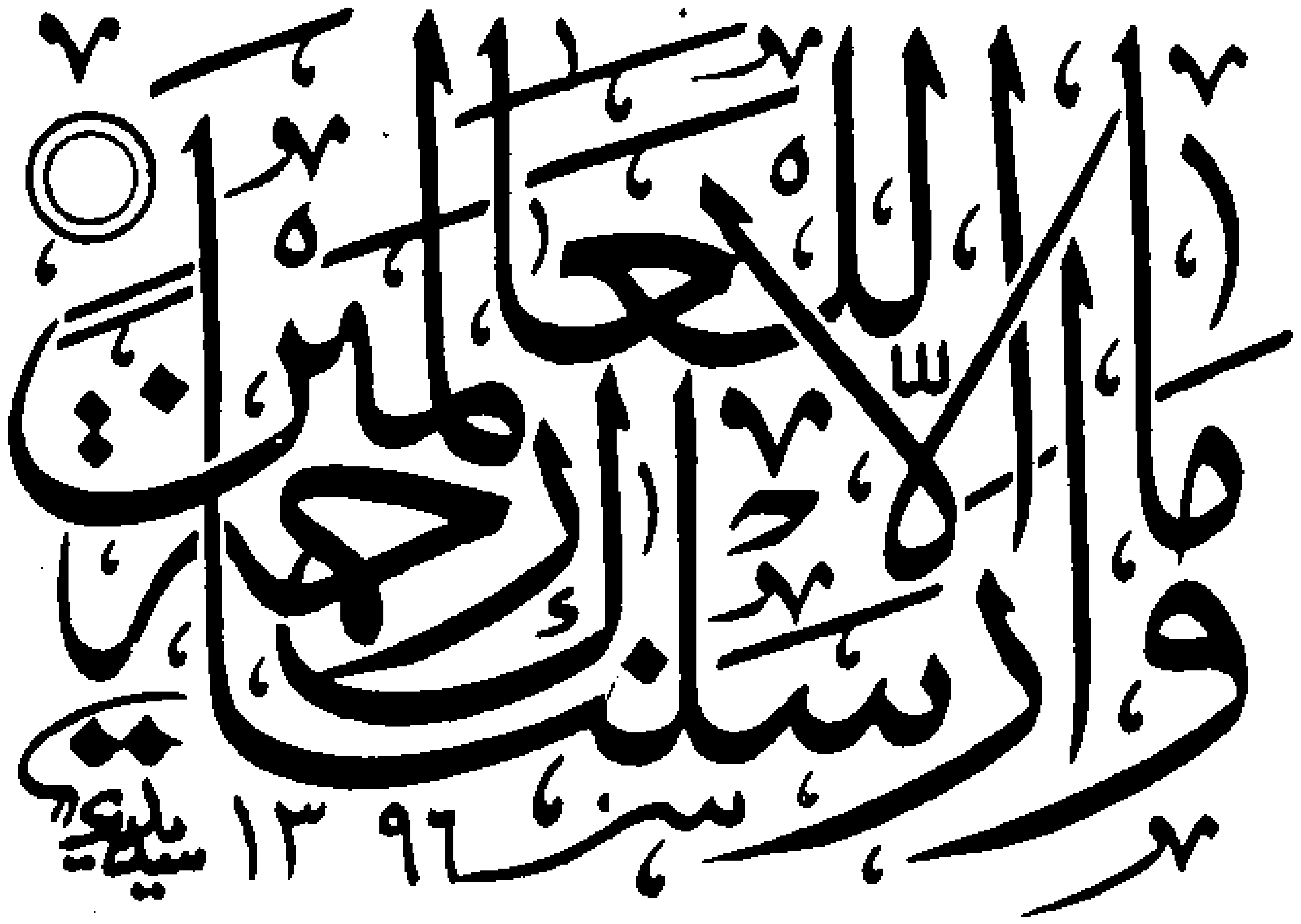

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

Marfat.com

حصّہ دوم

(ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر)

Marfat.com

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مضامین

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۵	**باب اوّل ——— ایمان بالکتب**	۱
۱۷	نزولِ کتب کا مقصد	
۱۸	لفظِ کتاب اور اس کے معانی	
۱۸	"کتاب" کا پہلا معنی	
۱۹	"کتاب" کا دوسرا معنی	
۲۲	انسانوں کے لیے لائحہ عمل	
۲۳	انبیاء سابقین کی کتب پر ایمان رکھنا ضروری ہے	
۲۵	ہر نبی صاحب کتاب نہیں	
۲۶	نبی اور رسول میں فرق	
۲۶	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ	
۲۷	صاحب کتاب انبیاء	
۳۰	ایک اشکال اور اس کا جواب	
۳۲	نبوتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء	

Marfat.com

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	**باب دوم —— ایمان بالکتب کے تقاضے**	۳۷
	وحیِ ربانی ایک مربوط سلسلہ ہے یا کہ اتفاقی امر	۳۹
	ایمان بالکتب کے تقاضے	۴۱
	پہلا تقاضا:	۴۱
	دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لیے وحیِ الٰہی کو ناگزیر جاننا	۴۱
	دوسرا تقاضا:	۴۱
	وحیِ الٰہی کو ہر قسم کے امکانِ خطا سے پاک ماننا	۴۱
	تیسرا تقاضا:	۴۲
	نزولِ وحی کے مستقل سلسلے پر ایمان رکھنا	۴۲
	چوتھا تقاضا:	۴۳
	وحی کو ایک خارجی حقیقت اور عطیۂ الٰہی تسلیم کرنا	۴۳
	پانچواں تقاضا:	۴۳
	قرآن کو سلسلہ وحی کا جامع اور خاتم ماننا	۴۳
	چھٹا تقاضا:	۴۶
	تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے اصلاً حق ہونے پر ایمان رکھنا	۴۶
	ساتواں تقاضا:	۴۷
	حضور علیہ السلام کی نبوت، وحی، تعلیم اور تعظیم کو تمام انبیاء پر مقدم سمجھنا	۴۷
۳	**باب سوم —— قرآن اور دیگر آسمانی کتب پر ایمان میں امتیاز**	۴۹

Marfat.com

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	پہلا امتیاز:	۵۱
	کلام نفسی اور کلام لفظی کا فرق	۵۱
	ایک لطیف علمی بحث	۵۳
	قرآن کریم کا نام بھی الہامی ہے	۵۴
	دوسرا امتیاز:	۵۵
	تحریف و تبدل سے محفوظ ہونا	۵۵
	شکر پر اضافِ انعام کا وعدہ	۵۷
	ایک بزرگ کا واقعہ	۵۹
	تیسرا امتیاز:	۶۰
	قرآنِ مجید کا ناسخ اور کتب سابقہ کا منسوخ ہونا	۶۰
	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۶۱
	چوتھا امتیاز:	۶۳
	قرآنِ حکیم کی جامعیت و آفاقیت	۶۳
	قرآن کی ابدیت	۶۴
	قرآن کی جامعیت	۶۵
	جامعیتِ قرآن کی عملی شہادتیں	۶۷
	پہلی شہادت	۶۷
	دوسری شہادت	۶۹
	تیسری شہادت	۷۰
	چوتھی شہادت ——— "واقعہ تسخیرِ ماہتاب"	۷۱

Marfat.com

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	پانچویں شہادت	۷۹
	چھٹی شہادت ـــــــ "قرآنی علوم کا بیان"	۸۱
	فلسفہ اور قرآن	۸۴
	سائنس اور قرآن	۸۵
	ساتویں شہادت ـــ قرآن تمام الہامی کتب کے ثمرات و مطالب کا جامع ہے	۹۰
	آٹھویں شہادت ـــ قرآن تمام عقلی اور نقلی فنون کا ماخذ ہے	۹۱
	پانچواں امتیاز:	۹۷
	نفیٔ ریب کا چیلنج	۹۷
	شک کی امکانی صورتیں	۹۸
	۱۔ کتاب کا اصلی، واقعی اور حقیقی ہونا	۹۸
	۲۔ کتاب کا قابلِ اعتبار اور حقیقی ہونا	۹۸
	۳۔ کتاب کا ہر قسم کی کمی بیشی سے محفوظ ہونا	۹۸
	کتاب کا ہر زمانے میں قابلِ عمل ہونا	۹۹
	نفیٔ ریب کے دعوے کا تقابلی جائزہ	۹۹
	چھٹا امتیاز:	۱۰۳
	اعجازِ قرآن	۱۰۳
	وجوہِ اعجاز قرآن	۱۰۵
	۱۔ عدمِ مثلیت	۱۰۸
	۲۔ کاملیت و تمامیت	۱۱۲

Marfat.com

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	۳۔ عدمِ اختلاف و تناقض	۱۱۲
	۴۔ ندرتِ اسلوب و نظمِ کلام	۱۱۴
	۵۔ فصاحت و بلاغت	۱۱۸
	ا ــــ مجاز و کنایہ	۱۱۹
	ب ــــ تشبیہ و استعارہ	۱۱۹
	۶۔ صوتی ترنّم و تغنّم	۱۲۲
	۷۔ اُمیتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۱۲۶
	۸۔ احوالِ غیب کا بیان	۱۲۸
	اُممِ سابقہ کے احوال و واقعات	۱۲۹
	مستقبل کی پیشینگوئیاں	۱۳۰
	• غلبۂ روم کی پیشینگوئی	۱۳۱
	• فتح مکہ کی پیشینگوئی	۱۳۲
	• فتح خیبر کی پیشینگوئی	۱۳۳
	• غلبۂ اسلام کی پیشینگوئی	۱۳۴
	۹۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت	۱۳۶
۴	باب چہارم ــــ ایمان بالملائکہ	۱۴۹
	ملائکہ کی حقیقت	۱۵۱
	تصورِ ملائکہ اور قرآن	۱۵۲
	فرشتوں کے بارے میں غلط تصورات کی نفی	۱۵۴

Marfat.com

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
۱۵۷	باب پنجم — ایمان بالقدر	۵
۱۶۰	خلق عمل اور کسب عمل میں فرق	
۱۶۴	کیا مخلوق کے لیے دیکھا جانا ضروری ہے	
۱۶۵	جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے	
۱۶۸	ایک غلط فہمی اور اس کا جواب	
۱۷۰	انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ	
۱۷۰	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد	
۱۷۱	بین القدر والجبر کا مفہوم	
۱۷۱	عمل انسانی کے تکمیلی مراحل	
۱۷۱	فرض اور خواہش میں کشمکش کا مرحلہ	
۱۷۲	غور و خوض کا مرحلہ	
۱۷۲	انتخاب نیت کا مرحلہ	
۱۷۳	عزم و ارادے کا مرحلہ	
۱۷۳	تعمیل کا مرحلہ	
۱۷۳	نتیجۂ عمل کا مرحلہ	
۱۷۹	باب ششم — قدر و جبر اور تصورِ عدل	۶
۱۸۲	اللہ تعالیٰ کا تصورِ عدل	

Marfat.com

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	عدل کا مقامِ رفیع — احسان	۱۸۴
	خداوند تعالیٰ کی احسان پسندی	۱۸۶
	خدا تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا	۱۸۷
	جزا اور سزا اور نظامِ عدل	۱۸۷
	جزا و سزا اور اتمامِ حجت	۱۸۸
	اتمامِ حجت کا مفہوم	۱۹۱
	اخلاقی جدوجہد	۱۹۲
	حالتِ اضطرار اور قانونِ اسلامی	۱۹۵
	سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد	۱۹۷
	سلطنتِ اسلامیہ کا فرض	۱۹۷
	سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ	۱۹۸
	ایک صحابی کا سوال اور حضور علیہ السلام کا جواب	۱۹۹
۷	بابِ ہفتم — قضا و قدر کا انسانی زندگی میں کردار	۲۰۱
	قدر کا مفہوم	۲۰۳
	عوامی غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۲۰۵
	قضا و قدر کی دو اصطلاحیں اور ان کا مفہوم	۲۰۶
	قضا و قدر آفاقی و کائناتی اعتبار سے	۲۰۶
	انسانی زندگی میں قدر کا مفہوم	۲۰۷

Marfat.com

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	قضا کا مفہوم	۲۰۹
	سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد	۲۱۰
	حق کی پکار جاری رہتی ہے	۲۱۱
	بیمار شخص کے لیے مرغن خوراک	۲۱۲
	قدر مقدم، قضا موخر	۲۱۳
	موسمی حالات کی پیشین گوئی	۲۱۴
	پیشین گوئیوں کا پس منظر	۲۱۵
	قضا معلق و قضا مبرم	۲۱۹
	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد	۲۲۰
	سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد	۲۲۱

Marfat.com

باب اوّل

ایمان بالکتبؒ

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جس طرح خدا تعالیٰ کی ذاتِ برحق، انبیاء و رسل کی بعثت کے مقررہ نظام، یوم آخرت اور جزاء و سزا پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف انبیاء و رسل پر نازل کیے جانے والے صحیفوں اور کتابوں پر (یعنی ان کے منزّل من اللہ ہونے پر) بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ [1]

پہلے تو سب لوگوں کا ایک ہی مذہب تھا، لیکن وہ (آپس میں اختلاف کرنے لگے) تو خدا نے (ان کی طرف) بشارت دینے والے اور ڈر سنانے والے پیغمبر بھیجے اور ان پر سچائی کے ساتھ کتابیں نازل کیں تاکہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے تھے، ان کا ان میں فیصلہ کر دے۔

---

[1] البقرہ (۲: ۲۱۳)

Marfat.com

اوائل تاریخِ انسانی یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک طویل عرصے تک تمام انسانیت ایک ہی گروہ ایک ہی طبقہ اور ایک ہی اُمت تھی لیکن جب زمین پر انسانوں کی کثرت ہوگئی اور خاندانی تقسیم کی بنیاد پر انسانوں میں مختلف نوع کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی تعلقات پیدا ہوگئے تو مختلف پیشوں کے حوالے سے مختلف طبقات وجود میں آگئے۔ اس طرح ہر طبقے کے مفادات وجود میں آجانے کی بنا پر ان میں اختلافات بھی پیدا ہونے لگے۔ یوں مفادات اور اندازِ فکر میں باہمی اختلاف کی بنیاد پر مختلف النوع خیالات اور نظریات وجود میں آنے لگے اور آہستہ آہستہ انسانی وحدت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔ وحدت، یگانگت اور اجتماعیت کے وہ اوصاف جو ابتدا میں نسلِ انسانی کا خاصہ تھے، مفقود ہونے لگے۔ لہٰذا اللہ رب العزت نے عالمِ انسانیت کے مناقشات کو ختم کرنے، ان کی دوبارہ شیرازہ بندی کرنے اور ان میں پھر سے وحدت و یک جہتی کے رشتے اُستوار کرنے کے لیے زمین پر انبیا علیہم السلام کو مبعوث فرمایا جنہوں نے خدائی تعلیمات اور وحی کی روشنی سے بہرہ مند ہوکر، اپنی قوم کو، احکامِ الٰہی کی اطاعت کی صورت میں، رحمت و فضلِ خداوندی کا مژدہ سنایا اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔

یہ انبیاء علیہم السلام تہی دامن نہ تھے، بلکہ انہیں نسلِ انسانی کی بقا اور انسانی اقدار کے تحفظ کے لیے خدائی ضابطوں اور قوانین و فرامین پر مشتمل کتب اور صحیفے بھی مرحمت فرمائے گئے، جن میں زندگی گزارنے کا پورا منشور درج ہوتا تھا۔

Marfat.com

نزولِ کتب کا مقصد

قرآنِ حکیم میں نزولِ کتبِ سماوی کی سب سے اہم وجہ یہی بیان کی گئی ہے:

لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ؂ — تاکہ جن امور میں لوگ باہم اختلاف کرتے تھے، ان میں ان کے درمیان فیصلہ کیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ ان اُصولوں اور قوانین کی روشنی میں انبیا ان نزاعات کو نپٹا سکیں، جنہوں نے نسلِ انسانی کا سکون اور اطمینان برباد کر دیا تھا۔

اس آیتِ مبارکہ کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآنِ حکیم سمیت تمام آسمانی کتب اور صحیفوں کے نزول کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ لوگ ان کی روشنی میں اپنے اضطراب و انتشار کو وحدت اور سکون و طمانیت میں بدل سکیں، اپنے اختلافات کو رفع کر کے دوبارہ جسدِ واحد کی طرح باہم متحد ہو سکیں اور اپنے تمام اختلافات کا حل تلاش کر سکیں۔ مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ خدا تعالےٰ نے جن انبیا علیہم السلام کو طبقاتِ انسانی میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لیے بھیجا تھا، ہم نے خود انہی انبیا کی ذواتِ مقدسہ کو اپنے نزاعات اور اختلافات کی اساس بنا لیا۔ اسی طرح جو کتابیں بنی نوعِ انسان کے تمام قضیے اور جھگڑے نبٹانے آئی تھیں، آج انہی کی بنیاد پر اختلافات اور نزاعات انگیخت کیے جا رہے ہیں۔ (خدا تعالیٰ اُمتِ مسلمہ کو ہدایت اور وحدت کی توفیق عطا فرمائے)

؂ البقرہ (۲ : ۲۱۳)

Marfat.com

لفظِ کتاب اور اس کے معنی

کتاب کا پہلا معنی پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ کتاب عربی زبان کا لفظ ہے اور کَتَبَ سے مشتق ہے۔ کَتَبَ کے معنی مختلف چیزوں کو جمع کرنے اور ان کو باہم ملانے کے ہیں۔ جب مختلف حروف باہم ملتے ہیں اور مل کر الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، تو یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے اور الفاظ کے ملاپ سے فقرات پر مشتمل عبارت جنم لیتی ہے۔ اس مربوط کلام کے سلسلے کو کتاب کہتے ہیں، خواہ وہ الفاظ و حروف تحریری صورت میں مرتب شدہ ہوں یا نہ ہوں۔ ضروری امر یہ ہے کہ وہ سلسلۂ کلام لوگوں کے ذہن میں مرتّب اور مربوط شکل رکھتا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں مربوط اور مسلسل کلام کو کتاب کہا جاتا ہے[۱]۔ اس کی جمع کُتُب آتی ہے۔

قرآن حکیم یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کر دینا چاہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر نازل شدہ کتب (کلام) مربوط اور بامعنی ہوتی تھیں۔ یہ کتب بے معنی اور مبہم الفاظ پر مشتمل ہرگز نہ تھیں۔ بلکہ نہایت واضح اور مکمل معنیٰ و مفہوم پر دلالت کرتی تھیں۔ چونکہ ان کے ذریعے انبیاء علیہم السلام نے انسانی مسائل اور نزاعات کا مداوا کرنا ہوتا تھا، اس لیے خداوند تعالیٰ نے نہایت کھلے انداز میں اپنے احکام انسانی دنیا تک پہنچائے۔

۱۔ قرآن حکیم سے پہلے عربی زبان میں کسی کتاب کا پتا نہیں چلتا، بلکہ یقین غالب ہے کہ اس کلام مجید سے پہلے کوئی کتاب موجود ہی نہ تھی، تاہم لفظ کتاب کا مختلف چیزوں مثلاً خط یا کسی تحریر وغیرہ پر اطلاق ہوتا تھا۔ بہرحال لغوی معنیٰ کے اعتبار سے کتاب کی وسعت و عمومیت اس کے مفہوم میں وسعت کا پتا دیتی ہے۔

Marfat.com

بہر حال ہر اس مجموعۂ ضوابط و ہدایات کو کتاب کہتے ہیں جو مرتبہ ہو یا غیر مرتبہ، مگر شرط یہ ہے کہ اس کا کلام باہم مربوط ہو اور معانی واضح اور آشکار ہوں۔ جس طرح "ریاست اور حکومت کے اساسی (تشکیلی اور تنظیمی) مسائل سے متعلق بنیادی ضوابط و ہدایات کا مجموعہ آئین یا دستور (CONSTITUTION) کہلاتا ہے، خواہ وہ تحریری صورت میں ہوں یا غیر تحریری صورت میں۔۔ تحریری (WRITTEN)، یا غیر تحریری (UN-WRITTEN) دونوں آئین ہی تصور کیے جائیں گے۔ اسی طرح کتاب تحریری یا غیر تحریری، دونوں صورتوں میں کتاب کہلائے گی۔

کتاب کا دوسرا معنیٰ یہ تو لفظِ کتاب کا عام معنیٰ تھا، جس سے ہم روزمرہ کی زندگی میں آشنا ہیں۔ کتاب کا ایک اور معنی بھی ہے جو قرآنِ حکیم کی مختلف آیات سے واضح ہوتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ[1] — اور ہر ایک طبقے کے لیے ایک وقت (بطور نتیجہ اور فیصلہ) مقرر ہے۔

انسانیت کے ہر طبقے کے عروج و زوال یا بقا و فنا کے لیے حتمی فیصلے کی ایک گھڑی مقرر ہے۔ اور ہر اُمت کو اپنی جدوجہد کی بنیاد پر اس مقررہ منزل یا مقررہ گھڑی تک پہنچنا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ[2] — ہر حکم یعنی فیصلے کے لیے ایک نوشتہ ہے۔

بالفاظِ دیگر باری تعالیٰ نے ہر قوم کے عروج و زوال اور اس کی بقا و فنا کا ایک

---

[1] الاعراف (۷: ۳۴)

[2] الرعد، (۱۳: ۳۸)

Marfat.com

قانون اور ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ اسی کی بنا پر اس قوم کی ذلت و نکبت اور رسوائی و خواری کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہ فیصلہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے ظلماً صادر نہیں کیا جاتا اور نہ کسی طبقے یا قوم کو اس ضابطے اور اصول سے ہٹ کر ترقی و کمال سے ہمکنار کیا جاتا ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک قوموں کے عروج و زوال میں سرے سے کوئی اصول اور ضابطہ ہی کارفرما نہ ہو، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر قوم کے تنزل و انحطاط اور عروج و ترقی میں قدرت کے ہاں ایک آفاقی اور کائناتی ضابطے اور اصول کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اسی بنا پر ارشادِ خداوندی ہوا کہ ہر فیصلے اور اس کے مقرر کردہ ہر انجام کے لیے ایک واضح ضابطہ اور اصول (یعنی کتاب) مقرر ہے۔ انہی ضابطوں اور اصولوں کی بنا پر ہر قوم کو اس کے اختیار کردہ عمل کے نتیجے میں عظمت و سطوت سے ہمکنار کیا جاتا ہے یا وہ ذلت و نکبت کا شکار ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک اقوام و ملل کے عروج و زوال کے لیے کچھ ضابطے اور قوانین ایسے ہیں جن کی پابندی ان کو ترقی اور عروج سے ہمکنار کر دیتی ہے اور خلاف ورزی تباہی اور ہلاکت کی طرف کھینچ لے جاتی ہے[۱]۔ سورۃ البقرہ کی مذکورہ بالا آیت میں

---

[۱] اسی بنا پر قرآنِ حکیم کے بارے میں ارشاد ہے:

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا	خدا تعالیٰ اس کے ساتھ بہت سے
وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا [۱]	لوگوں کو گمراہ ٹھہراتا ہے اور بہت سے
(البقرہ، ۲: ۲۶)	لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔

اور حضرت فاروقِ اعظمؓ کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا ہے:

ان اللہ یرفع بھا	کچھ قوموں کو اس کے صدقے رفعت د

(باقی آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

انہی ضابطوں اور قوانین کی طرف اشارہ فرمایا گیا کہ ہم نے ان کے ساتھ کتاب نازل کی۔ انہی خیر و شر کے دونوں راستوں اور ہر ایک کے منطقی نتائج و اثرات کی بھی ہدایت کی تاکہ ہر شخص یہ جان سکے کہ کس قسم کے اعمال کیسے نتائج و اثرات پیدا کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ارشاد ہوا :

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَىِّ ؎۱ — دین اسلام میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت صاف طور پر گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا :

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ — اور آپ فرما دیجیے کہ لوگو! یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے۔ جو شخص چاہے ایمان لائے اور جو

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

اقوا ما و یضع بھا آخرین — سربلندی نصیب ہوتی ہے جبکہ کچھ قومیں اس کے اصولوں کو چھوڑنے کی بنا پر ذلیل و خوار ہوتی ہیں

اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ :

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(از صفحہ ہذا)

؎۱ البقرہ (۲ : ۲۵۶)

Marfat.com

إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ[1]

شخص چاہے کفر پر رہے۔ ہم نے ظالموں کے لیے دوزخ کی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو گھیر رہی ہوں گی۔

مزید فرمایا:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ[2]

اور انسان کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھا دیے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان نے جب بھی محض عقل و دانش کی بنا پر اپنی دنیوی زندگی کا رُخ متعین کیا اور قیاس اور عقلی استنباط سے کام لے کر خدائی فیصلوں اور مذہبی قدروں کو ٹھکرایا، اس نے ہمیشہ ذلت و رُسوائی پائی، اس کا نام و نشان مٹ گیا، اُسے موجودہ اور مابعد کی اقوام و ملل کے لیے سامانِ عبرت و بصیرت بنا دیا گیا۔ اس کے برعکس جب بھی انسان نے خدائی فیصلوں اور آسمانی ضابطوں کے سامنے اخلاص کے ساتھ جبینِ نیاز جھکائی اور سرِ تسلیم خم کیا، اسے رفعتوں اور کامرانیوں سے نوازا گیا، اس طرح تمام طبقاتی مناقشات اور اختلافات رفع ہو گئے اور انسانیت امن و آشتی سے ہمکنار ہو گئی۔

انسانیت کے لیے لائحہ عمل

بہرحال یہ امر اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ انسان اپنی تحقیق اور ذہنی کاوش سے اپنے تمام دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتا۔ انسان اگر مناقشات کی آگ سے بچ کر امن و سکون کی دولت حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اس کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور فکر و خواہش کو

---

[1] الکہف (۱۸ : ۲۹)

[2] البلد (۹۰ : ۱۰)

Marfat.com

دہلیزِ درِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان کردے۔

عقل قربان کن بہ پیشِ مصطفیٰ

جیسا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ[1]

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک صاحب ایمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی خواہشات کو میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ کردے۔

اور یہ امر مسلمہ ہے کہ انسانی عقل غلط فیصلے کر سکتی ہے، انسانی سوچ بھٹک سکتی ہے، مگر خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت اور اس کے رسولؐ کی لائی ہوئی شریعت کا ایک ایک گوشہ درست اور محکم ہوتا ہے۔ انسانوں کے وضع کردہ ضابطے ان کو غلط راستے پر گامزن کر سکتے ہیں، لیکن خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ ضابطے رشد و ہدایت ہی سے ہمکنار کرتے ہیں۔

انبیاءِ سابقین کی کتب پر ایمان رکھنا ضروری ہے

یہ تو انبیاء و رسل پر نازل کی جانے والی کتابوں کی افادیت تھی اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کتب پر ایمان سے مراد کیا ہے۔ اسلام نے کسی خاص نبی کی کتاب پر ایمان لانے کی بجائے تمام انبیا علیہم السلام کی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

قُولُوٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ

(مسلمانو!) کہو کہ ہم خدا پر ایمان

---

[1] شرح السنہ بحوالہ مشکوٰۃ، ۳۰

Marfat.com

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ [۱]

لائے اور جو (کتاب) ہم پر اُتری، اس پر اور جو صحیفے ابراہیمؑ اسماعیلؑ اسحاقؑ، یعقوب (علیہم السلام) اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے، ان پر اور جو کتابیں موسیٰ اور عیسیٰ کو عطا ہوئیں ان پر، اور جو دیگر پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملیں، ان سب پر ایمان لائے۔ ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدائے واحد کے فرمانبردار ہیں۔

یہاں قرآنِ مجید نے دوٹوک الفاظ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثتِ مبارکہ تک جتنے بھی انبیاءِ کرام علیہم السلام تشریف لائے، خدا تعالیٰ نے ان تمام انبیا علیہم السلام کی طرف اپنے پیغامات بھیجے ہیں، بعض کو کتابوں کی صورت میں اور بعض کو صحف کی صورت میں۔ ان میں سے بعض تو معروف ہیں اور ان کے نام لیے گئے ہیں، جب کہ ان میں سے بعض غیر معروف ہیں اور ان کے نام بھی مذکور نہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک کی کتاب اور صحیفے پر ایمان رکھنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ نفسِ وحی میں ذرہ برابر بھی فرق نہ کیا جائے۔

لہٰذا خواہ کوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمّت میں سے ہو یا حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیروکار ہو یا حضرت اسحاق علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کا نوح علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام کی شریعت کا تابع ہو یا نبی آخر الزماں علیہ السلام کی غلامی کا

---

[۱] البقرہ (۲: ۱۳۶)

Marfat.com

دم بھرتا ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر نبی کو نفسِ نبوت میں یکساں طور پر بہرہ ور سمجھے۔ ان کی نبوتوں اور رسالتوں پر نیز ان پر نازل شدہ کتابوں پر بلا امتیاز ایمان لائے کیونکہ یہ سب کتابیں نازل تو خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوئی تھیں۔

ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں

اس آیت سے ایک اور اہم اصول کا پتا چلتا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کتابی ہدایت بلا استثناء اور بلا تمیز ہر ایک نبی پر نازل کی ہے۔ البتہ معروف اصطلاح میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر نبی صاحبِ کتاب نہیں تھا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد تو ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش ہے، جس کی طرف سورۂ فاطر کی حسبِ ذیل آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہے:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ [1]

اور کوئی اُمت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی ہدایت کرنے والا نہ گزرا ہو۔

اسی طرح انبیاء کی تعداد تو شمار اور احصا سے ماورا ہے، مگر ہر نبی پر اصطلاحاً کتاب نازل نہیں کی گئی۔ البتہ ہر ایک کے ساتھ وحی کا تعلق ضرور قائم رہا، کیوں کہ اس کے بغیر خود وجودِ نبوت ہی ثابت نہیں ہو سکتا۔

انبیاء علیہم السلام میں سے چند نفوس ایسے ہیں، جن پر کتاب یا صحیفہ نازل ہوا۔ امام بیہقیؒ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: "کہ اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار (۱۰۴) کتابیں نازل فرمائی ہیں۔" [2]

---

[1] فاطر (۳۵: ۲۴)

[2] الاتقان۔ ۲: ۱۲۶

Marfat.com

نبی اور رسول میں فرق

اسی بنا پر نبی اور رسول میں یہ فرق کیا گیا ہے کہ نبی تو ہر وہ پیغمبر ہے جسے شرفِ نبوت سے سرفراز کیا گیا ہو، جب کہ رسول اسے کہتے ہیں جسے نبوت کے بعد منصبِ رسالت پر بھی سرفراز کیا گیا ہو اور اسے کسی مخصوص قوم کی طرف دعوت و تبلیغ کا باقاعدہ پیغام اور پروگرام دے کر بھیجا گیا ہو۔ یہ پروگرام اسے کتاب یا صحیفے کی صورت میں باری تعالیٰ نے سپرد کیا ہو۔ اس لحاظ سے ہر رسول نبی تو ہوتا ہے لیکن ہر نبی، رسول نہیں ہوتا۔ بنابریں انبیاء کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر رسولوں کی کم۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

اس ضمن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ جب وہ اپنی زوجہ کے ہمراہ (جو حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں) مصر سے واپسی میں ایک جنگل سے گزرے تو انہیں ایک درخت سے آگ نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ انہوں نے اپنی بیوی سے فرمایا:

لَعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى [1]	شاید اس سے میں تمہارے لیے انگارہ لاؤں یا حقیقی منزل کا پتا لگا سکوں۔

یہ حصولِ نبوت کی طرف اشارہ تھا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کے ان شعلوں کے قریب پہنچے تو اس درخت سے آواز آئی:

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ	میں تمہارا پروردگار ہوں۔ اپنی جوتیاں اُتار دو۔ تم یہاں پاک میدان

---

[1] طٰہٰ (۲۰ : ۱۰)

Marfat.com

بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى [1] (وادیٔ طویٰ) میں ہو۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف آغازِ وحی تھا جس سے آپ کی بطورِ نبی بعثت متحقق ہو گئی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بطورِ نبی بعثت ہو چکی تو آپؑ کو خلعتِ رسالت سے بہرہ ور کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى [2]
تم فرعون کے پاس پیغامِ ہدایت لے کر جاؤ کیونکہ وہ سرکش ہو چکا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو جا کر خبر دی اور فرمایا:

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ [3]
ہم (موسیٰ و ہارون) تمام جہان کے مالک کے بھیجے ہوئے (رسول) ہیں اور اس لیے آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دے۔

صاحبِ کتاب انبیاء

بہت سے رسولوں کو صحائف عطا کیے گئے مگر جن کو باقاعدہ کتابیں عطا کی گئیں، ان کی تعداد چار ہے۔ ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں جنہیں تورات دی گئی۔ ارشادِ خداوندی ہے:

---

[1] طٰہٰ (۲۰: ۱۲)

[2] ایضاً (۲۰: ۲۴)

[3] الشعراء (۲۶: ۱۶، ۱۷)

Marfat.com

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَّنُورٌ [1]

بیشک ہم نے موسیٰ پر تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔

حضرت موسیٰ کے بعد انہیں کی اُمت میں سے حضرت داؤد علیہ السلام کو منصب نبوت پر فائز کر کے ان پر آسمانی کتاب زبور نازل کی گئی

وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا [2]

اور داؤد کو ہم نے زبور عطا کی۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل مرحمت فرمائی گئی۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَّنُورٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيهِ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ [3]

اور ہم نے ان (حضرت عیسیٰ) کو انجیل عنایت کی جس میں ہدایت اور نور ہے۔ وہ تورات کی، جو اس سے پہلی (کتاب) ہے، تصدیق کرتی ہے اور پرہیزگاروں کو چاہیے کہ جو احکام خدا نے اس میں نازل فرمائے ہیں، اُس کے مطابق حکم دیا کریں اور جو خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق حکومت نہیں کرتے، وہ لوگ نافرمان (فاسق) ہیں۔

---

[1] المائدہ (۵: ۴۴)

[2] النساء (۴: ۱۶۳)

[3] المائدہ (۵: ۴۶، ۴۷)

Marfat.com

خدائی ہدایت سے عملاً انحراف کرنے والے فاسق ہیں اور اعتقاداً انحراف کرنے والے کافر۔ سب سے آخری نبی اور رسول جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں، جنہیں قرآنِ مجید عطا کیا گیا۔ اب جس طرح تمام انبیاء کرام میں سے منصبِ رسالت پر فائز ہونے والے "رسول" برگزیدہ ہیں نیز رسولوں میں سے یہ چار صاحبِ کتاب ہستیاں سب سے زیادہ مرتبے کی حامل ہیں اور ان چاروں رسولوں میں حضور فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس مرتبے اور درجے کے اعتبار سے سب سے افضل اور فائق ہے، اسی طرح تمام انبیاءؑ پر نازل شدہ صحائف میں سے چار کتب سب سے افضل ہیں اور ان چاروں کتابوں میں قرآن مجید کا رتبہ و مقام سب سے بلند و برتر ہے۔

قرآنِ حکیم میں اسی بنا پر اعلان کیا گیا:

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ [1] — اور اس کا ذکر پہلے تمام پیغمبروں کی کتابوں اور صحیفوں میں موجود ہے۔

عربی کا قاعدہ ہے کہ جب مضاف اور مضاف الیہ دونوں جمع ہوتے ہیں تو یہ ترکیب استغراق اور کلیّت پر دلالت کرتی ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس نے امام المرسلین علیہ السلام کی آمد کی خبر نہ دی ہو اور کوئی کتاب بھی ایسی نہیں گزری جس میں خاتم الکتب یعنی قرآنِ مجید کے نزول کی خبر نہ مذکور ہو۔

قرآنِ مجید انتہائی بالا و برتر مرتبہ رکھتا ہے کیونکہ ہر قدیم آسمانی کتاب اور صحیفہ اپنے تمام علوم و معارف اور تعلیمات و ہدایات سمیت اس کے اندر

---

[1] الشعراء (۲۶: ۱۹۶)

Marfat.com

سمو دیا گیا ہے۔ مزید براں اس کے ذریعے بے شمار نئی حکمتیں، احکام، علوم، اسرار اور غوامض امتِ مسلمہ کو عطا کر دیے گئے ہیں

ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو قرآن اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ انبیا اور ان کی کتابوں میں کوئی تفریق نہ کی جائے، بلکہ ان پر یکساں طور پر ایمان رکھا جائے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ [1]

(اور کہتے ہیں) ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

مگر مذکورہ بالا بیان سے انبیاء علیہم السلام اور ان کی لائی ہوئی کتابوں پر ایمان لانے میں واضح فرق کا اظہار ہوتا ہے:

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ یہ اشکال درحقیقت دو مختلف باتوں میں التباس کا نتیجہ ہے۔ ایک ہے نفسِ نبوت و رسالت اور ایک ہے مرتبۂ نبوت و رسالت، ان دونوں میں فرق ہے۔ جس طرح نفسِ انسان ہونے میں دنیا کے تمام انسان برابر ہیں اور ان میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی البتہ ان کے مراتب و درجات اور کمالات میں واضح فرق دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح نفسِ نبوت نفسِ رسالت نفسِ وحی اور نفسِ کتاب کے حوالے سے تمام انبیاء السلام بھی یکساں ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان میں نبوت و رسالت کے درجات و مراتب کے اعتبار سے واضح فرق موجود ہے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا

یہ پیغمبر (جو وقتاً فوقتاً ہم بھیجتے رہتے

---

[1] البقرہ (۲:۲۸۵)

Marfat.com

بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعۡضَهُمۡ دَرَجٰتٍ [1]

ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ بعض ایسے ہیں جن سے خدا نے گفتگو فرمائی اور بعض کے دوسروں پر درجات بلند کیے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور معجزۂ عصا دیا اور انہیں اپنی ذات سے ہمکلام ہونے کا شرف عطا کر کے دوسرے کئی انبیاء پر فضیلت بخشی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو غیر معمولی طریقے سے پیدا کر کے اور مُردوں کو زندہ کرنے اور بیماروں کو شفایاب کرنے کی صلاحیت دے کر دوسرے انبیاء پر برتری عطا فرمائی۔ حضرت یوسفؑ کو غیر معمولی اور حیرت انگیز حسن و جمال دے کر دوسروں سے ممتاز کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنّات، حیوانات، ہواؤں اور فضاؤں پر تصرف اور حکمرانی عطا کر کے دوسرے سے منفرد کیا اور حضرت داؤد علیہ السلام کو عظیم سلطنت و حکومت کے ذریعے خصوصی شرف سے بہرہ ور کیا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہ تمام فضیلتیں اور فوقیتیں جزوی نوعیت کی تھیں۔ البتہ اس گروہِ انبیاء میں ایک گرانقدر ہستی ایسی بھی ہے جس کی ذات میں اللہ تعالیٰ نے تمام اگلی اور پچھلی فضیلتوں، فوقیتوں اور رفعتوں کو جمع کر دیا ہے اور اسے اوّل تا آخر جملہ کمالاتِ نبوت کا مرقع بنا دیا ہے ـــ یہ گرانقدر ہستی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات ہے جن کی نبوت و رسالت اپنے مرتبہ و کمال کے لحاظ سے سب سے بلند و برتر ہے۔ کوئی فرد اس امتیاز میں آپؐ کا ہمسر و شریک نہیں بن سکا۔ اسی طرح آپ کو عطا کی جانے والی آخری کتاب ـــ قرآنِ مجید بھی اپنا کوئی ہمسر و شریک نہیں رکھتی اور یہ مرتبۂ کمال کے

---

[1] البقرہ (۲: ۲۵۳)

Marfat.com

لحاظ سے تمام کتب و صحائف سے بلند و برتر ہے۔ انبیاء نفسِ نبوت میں برابر ہیں مگر مراتب و درجات میں متفاوت ہیں جس طرح ان میں نفسِ نبوت کی یکسانیت پر اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علی الاطلاق برتری پر ایمان ضروری ہے۔ اسی طرح تمام کتابوں پر نفسِ وحی کی یکسانیت پر اور قرآنِ مجید کی علی الاطلاق برتری پر ایمان ضروری ہے۔ اگر نبوتِ مصطفوی کو کسی اور نبوت سے فروتر تو درکنار، درجات و مراتب میں مساوی بھی سمجھ لیا جائے تو سمجھیے کہ یہ نبوتِ مصطفوی کے کمالات کا کھلا انکار ہے، یہی حال وحی قرآن پر ایمان لانے کا ہے۔

نبوتِ مصطفوی اور دیگر انبیاء

قرآنِ مجید میں کسی ایک نبی کو دوسرے نبی یا رسول پر ایمان لانے کا صراحتاً یا کنایۃً حکم نہیں دیا گیا۔ ایک ہی وقت میں متعدد انبیاء تشریف لاتے رہے، ان پر کتابیں اور صحیفے بھی نازل کیے جاتے رہے مگر اس کے باوجود ان میں سے کسی ایک کی نبوت کو اس شرط کے ساتھ مشروط نہیں کیا گیا کہ دوسرے نبی پر ایمان رکھتا ہو حالانکہ ہر نبی کا دوسرے نبی کی نبوت کو ماننا جزوِ ایمان تھا اور وہ ایک دوسرے پر اس معنیٰ میں ایمان بھی رکھتے تھے۔ کیونکہ کسی نبی کی نبوت کو نہ ماننا بذاتِ خود کفر ہے اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ایک نبی دوسرے نبی کی نبوت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ وہ تو سب ایک ہی سرچشمے کے فیض یافتہ تھے۔ کہنا یہ ہے کہ قرآن میں اس امر کی صراحت نہیں ملتی کہ کسی ایک نبی یا چند انبیاء کو یہ حکم دیا گیا ہو کہ تم فلاں نبی کی نبوت پر ایمان لاؤ، اسی پر تمہاری نبوت کی صحت و حقانیت کا مدار ہے۔ البتہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک ہستی وہ واحد ذات ہے، جن کی نبوت اور رسالت پر ایمان لانے اور آپ کے مشن کی خدمت کرنے کا حکم تمام انبیاء کو دیا گیا۔ بلکہ ہر ایک سے اس بات کا عہد لیا گیا۔ جسے "مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ" کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

ارشاد ہوتا ہے

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ۭ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰي ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ۭ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ۭ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ [1]

اور (یاد کرو) جب خدا نے پیغبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں، پھر تمہارے پاس وہ پیغبر آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرنے والا (یا مصداق بننے والا ہو) تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی (اور عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اس امر کا اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ لیا (یعنی مجھے ضامن ٹھہرایا) انہوں نے کہا ہاں ہم نے اقرار کیا، خدا نے فرمایا کہ تم اس عہد و پیمان کے گواہ رہو، میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں

آیتِ مذکورہ بالا میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متاخراً تشریف لانے کی غرض و غایت یہ بیان فرمائی گئی کہ آپ اپنی تعلیمات اور کمالاتِ نبوت کے ذریعے ہر نبی کی نبوت و رسالت پر مہرِ تصدیق ثبت فرمائیں گے اور نیز یہ کہ ہر نبی کی رسالت و نبوت پر جن شکوک و شبہات کا ان کے زمانے میں اظہار کیا گیا تھا، ان تمام کا تسلی بخش طریقے پر ازالہ فرمائیں گے اور ان کے حق میں گواہی دیں گے۔ مستزاد یہ کہ ان پر نازل ہونے والی کتابوں کی بشارات کا مصداق کامل بن کر ان کے سچا ہونے کا دائمی ثبوت فراہم کر دیں گے۔

---

[1] آل عمران (۳: ۸۱)

Marfat.com

بہر حال آپ "الحمد" سے "والناس" تک پورے قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ فقط ایک ہی ہستی ایسی ہے جن کی نبوت پر ایمان لانے کا ہر نبی کو حکم دیا گیا تھا۔ اور آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہی ایسی شخصیت ہے جن کے ذریعے گروہِ انبیاء کی نبوتوں کی نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی تصدیق ہوگی۔ ارشادِ خداوندی ہے :

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا [1]

بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمت میں سے احوال بتانے والے گواہ کو بلا لیں گے اور آپ کو ان سب پر گواہ بنا کر طلب کریں گے۔

لہٰذا کائنات کی ابتدا سے انتہا تک کوئی شخص بھی، خواہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے ہو گزرا ہو یا بعد میں، جب تک بلا واسطہ یا بالواسطہ نبوتِ محمدی پر ایمان نہیں رکھتا، اس وقت تک اس کا ایمان ثابت نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر ارشاد فرمایا گیا :

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ [2]

اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس (کتاب) پر جو آپ کی طرف اتاری گئی اور ان پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں۔

اس آیت میں پہلے شریعتِ مصطفوی پر ایمان لانے کا ذکر ہے اور بعد میں دیگر انبیا کی شریعتوں پر۔ حالانکہ زمانی ترتیب کے اعتبار سے معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ قرآنِ حکیم یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ حضور سرورِ

---

[1] النساء (۴ : ۴۱)
[2] البقرہ (۲ : ۴)

Marfat.com

کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گو زمانے کے اعتبار سے سب سے بعد میں تشریف لائے، مگر ترتیبِ ایمان میں نبوتِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ سب پر مقدم ہے۔ اسی لیے اس وقت تک ہمارا ایمان کامل نہیں ہو سکتا، جب تک پہلے حضور کی نبوت پر اور آپ کی وساطت سے بعد میں دیگر انبیاء علیہم السلام پر ایمان نہ لے آئیں۔

جس طرح سب سے متاخر آنے کے باوجود کمالاتِ نبوت میں آپ کا درجہ سب سے بلند ہے، آپ کا کوئی ثانی وسہیم نہیں، بعینہ اسی طرح آپ پر نازل شدہ کتاب قرآن مجید سب سے آخر میں اترنے کے باوجود سب سے بلند ہے اور اس کا بھی کوئی ثانی نہیں۔ اس کتاب کی رفعت و عظمت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ارشاد ہے کہ اگر ہم اس کتاب کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ پہاڑ اس کے بوجھ اور خشیت سے ریزہ ریزہ ہو جاتا[1]۔ مگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر نے اس کتابِ مبین کو نہ صرف اپنے سینے میں سمویا بلکہ اسے انفس و آفاق تک پہنچانے کا فریضہ بھی پوری طرح انجام دیا۔

یہ کتاب جس مہینے میں نازل ہوئی وہ مہینہ تمام مہینوں کا سردار ہے، جس رات میں نازل ہوئی وہ شب ہزار مہینوں سے افضل ہے، جس اُمت پر نازل ہوئی وہ اُمت تمام اُمتوں سے فائق ہے۔ مگر اس کتاب کی عظمت کو فی الواقع تبھی مانا جا سکتا ہے جب یہ معلوم کیا جائے کہ یہ کتاب کیا کہتی ہے اور اپنے ماننے والوں سے کیا چاہتی ہے۔ بالفاظ دیگر علم اور عمل دونوں لحاظ سے اس پر ایمان لانا از بس ضروری ہے۔

---

[1] حشر (۵۹: ۲۱)

Marfat.com

Marfat.com

باب دوم

ایمان بالکتب کے تقاضے

Marfat.com

Marfat.com

○

گذشتہ صفحات میں یہ بات واضح کی گئی تھی کہ جس طرح تمام انبیا علیہم السلام کی نبوتوں اور رسالتوں کا مبدأ و منتہا رسالتِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے اور ان پر ایمان لانا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ سب سے پہلے نبوتِ مصطفوی پر ایمان لایا جائے اسی طرح حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل شدہ کتاب یعنی قرآن مجید بھی تمام کتبِ سابقہ کا مبدأ و منتہا ہے اور گذشتہ کتابوں اور صحیفوں پر ایمان اس امر کو مستلزم ہے کہ قرآن پر بھی ایمان لایا جائے۔

زیرِ نظر خطبے میں مندرجہ ذیل نکات پر روشنی ڈالی جائے گی :

۱۔ وحی ربّانی ایک مربوط سلسلہ ہے یا کہ اتفاقی امر ؟

۲۔ اگر اس کا جواب مثبت میں ہے تو پھر ایمان بالکتب کے تقاضے کیا ہیں ؟

۱۔ وحیِ ربانی ایک مربوط سلسلہ ہے یا کہ اتفاقی امر

وحی ربانی کا سلسلہ سیدنا آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر منتہی ہوا۔ وحی کا یہ سلسلہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا کہ کسی نبی

Marfat.com

یا پیغمبر پر اتفاقاً کوئی خدائی حکم نازل ہوگیا ہو، اور پھر یہ سلسلہ منقطع ہوگیا ہو۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خداتعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل کی جانے والی وحی کو ہر دور میں ایک مستقل سلسلے کے طور پر جاری رکھا۔ اس کے ذریعے ہر نبی اور پیغمبر کو احکام (اوامر و نواہی) بھیجے جاتے رہے، تا آنکہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پر جا کر یہ سلسلہ اپنے منطقی انجام کو پہنچ گیا۔

لہٰذا جس طرح نبوت و رسالت کے اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات کو خاتم الانبیاء کی حیثیت سے ماننا ضروری ہے، اسی طرح تمام کتب و صحفِ آسمانی میں قرآنِ کریم کو خاتم الکتب کے طور پر تسلیم کرنا لازمی ہے۔ جس طرح آپ کی ذاتِ گرامی کے بعد کسی شخص کا نبی ہونا ممکن نہیں، اسی طرح قرآنِ حکیم کے بعد کسی رنگ میں بھی کسی آسمانی کتاب یا صحیفے کا نزول ناممکن ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں شرطِ ایمان کے طور پر ارشاد فرمایا گیا:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ	اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس
اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ	کتاب پر جو (اے محمدؐ) آپ پر نازل ہوئی
مِنْ قَبْلِكَ [1]	اور ان کتابوں پر جو آپؐ سے پہلے نازل ہوئیں۔

اس آیت میں صرف دو قسم کی وحی پر ایمان رکھنے کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی وہ وحی جو آپؐ کی طرف یا آپ سے پہلے اُتری۔ اگر اس دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد امکاناً بھی کسی شخص پر نزولِ وحی کی گنجائش ہوتی یا کسی بھی رنگ میں کسی فرد پر نزولِ ہدایت کا امکان ہوتا تو قرآنِ کریم کی مندرجہ بالا ہدایت میں وَمَا يُنْزَلُ مِنْ بَعْدِكَ (اور جو کچھ آپؐ کے بعد نازل ہوگا) کا بھی اضافہ ہوتا۔ اسی لیے ایمان بالکتب کے ضمن میں یہ تسلیم کرنا بھی لازمی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

[1] البقرہ (۲:۴)

Marfat.com

پر نزولِ وحی کے بعد یہ سلسلہ قیامت تک کے لیے منقطع ہو گیا ہے۔ اب جب کہ یہ امر ثابت ہو گیا کہ وحی الٰہی ایک مربوط سلسلہ ہے نہ کہ ایک اتفاقی امر تو ہم دیکھیں گے کہ ایمان بالکتب کے تقاضے کیا ہیں۔

۲۔ ایمان بالکتب کے تقاضے

ایمان بالکتب کے کچھ تقاضے ہیں، جنہیں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

پہلا تقاضا، دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے وحی الٰہی کو ناگزیر جاننا

ایمان بالکتب کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے حواس و ذرائع نیز عقل و دانش سے حاصل ہونے والے علوم پر (خاص طور پر اُخروی اور مابعد الطبعیاتی حقائق میں) کامل اعتماد کے بجائے دنیا و آخرت کی کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی کتب ہدایت پر مکمل یقین رکھے، اس کے احکام پر عمل کرنے کو فلاح و نجات کا واحد سبب جانے، زندگی کی ہر منزل میں کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے لیے وحی الٰہی پر مبنی علم کی ضرورت و احتیاج کو صدق دل سے تسلیم کرے۔

دوسرا تقاضا: وحی الٰہی کو ہر قسم کے امکان خطا سے پاک ماننا

ایمان بالکتب کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ حواس و عقل اور فکر انسانی کے تراشیدہ علوم کو حقیقت کی معرفت کا یقینی ذریعہ تصور نہ کیا جائے۔ ان سے استفادہ انسانی زندگی کی اہم ضرورت ہے، اسے ہر حال میں قائم رکھنا چاہیے۔ لیکن علم کے میدان میں حتمی و قطعی سند وحیِ الٰہی کو حاصل ہے، انسان کی نفسی استعدادوں پر مبنی

Marfat.com

علم کو نہیں۔ وحی کے ذریعے سے حاصل ہونے والا علم ہر قسم کی خطا اور غلطی سے برتر ہوتا ہے، اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ گویا ضروری ہے کہ انسان اسے حتمی اور قطعی علم کا واحد ذریعہ خیال کرے۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم کے آغاز ہی میں اعلان کیا گیا:

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ؎ — یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

تیسرا تقاضا: نزولِ وحی کے مستقل سلسلے پر ایمان رکھنا

ایمان بالکتب کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ انسان یہ گمان بھی نہ کرے کہ وحی سماوی کا نزول کوئی اتفاقی یا حادثاتی واقعہ تھا اور اسی بنا پر کسی فرد یا شخصیت تک محدود ہو کر رہ گیا، بلکہ وہ نزولِ وحی اور نزولِ ہدایت کے اس پورے نظام پر ایمان رکھے جسے اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے لے کر بعثتِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک قائم رکھا۔ انسان کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ جس طرح نظامِ رسالت کا ایک مستقل سلسلہ قائم کیا گیا ہے، اسی طرح ان انبیا کو دی جانے والی کتب و صحائف کا بھی ایک مربوط سلسلہ قائم ہے، ان کا بھی آغاز و اختتام ہے۔ لہٰذا ایمان بالکتب کسی ایک کتاب پر ایمان لانے سے نہیں، بلکہ پورے سلسلۂ وحی پر ایمان لانے سے عبارت ہے۔

اسی بنا پر سورۂ مومن میں قومِ فرعون کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا:

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ — اور پہلے، یوسف بھی تمہارے

؎ البقرہ (۲:۲)

Marfat.com

مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ حَتّٰٓى اِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا [1]

پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔ اس کے بارے میں تم شک ہی میں مبتلا رہے یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گئے تو تم کہنے لگے کہ خدا اس کے بعد کوئی اور پیغمبر نہیں بھیجے گا۔

چوتھا تقاضا : وحی کو ایک خارجی حقیقت اور عطیۂ الٰہی تسلیم کرنا

وحی کو کسی بھی انسان کی مخفی صلاحیت یا وجدانی و روحانی کیفیت تصور نہ کیا جائے بلکہ اسے خالصتاً باری تعالیٰ کا عطیہ تسلیم کرتے ہوئے خدا کی طرف سے نازل شدہ امر مانا جائے جو کسی بھی برگزیدہ شخص کو محض روحانی کمالات کے نتیجے میں میسر نہیں آسکتا۔ یہ صرف مرتبۂ نبوت کے ساتھ خاص ہے۔[2]

پانچواں تقاضا : قرآن کو سلسلۂ وحی کا جامع اور خاتم ماننا

ایمان بالکتب کا ایک اور تقاضا اس حقیقت پر ایمان رکھنا ہے کہ قرآنِ حکیم

---

[1] المؤمن (۴۰ : ۳۴)

[2] اسی بنا پر ارشاد فرمایا گیا :

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

(الجن، ۷۲ : ۲۶-۲۷)

(وہی) غیب کی بات جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا، ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے تو اس پر اپنا غیب آشکار کر دیتا ہے۔

Marfat.com

اس دنیا کی آخری کتاب ہے۔ یہ سلسلۂ کتب کی خاتم ہے اور یہ کہ اس قرآن کے بعد کوئی اور آسمانی کتاب یا صحیفہ نازل نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہدایتِ ربانی کے تمام احکام، تعلیمات اور ہدایات اول سے آخر تک قرآن میں جمع کر دی گئی ہیں۔

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بار بار نزولِ وحی کا ایک خاص مقصد تھا اور وہ یہ کہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو رشد و ہدایت کا رستہ دکھایا جائے۔ چونکہ ہر نبیؑ کی نبوت اور اس کا دائرۂ کار محدود ہوتا تھا، اسی بنا پر ان کا پیغام بھی محدود انسانوں تک پہنچ پاتا تھا۔ رسل و رسائل اور تحریر و کتابت کی سہولتوں کے فقدان یا ان کے غیر تسلی بخش نظام کی بنا پر ان کے پیغامات دور دراز کے انسانوں تک نہیں پہنچ پاتے تھے اور زیادہ دیر تک محفوظ بھی نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی لیے جب ایک نبی کا زمانۂ نبوت قریب الاختتام ہوتا تو نئے نبی کو مبعوث کر دیا جاتا۔ مگر یہ نظام ہمیشہ کے لیے نہ تھا۔ انسانیت اپنی ارتقائی منازل طے کر رہی تھی اور اس کے ساتھ اس کی تمام قدریں، تقاضے، وسائل اور مسائل بھی مائل بہ ترقی تھے اور سلسلہ ارتقاء ہمیشہ اپنے منتہائے کمال پر پہنچ کر ہی رکتا ہے لہٰذا محض یہ تھا کہ یہ ارتقاء کسی آخری منزل کے تعین کے بغیر ہمیشہ جاری رہتا۔ اسے بہرحال اپنے نقطۂ عروج اور منزلِ کمال تک پہنچ کر ختم ہو جانا تھا۔ انبیاء آتے رہے، وحی و نبوت آگے بڑھتی رہی۔

گروہِ انبیاء میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ ہستی ہیں جن کی ذاتِ گرامی میں سلسلۂ نبوت اپنے منتہائے کمال کو جا پہنچا اور جب کمالاتِ نبوت کا کوئی درجہ باقی نہ رہا تو آپ کے بعد کسی قسم کی نبوت و رسالت کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔ اسی طرح

Marfat.com

قرآن کریم وہ آخری آسمانی کتاب ٹھہری جس پر وحیِ ربانی کا سلسلہ اپنے انجام و کمال کو پہنچا، لہٰذا اب اس کتاب کے بعد نہ تو کوئی کتاب نازل ہو سکتی ہے اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی آسمانی ہدایت۔ جس طرح ختمِ نبوت کا تقاضا یہ تھا کہ حضورؐ کی نبوت کے بعد انسانیت نئی نبوت و رسالت سے بے نیاز کر دی جائے اسی طرح وحیِ مصطفوی کی عظمت کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے بعد انسانیت کو نئی کتابِ ہدایت کی ضرورت سے مستغنی کر دیا جائے۔

بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ سرتاجِ نبوت و رسالت اس دنیا میں رونق افروز ہوں اور انسانیت کو کسی اور نبوت و رسالت کی ضرورت باقی رہ جائے یا ہر زمان و مکاں پر محیط عالمگیر نبوت موجود ہو، پھر بھی کوئی اور شخص نبوت کا دعویٰ کرتا پھرے۔
اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی کا ایک ایک حرف اپنی اصل شکل میں موجود اور پوری طرح محفوظ ہو، آپ کے تمام پیغامات و ارشادات مرتب و مدوّن صورت میں پائے جاتے ہوں، پھر بھی کسی اور کتاب یا صحیفۂ ہدایت کی ضرورت باقی رہ جائے۔ یہ تو معاذ اللہ نبوتِ مصطفویؐ اور وحیِ مصطفویؐ (قرآنِ کریم) کی کھلی توہین ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی نئی پیغمبرانہ قیادت یا جدید صحیفۂ ہدایت کی جستجو کی جائے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں تھا۔
اسی بنا پر سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات میں کھلے لفظوں میں انقطاعِ وحی اور انقطاعِ نبوت کا اعلان کر دیا گیا:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ[1]

(اہلِ ایمان وہ ہیں) جو (صرف) آپ پر نازل ہونے والی اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی وحی پر ایمان رکھتے ہیں

---

[1] البقرہ (۲:۴)

Marfat.com

اسی لیے ایمان بالکتب کا پانچواں تقاضا یہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم الانبیاء اور قرآنِ کریم کو خاتم الکتب تسلیم کیا جائے۔ اور یہ یقین رکھا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جس طرح کوئی نبی نہیں آسکتا، اسی طرح قرآنِ حکیم کے بعد کوئی آسمانی کتاب یا صحیفہ نازل نہیں ہوسکتا۔ اب قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے قرآنِ کریم ہی کی ہدایت کافی ہے۔ یہی ابدالآباد تک نتیجہ خیز رہے گی اور ہر دور میں اسلامی انقلاب کی جد وجہد اسی کی روشنی میں اپنے انجام کو پہنچے گی۔

چھٹا تقاضا، تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے اصلاً حق ہونے پر ایمان رکھنا

ایمان بالکتب کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السّلام پر نازل ہونے والی کتابوں، صحیفوں اور اسلامی تعلیمات کو بھی اصلاً برحق تسلیم کیا جائے۔ ہر چند کہ نزولِ قرآن سے پہلے کی کتابیں منسوخ ہوچکی ہیں اور مرورِ زمانہ کے باعث ان کی تعلیمات تحریف و ترمیم کا شکار ہوچکی ہیں۔ ان انبیاء و رسل کے زمانہ ہائے نبوت و رسالت کو بھی ختم ہوئے مدتِ مدید گزر چکی ہے لیکن اس کے باوجود ان انبیاء کی نبوتوں پر ان پر نازل ہونے والی وحی اور ان کی تعلیمات کے برحق ہونے پر یقین رکھنا ایمان کی بنیادی شرائط میں سے ہے۔ گویا آج اطاعت و اتباع تو صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی فرض ہے مگر اس کا معنٰی ہرگز یہ نہیں کہ دوسرے مقتدایانِ انسانیت سے تعصّب برتا جائے، ان کی تعظیم و تکریم کو نظر انداز کر دیا جائے اور ان کی اصل تعلیمات کی نفی کر دی جائے۔ بلکہ ان مقدس ہستیوں کی تعظیم و تکریم کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

Marfat.com

ساتواں تقاضا، حضور علیہ السلام کی نبوت، وحی، تعلیم اور تعظیم کو تمام انبیاء پر مقدم سمجھنا

ایمان بالکتب کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ سرورِ انبیاء صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت و رسالت کو تمام انبیاء و رسل کی نبوتوں اور رسالتوں سے مقدس اور عظیم تر سمجھا جائے اور آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعظیم و تکریم کو سب پر مقدم تصور کیا جائے باوجودیکہ آپ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سب سے آخر میں مبعوث ہوئے ہیں۔

کیونکہ آیت مذکورہ میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل ہونے والی وحی پر ایمان لانے کا ذکر مقدم ہے جبکہ پہلے انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کا ذکر مؤخر

Marfat.com

Marfat.com

باب سوم

قرآن اور دیگر آسمانی کتب پر ایمان میں امتیاز

Marfat.com

Marfat.com

یہاں قدرتی طور پر ذہن میں اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب ایمان بالکتب سے مراد تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان رکھنا ہے، تو پھر قرآن پر ایمان لانے اور کتب سابقہ پر ایمان رکھنے میں فرق کیا ہے؟ کیا انہیں ایک جیسی کتابیں تسلیم کیا جائے اور بیک وقت ان پر یکساں عمل کیا جائے؟ یا ان پر ایمان لاتے ہوئے بعض اُمور میں فرق اور امتیاز بھی ملحوظ رکھا جائے؟۔

یاد رکھیے کہ قرآن اور کتب سابقہ پر ایمان میں بنیادی طور پر چھ امتیازات موجود ہیں جنہیں ہر صورت میں ملحوظ رکھا جانا چاہیے، ورنہ ایمان بالکتب صحت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا امتیاز ــــــ کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کا فرق

قرآنِ کریم اور سابقہ کتب سماوی میں موجود اس فرق کو سمجھنے کے لیے اس

Marfat.com

بات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ کلام کی دو قسمیں ہیں۔ کلام نفسی اور کلام لفظی۔ کلام نفسی کہتے ہیں کلام کے معنیٰ و مفہوم کو یعنی کلام سے جو کچھ مراد ہوتا ہے یا کلام — اور الفاظ جس معنی اور مراد پر دلالت کرتے ہیں یا مخاطب کلام کو سن کر اس کا جو مفہوم اخذ کرتا ہے۔ جبکہ وہ حروف، الفاظ یا عبارت جو متکلم کی زبان سے ادا ہوتی ہے، کلام لفظی کہلاتی ہے۔

اس پس منظر میں قرآنِ کریم اور سابقہ کتب سماوی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی تمام آسمانی کتابیں کلامِ نفسی پر مشتمل تھیں مگر قرآنِ کریم کلام لفظی بھی ہے اور کلام نفسی بھی۔ تورات، زبور، انجیل سمیت تمام کتب اور صحفِ سماوی کی حقیقت یہ تھی کہ قرآن کے معنیٰ و مفہوم انبیاء علیہم السلام کے قلوب پر القا کر دیے جاتے تھے اس نازل شدہ وحی کو انبیاءِ کرام علیہم السلام اپنے مفہوم کا جامہ پہنا کر اُمت کے سامنے پیش کر دیتے۔ گویا مفہوم و منشا تو خدا تعالیٰ کا ہوتا تھا مگر الفاظ و عبارت انبیاءِ کرام علیہم السلام کے وضع کردہ ہوتے تھے۔ چنانچہ تورات، زبور اور انجیل وغیرہ سب کتابیں الفاظ کے اعتبار سے مخلوق، مگر معنیٰ و مفہوم کے اعتبار سے غیر مخلوق تھیں، لیکن قرآنِ مجید الفاظ کے اعتبار سے بھی خدا کا کلام ہے اور معنیٰ و مفہوم کے اعتبار سے بھی۔ یہ الفاظ اور معانی سمیت قلبِ محمدیؐ پر نازل ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ [1]

اس کلام کو امانت دار فرشتہ (حضرت جبرئیلؑ) لے کر نازل ہوا ہے آپ کے قلب پر عربی زبان میں، تاکہ آپ (بھی) نافرمانوں کو ڈرانے والوں میں سے ہوں۔

---

[1] الشعراء (۲۶: ۱۹۳ تا ۱۹۵)

Marfat.com

قرآنِ کریم کے بہت سے مقامات پر اس مضمون کی آیاتِ بینات کے ذریعے یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ اس قرآن کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان کا جامہ پہنا کر نازل کیا۔ ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا — ہم نے اُس کو اتارا قرآن عربی (زبان
عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ[1] — کا) تاکہ تم سمجھ سکو!

ایک لطیف علمی بحث اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ جہاں تک کلامِ نفسی یعنی منشا اور مفہوم کا تعلق ہے، اس کا کسی زبان سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ مثلاً میں یہ کہوں کہ "میں یہاں کھڑا ہوں"۔ ہم اسی مفہوم کو انگریزی یا فارسی وغیرہ کسی بھی زبان میں ادا کر سکتے ہیں۔ الفاظ بدلتے رہیں گے، زبانیں مختلف ہوں گی، مگر معنیٰ اور مراد ایک ہی ہو گی۔ ان الفاظ کا جو معنی آپ کے ذہن میں پیدا ہو گا، اس معنی کی کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔ زبان الفاظ سے عبارت ہوتی ہے، معنیٰ و مراد سے نہیں۔ اس لیے جب یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ "یہ کلام الفاظ کی صورت میں نازل کیا گیا تھا" نہ کہ محض مفہوم و منشا کی صورت میں۔ لہٰذا "الحمد" سے "والناس" تک قرآن مجید کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف اور عبارت کا ایک ایک جزو آسمان سے نازل ہوا، حضور علیہ السلام کا اپنا وضع کردہ نہ تھا۔

قرآنِ مجید سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں ان میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں یہ مذکور ہو کہ یہ کتاب فلاں زبان میں نازل کی گئی۔ انہی وجوہ کی بنا پر قرآنِ کریم پر "الکتاب" کا اطلاق کیا گیا۔ کیونکہ محض معانی و مفہوم کے مجموعے کو

---

[1] یوسف (۱۲ : ۲)

Marfat.com

"الکتاب" نہیں کہہ سکتے، "الکتاب" ہونے کا ایک معنی یہ ہے کہ یہ الفاظ ومعانی دونوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے مکمل کتاب کی صورت میں نازل کیا۔ مستزاد یہ کہ الکتاب ہونا، کلام نفسی اور کلام لفظی کے علاوہ ایک خاص ترتیب کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ کلام کے باہمی ربط و ضبط کے بغیر کتاب کا تصور ممکن نہیں۔ چنانچہ ہر چند کہ قرآنِ حکیم کو ترتیب کتابی کے ساتھ ایک نسخے کی صورت میں خلفائے راشدین کے زمانے میں مرتب کیا گیا لیکن قرآنِ کریم کی یہی ترتیب خود عہدِ رسالت میں موجود بلکہ منزل من اللہ تھی۔

قرآنِ کریم کا نام بھی الہامی ہے

قرآنِ کریم سے پہلے جتنی بھی آسمانی کتابیں بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لیے نازل ہوئیں، وہ اب محرّف ومتبدّل صورت میں جس قوم کے پاس بھی ہیں ان میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں جو خود اپنے نام کی ______ نشاندہی کر رہی ہو۔

توراۃ، جس کا نام آج خمسہ موسوی ہے، کا مطالعہ فرمایئے، اسی طرح اناجیلِ اربعہ کا مطالعہ فرمایئے۔ ان میں سے کوئی ایک فقرہ یا آیت ایسی نہیں جو اس کتاب کا اصل نام بتا دے۔ یہی حال زبور کا ہے اور پھر پوری بائیبل کا مطالعہ فرمالیں جس کے دو حصے "عہد نامۂ قدیم" اور "عہد نامۂ جدید" ہیں، اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں کہ یہ کتاب بائیبل ہے۔ اس کے برعکس قرآن حکیم کا یہ عظیم امتیاز ہے کہ یہ از خود اپنے نام کی ستر مرتبہ نشاندہی کرتا ہے، مثلاً ارشاد باری ہے:

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ[1] بیشک یہ قرآن کریم ہے۔

---

[1] الواقعہ (۵۶ : ۷۷)

Marfat.com

نیز فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ[1] — بلکہ وہ قرآن مجید ہے۔

چنانچہ اس سے یہ امر اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ کلام پاک کا نام قرآن کریم یا قرآن مجید خارجی طور پر مجوّزہ نہیں، بلکہ یہ خود قرآن کا اپنا بیان کردہ ہے اور اس کا یہ عنوان بھی قرآن ہی کی طرح منزّل من اللہ ہے۔

دوسرا امتیاز — تحریف و تبدّل سے محفوظ ہونا

واقعہ یہ ہے کہ کتبِ سابقہ اگرچہ معانی کی حد تک کلام الٰہی تھیں لیکن الفاظ و عبارات کے اعتبار سے انبیاء کرام کی وضع کردہ تھیں اور ظاہر ہے وہ انسان تھے اور انسان کے کلام میں ردّ و بدل کیا جانا ممکن ہے مزید براں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت کا کوئی وعدہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے ان کتب میں ردّ و بدل ہو گیا۔ مگر قرآن مجید کی نوعیت ان سے سراسر مختلف ہے وہ چونکہ نفسِ مضمون اور الفاظ دونوں اعتبار سے کلام الٰہی ہے۔ اسی لیے ہر اعتبار سے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا۔ قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ[2] — ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

"حفاظتِ قرآن" کا یہ وعدہ صرف الفاظ و حروف ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ عبارتِ قرآنی اور اس کے معانی و مطالب دونوں کو شامل تھا۔ اسی بنا پر ایک

---

[1] البروج (۸۵ : ۲۱)

[2] الحجر (۱۵ : ۹)

Marfat.com

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا،

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَقُرْاٰنَہٗ فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ لہ

بیشک ہمارے ہی ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا۔ جب ہم اس کو پڑھوا چکیں تو آپ اُس کے پڑھے ہوئے کی پیروی کیجیے۔ پھر اس کا بیان بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

اس سے پہلے کسی الہامی کتاب کے متعلق خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ کتابیں ضرور آسمان سے نازل کی گئیں، ان کی تلاوت پر ثواب بھی رکھا گیا۔ مگر ان کی حفاظت، جمع و تدوین اور بیان کی ذمہ داری خدا تعالیٰ کی طرف سے اس امت کے لوگوں پر عائد کر دی گئی تھی۔ وہ چاہتے تو ان کی حفاظت کرتے چاہتے تو اس میں ردّ و بدل کر ڈالتے لیکن قرآن کے بارے میں خدا کا وعدہ یہ ہے کہ نہ صرف اس کی قرأت اس کے ذمے ہے بلکہ اس کو کتابی صورت میں جمع کرنا اور اسے محفوظ رکھنا۔ پھر اس کی ٹھیک ٹھیک توضیح و تشریح کو ابدالآباد تک قائم رکھنا بھی خود اُسی کی ذمہ داری ہے۔

اگرچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کام انسانوں ہی نے انجام دیا اور اب بھی دے رہے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کام توفیقِ خداوندی کا ایک حسین پہلو ہے کہ وہ اپنے جن بندوں پر مہربان ہوتا ہے، انہیں اپنی کتاب کی خدمت کی توفیق عطا کر دیتا ہے۔ اس لحاظ سے افراد کا انتخاب اور ان سے ان کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق خدمتِ قرآن کا کام لینا، نیز انہیں اس راہ میں کھڑے ہونے

لہ القیامہ (۷۵ : ۱۷ تا ۱۹)

Marfat.com

کی قوت بخشنا سراسر—— خداوند تعالیٰ کی مہربانیوں اور اس کی بے پناہ عطاؤں کا ثمرہ ہے۔ لہذا جو شخص قرآن کی کسی بھی اعتبار سے خدمت کر رہا ہے، اس کے لیے یہ مقامِ شکر اور مقامِ مسرت ہے کہ اس پر اس کے خالق و مالک کی نگاہِ انتخاب پڑ گئی اور اسے بہت سے دوسرے انسانوں سے ممیّز کر کے خاص کام کی تکمیل کے لیے چن لیا گیا ہے صرف خدمتِ قرآن پر ہی کیا موقوف ہے، جو کوئی بھی قرآن کے بتائے ہوئے کسی نیک اور اچھے کام میں مصروف ہے، اسے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ہائے شکر بجا لانے چاہییں کہ اسے اس کے آقا نے اپنے کام کے لیے منتخب کر لیا ہے۔

شکر پر اضافی انعام کا وعدہ

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ انسانوں پر خدا تعالیٰ کے انعامات و اعزازات کی کوئی انتہا نہیں ہے کسی بندے کو خدا تعالیٰ نے فہم و ذکا کی دولت عطا کی تو کسی کو توانا و خوبصورت جسم مرحمت فرمایا۔ کسی کو حسن و جمال کی نعمت سے آراستہ کیا تو کسی کو مال و دولت سے غنی کیا، اسی طرح کسی کو قوت و اقتدار بخش کر دوسروں پر حکمرانی نصیب فرمائی۔ یہ سب نعمتیں اگر خدا کی مرضی کے مطابق استعمال ہوں یعنی انسان کا مطلوب و مقصود رضائے الٰہی اور اس کے دل و دماغ میں خدا کے شکر کے جذبات موجزن رہیں تو یہ نعمتیں دنیا و آخرت کی سعادتوں کا ذریعہ ہیں اس لیے ارشاد فرمایا گیا۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ [1]	اگر تم شکر ادا کرو گے تو تم کو اور زیادہ نعمت دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو یہ سمجھو کہ میرا عذاب بڑا سخت ہے۔

---

[1] ابراہیم (۱۴ : ۷)

Marfat.com

اگر ان نعمتوں کے مل جانے سے بندہ فرعون و ہامان بن جائے اور یہ کہنے لگے کہ انہیں میں نے اپنی استعداد اور قابلیت ولیاقت سے حاصل کیا ہے، تو ایسا شخص باری تعالیٰ کی نعمتوں اور خاص لطف وکرم سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

ہم زندگی میں اکثر دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو سرمایہ اور دولت ملتی ہے، مگر پھر چھین لی جاتی ہے۔کسی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں پھر محروم کر دیے جاتے ہیں۔نیکی اور بھلائی کی توفیق ملتی ہے، مگر پھر یک لخت بدبختی اور شقاوت مسلط ہو جاتی ہے۔اس کی وجہ یہی ناشکرا پن ہے۔لہذا جس نعمت پر دوام واستمرار مقصود ہو، اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ جوں جوں خدا تعالیٰ کی نعمتیں بڑھتی جائیں، بندہ شکر گزار ہو کر زیادہ جھکتا چلا جائے کیونکہ شاخ پر جتنا زیادہ پھل لگتا ہے، وہ اتنی ہی جھکتی چلی جاتی ہے۔شاخ کا جھک جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ ثمر دار ہے۔

شکر ادا کرنے کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ بندہ ہر حالت اور ہر کیفیت میں اپنے دل وزبان سے شکر وحمد جاری رکھے۔شکر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ بندہ خدا تعالیٰ کی اس نعمت پر سانپ بن کر نہ بیٹھ جائے، بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ نے اس کو اس نعمت اور دولت سے آشنا کیا، اس کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ دوسروں کو ان نعمتوں میں شریک کرے۔خواہ نعمت علم کی ہو یا سرمایہ ودولت کی۔

خدا تعالیٰ کے خزانۂ لطف وکرم میں کوئی کمی نہیں یہ کمی بندے کے اپنے ظرف میں ہوتی ہے۔اگر بندہ خدا تعالےٰ کی بے پایاں نعمتیں حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیئے کہ وہ ان نعمتوں کو خلق خدا میں زیادہ سے زیادہ تقسیم کرے۔خدا کی مخلوق کو اسکی عطا کردہ نعمتوں سے نوازنا ہی اس کا شکر بجالانا ہے۔

Marfat.com

ایک بزرگ کا واقعہ

اس سلسلے میں ایک بزرگ کا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ان کا ایک اکلوتا جوان سال بیٹا رحلت کر گیا۔ جنازہ اُٹھا اور لوگ میت کو تدفین کے لیے قبرستان لے جانے لگے تو اس بزرگ کا حال یہ تھا کہ قدم قدم پر سجدہ بجا لا رہے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے: "اے اللہ! یہ نعمت بھی تو نے ہی عطا کی تھی اور اس امانت کو تو نے ہی واپس لیا ہے۔ مجھے صرف اتنا بتا دے کہ اس نعمت کا چھن جانا میری کسی خطا کی وجہ سے ہے یا تیری مشیت کی وجہ سے؟ اگر یہ میری خطا کا نتیجہ ہے تو مجھے معاف فرما اور اگر اسی میں تیری رضا شامل ہے تو بیشک باقی سب کچھ بھی لے لے اور اپنی رضا عطا فرما۔"

خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کی یہی شان ہوتی ہے۔ نعمتوں کے عطا ہونے پر تو شکر ادا کرتے ہی ہیں ان کے چھن جانے پر بھی شکر و سپاس سے منہ نہیں موڑتے۔ جب انسان کا خدا تعالیٰ سے تعلق بندگی اس طرح استوار ہو جاتا ہے تو یہ رشتہ انسان کو سود و زیاں کے خیال سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں پر کلام الٰہی کے معارف منکشف ہوتے ہیں چنانچہ قرآن کریم کی خدمت کرنا، اس کی اشاعت و تبلیغ کے لیے توفیق کا میسر آنا خداوند تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت پر اگر اس ذاتِ کریم و رحیم کا شکر ادا کیا جائے، تو اس کا وعدہ یہ ہے کہ وہ اس نعمت میں اضافہ کر دے گا اور اگر انسان ناشکرے پن کا اظہار کرے یا اس پر فخر و مباہات کرنا چاہے تو خطرہ ہے کہ کہیں یہ دولت اس سے چھین نہ لی جائے اور وہ اس کے ثمرات و برکات سے محروم نہ ہو جائے۔

Marfat.com

تیسرا امتیاز — قرآن مجید کا ناسخ اور کتبِ سابقہ کا منسوخ ہونا

قرآن کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام کُتُب سابقہ کا ناسخ ہے یعنی نزولِ قرآن کے بعد تمام سابقہ کتابیں منسوخ ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کے احکام پر عمل کرنا نزولِ قرآن سے پہلے ان کے اپنے اپنے زمانے میں ضروری تھا لیکن نزولِ قرآن کے بعد ان پر عمل متروک ہو گیا۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا [1]

ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں۔

مزید براں سورۃ البقرہ کی مذکورہ آیت میں : وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ کی تقدیم اور وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ کی تاخیر کا بھی یہی پس منظر ہے کہ قرآن حکیم یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اب اس دور میں انسانیت کی رہنمائی تو قرآن ہی سے ہو گی لیکن کتبِ سابقہ پر ایمان بھی ضروری ہو گا۔ اسی نکتے کی وضاحت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی قابلِ ذکر ہے جو آپؐ نے اپنے ایک جلیل القدر صحابی کے ہاتھ میں توریت کا ایک ورق دیکھ کر فرمایا :

"بخدا اس زمانے میں حضرت موسیٰؑ ہوتے تو ان کی نجات بھی اسی میں تھی کہ وہ میری پیروی کرتے۔"

آپؐ کا یہ فرمان میثاق النبیین کے تصوّر (جس کا ذکر سابقہ خطبے میں آچکا ہے) کی روشنی میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے، کیونکہ ہر نبی سے یہ اقرار لیا جاتا رہا کہ وہ

---

[1] البقرہ (۲ : ۱۰۶)

Marfat.com

نبی آخرالزمان کی آمد کے موقع پر انہی کی اطاعت و اتباع اختیار کرے گا۔ پس جب فی الواقع وہ نبی آخرالزمان تشریف لے آئے اور انہوں نے قرآن کو ہی وسیلۂ ہدایت قرار دے دیا تو اب مزید کسی اور کتاب کی گنجائش اور ضرورت کہاں باقی رہ جاتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم تو آج سے چودہ سو سال پہلے نازل ہوا تھا اس وقت کے حالات آج کے حالات سے مختلف تھے۔ اب زمانہ چودہ صدیاں آگے بڑھ چکا ہے، لہٰذا حضورؐ کی سنّت اور قرآنی تعلیمات آج کے انسانوں کی ہدایت اور ان کی فلاح و ہدایت کے لیے ناکافی ہیں (معاذ اللہ) ان کا خیال ہے کہ اس دَور میں صرف مغربی افکار ہی انسان کے دکھوں اور غموں کا مداوا کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ حضور کے گنبدِ خضریٰ کے فیضان سے مایوس اور قرآنی رشد و ہدایت سے محروم ہیں۔ ان کی یہ فکری مرعوبیت درحقیقت ان کی قوت ایمانی کی کمزوری کی مظہر ہے۔ قرآن اور نبوی تعلیمات سے استفادہ و افادہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ان تعلیمات کی سچائی اور ان کے عملی نتائج کی سو فی صد درستی پر پختہ اور کامل یقین ہو مگر یہاں حالت یہ ہے کہ یہ لوگ دولتِ یقین سے تو مکمل طور پر عاری ہیں ہی، مستزاد یہ کہ یہ عمل کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرنا چاہتے اور پھر یہ خواہش بھی رکھتے ہیں کہ آپ ہی آپ وہ سب نتائج حاصل ہو جائیں جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو ان کی عظیم اور بے مثال انقلابی جدّوجہد کے بعد حاصل ہوئے تھے۔

جہاں تک قرآن اور اس کی تعلیمات کا تعلق ہے، قرآنِ کریم نے واضح طور پر انسان کے ہر مرض کا علاج اور اس کے ہر دکھ کا مداوا کیا ہے، اسی بنا پر دوٹوک لفظوں میں یہ کہا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ	اور جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے، ایسے

Marfat.com

هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ؎۱ — لوگ ہی کافر ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے اپنے آخری برگزیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی عارضی، ہنگامی اور غیر مستقل تعلیمات دے کر نہیں بھیجا تھا کہ چودہ صدیاں بیت جانے کے بعد آپؐ کی پیغمبرانہ تعلیمات انسانوں کی تقدیر بدلنے کے قابل نہ رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور کی نگاہِ نبوت آج بھی اسی طرح تقدیرِ انسانیت بدل سکتی ہے جس طرح اس نے پہلے مسلمانوں کی تقدیریں بدلی تھیں، مگر شرط یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی رگوں میں جذبۂ صادق سرایت کر جائے اور اس کے رگ رگ میں قرآن اور اس کی تعلیمات سے حقیقی وابستگی موجزن ہو جائے۔ اسی لیے تو اعلان کیا کہ جو شخص کسی بھی زمانے میں آسمان ہدایت کو چھوڑ کر کوئی اور راہ تلاش کرے گا، ایسا شخص ظالم بھی ہے اور فاسق و کافر بھی۔ نیز ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا،

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؎۲

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپؐ کی طرف نازل کی گئی اور ان پر بھی جو آپؐ سے پہلے نازل کی گئیں، لیکن اپنے معاملات کو فیصلے کے لیے طاغوتی آقاؤں کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کو نہ مانیں۔

؎۱ المائدہ (۵ : ۴۴)

؎۲ النساء (۴ : ۶۰)

Marfat.com

یہ طاغوتی طاقتیں کیا ہیں؟ مغربی سرمایہ دارانہ استحصالی، سامراجی اور اشتراکی تہذیبیں سب طاغوت ہیں جن کے دام تزویر میں آج کا مسلمان گرفتار ہو چکا ہے۔

چوتھا امتیاز —— قرآنِ حکیم کی جامعیت و آفاقیت

قرآن کریم کی ایک اور خصوصیت جو اسے کتب سابقہ سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ قرآن مجید جامع ترین اور کامل ترین کتاب ہے جو ہر دور کے انسانوں کے لیے نتیجہ خیز ہدایت رکھتی ہے۔ جس کے اوراق میں دونوں جہانوں کی کامیابی کے راز مضمر ہیں، جس کی سطور ہر ظاہری اور باطنی مرض کا شافی علاج رکھتی ہیں۔ اسی لیے قرآن کریم میں بار بار یہ صراحت کی گئی:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِىْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا [1]	اور ہم نے اس قرآن میں سب باتیں طرح طرح سے بیان کر دی ہیں، مگر اکثر لوگوں نے انکار کے سوا قبول نہ کیا۔

اسی لیے قرآنِ کریم یہ دعوت دیتا ہے کہ انسان اسی کو اپنا منشورِ حیات بنائے اپنے ہر مرض کا علاج اسی سے کیا جائے، اپنی ہر پریشانی، تکلیف اور خرابی کو اس کے ذریعے رفع کیا جائے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ [2]	اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں۔

---

[1] بنی اسرائیل (۱۷: ۸۹)

[2] الحج (۲۲: ۱۰)

Marfat.com

اگر قرآن میں انسانوں کے ہر دکھ کا مداوا، ہر مرض کا علاج اور جملہ انسانی مشکلات کا حل موجود نہ ہو، تو اس سے بڑھ کر انسانیت پر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے؟ کہ انبیاء کی نئی بعثت بھی ختم کر دی گئی جس کی بنا پر اب کوئی اور پیغمبرانہ قیادت انسانوں کی تقدیر نہیں بدل سکتی، اسی طرح وحی کا بھیجنا بھی موقوف کر دیا گیا جس سے بھٹکی ہوئی انسانیت سہارا پاتی تھی۔

اس سے بڑھ کر (معاذاللہ) اور زیادتی کیا ہو سکتی ہے کہ ایک طرف تو قرآن کریم کے ذریعے گرتی ہوئی انسانی اقدار کی بحالی ناممکن ہو اور دوسری طرف نئے انبیاء کی آمد اور نئی وحی کا نزول بھی روک دیا گیا ہو۔

اس طرح تو خدا تعالیٰ کے "لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْد" ہونے پر حرف آتا ہے، اسی لیے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم انسانیت کے ہر دکھ کا علاج اور ہر مرض کی شفا ہے۔ یہ وہ چشمہ صافی ہے جس سے سیرابی حاصل کرنے والے کبھی ناکام نہیں ہوتے۔

قرآن کی ابدیت

یہاں یہ امر ذہن نشین رہے کہ قرآن کریم ابدالاباد تک بنی نوع انسان کے لیے خداوند تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، جب کہ پہلی کتب ایک خاص اُمت اور ایک خاص زمانے کے لیے ہوتی تھیں۔ قرآن کریم انسانی زندگی کے ہر دور کے لیے نتیجہ خیز ہدایت ہے اس کا دائرہ کسی خاص قوم یا زمانے تک محدود نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً قرآن مجید میں جہاں "وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ" کا اور "أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ" کا ذکر آیا ہے، وہاں "وَمَا يُنْزَلُ مِنْ بَعْدِكَ" کا ذکر بھی آتا۔ حالانکہ قرآن حکیم میں ایسی کوئی صراحت بلکہ کوئی معمولی سا اشارہ

Marfat.com

بھی نہیں ملتا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا زمانۂ اثر کسی خاص صدی یا قرن پر جا کر منتہی نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے انقلاب انگیز احکام — تاریخِ انسانیت کے ہر دور میں نتیجہ خیز اور اثر انگیز رہیں گے۔

قرآن کی جامعیت

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو اوّل سے آخر تک اصلاً تمام حقائق و معارف اور جملہ علوم و فنون کی جامع ہے۔ قرآن خود کئی مقامات پر اس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ [1]

اے محبوب! ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جو ہر شے کا تفصیل بیان کرنے والی ہے۔

شئ کے لفظ کا اطلاق کائنات کے ہر وجود پر ہوتا ہے۔ خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی۔ جو چیز بھی ربّ ذوالجلال کی تخلیق ہے "شی" کہلاتی ہے اور ہر شے کا تفصیلی بیان قرآن کے دامن میں ہے۔ ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ [2]

قرآن ہر شے کی تفصیل بیان کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ [3]

اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے اپنی تخلیق کردہ کوئی چیز ایسی نہیں چھوڑی جس کی تفصیل قرآن میں نہ ہو۔

---

[1] النحل (۱۶: ۸۹)
[2] یوسف (۱۲: ۱۱۱)
[3] الانعام (۶: ۳۸)

Marfat.com

چونکہ ازل سے ابد تک جملہ حقائق اور ماکان و مایکون کے جمیع علوم قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ اِس لیے اس حقیقت کو اس انداز سے بیان کیا گیا ہے :

وَلَا رَطْبٍ وَّ لَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ [1] | اس کائنات میں کوئی خشک و تر چیز ایسی نہیں جس کا بیان کلام پاک میں موجود نہ ہو۔

اس آیت میں دو لفظ استعمال ہوئے ہیں :

رطب اور یابس ، رطب کا معنی تر ہے اور یابس کا خشک ، یہ آیت قرآنی ایجاز اور فصاحت و بلاغت کی دلیل اتم ہے۔ کیونکہ کائناتِ ارض و سما کا کوئی وجود اور کوئی ذرہ ایسا نہیں جو خشک یا تر دونوں حالتوں سے خارج ہو۔ بحر و بر، شجر و حجر، زمین و آسماں، جمادات و نباتات، جن و انس، خاکی ذرات اور آبی قطرات ، حیوانات اور دیگر مخلوقات الغرض عالم پست و بالا کی جس شے کا بھی تصور کر لیجئے وہ یا تو خشک ہوگی یا تر، یا دونوں حالتوں کا مرکب ہوگی، قرآن نے صرف دو لفظ لا رطب و لا یابس استعمال کر کے درحقیقت ساری کائنات کے ایک ایک ذرے کو بیان کر دیا کہ اس کا علم قرآن میں موجود ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے :

وَکُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا [2] | اور ہم نے قرآن میں ہر چیز کا الگ الگ مفصّل بیان کیا ہے۔

علامہ برہان اسی کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

مَا مِنْ شَیْءٍ فَهُوَ فِی الْقُرْاٰنِ اَوْ فِیْهِ اَصْلُهٗ [3] | کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جس کا ذکر یا اس کی اصل قرآن سے ثابت نہ ہو۔

---

[1] الانعام (۶ : ۵۹)
[2] بنی اسرائیل (۱۷ : ۱۲)
[3] الاتقان (۲ : ۱۲۶)

Marfat.com

گویا قرآن میں یا تو ہر چیز کا ذکر صراحت کے ساتھ ملے گا۔ یا اس کی اصل ضرور موجود ہو گی۔ یہ بات لوگوں کی اپنی اپنی استعداد و صلاحیت، فہم و بصیرت اور قوت استنباط و استخراج کے پیش نظر کہی گئی ہے کیونکہ ہر شخص تمام اشیاء علم کی تفصیل و حقیقت قرآن سے اخذ کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔

اگر قدرت کی طرف سے کسی کو نور بصیرت حاصل ہو، انشراح صدر ہو چکا ہو، حجابات اُٹھ چکے ہوں اور رب ذو الجلال نے اس کے سینے کو قرآنی معارف کا اہل بنا دیا ہو تو اسے ہر شے کا تفصیلی بیان بھی نظر آ جائے گا۔

• اسی موقع پر امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اصلاً ذکر کا معنی یہ ہے:

مَا مِنْ شَیْءٍ اِلَّا یُمْکِنُ اِسْتِخْرَاجُہٗ مِنَ الْقُرْاٰنِ لِمَنْ فَہَّمَہُ اللّٰہُ [1]	کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا استخراج و استنباط آپ قرآن سے نہ کر سکیں۔ لیکن یہ علوم و معارف اسی پر آشکار ہوتے ہیں جس کو رب ذو الجلال خصوصی فہم سے بہرہ ور فرما دیں۔

چونکہ ازل سے ابد تک کی تمام حقیقتیں اور جملہ علوم و معارف اپنی ضروری تفصیلات کے ساتھ قرآن کے دامن میں موجود تھے۔ اس لیے یہی معنوی و علمی جامعیت، قرآن کی وجہ تسمیہ قرار پا گئی۔

جامعیتِ قرآن کی عملی شہادتیں

پہلی شہادت | حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی (۶۳ برس) عمر مبارک کا قرآن

---

[1] الاتقان (۲: ۱۲۶)

Marfat.com

سے استشہاد:

امام جلال الدین سیوطی "الاتقان" میں اس ضمن میں یہ آیت نقل کرتے ہیں:

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا [1] — جب کسی کی اجل آجائے تو اللہ تعالیٰ ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں فرماتے۔

قرآن کریم کی یہ آیت جس کا اطلاقِ عمومی ہر انسان کی موت پر ہے۔ اہلِ علم و بصیرت جانتے ہیں کہ اس کے نزول کے وقت اس میں وصالِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ تھا۔

یہ آیت "سورۃ المنافقون" کی ہے جو قرآن مجید کی تریسٹھویں (۶۳) سورۃ ہے پھر یہ آیت بھی سورت کی آخری آیت ہے۔ جس کے بعد ربِ ذوالجلال نے "سورۃ تغابن" کو منتخب فرمایا۔ تغابن "ناپید ہو جانے اور ہست سے نیست ہو جانے" کو کہتے ہیں۔ ۶۳ ویں سورت کے اختتام پر کسی پر وقتِ اجل کے آجانے کا ذکر اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ حضور علیہ السلام کی ظاہری مبارک ۶۳ ویں برس پر اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور اس آیت کے فوراً بعد سورۃ تغابن کا انتخاب مزید صراحت کے لیے تھا کہ اب اس ہستی مبارک کی حیاتِ ظاہری کے ناپید ہو جانے کے بعد انعقادِ قیامت کا ہی دور آئے گا۔ درمیان میں کسی اور نبی یا اُمّت کا دور ممکن نہیں۔ یعنی حضور علیہ السلام کا دورِ نبوّت، روزِ قیامت سے متّصل ہے۔ درمیانی سارے عرصے کو یہی محیط ہے۔ کسی اور کا زمانہ باقی نہیں رہا۔ جیسا کہ حضور علیہ السلام نے خود اپنی درمیان والی انگلی اور انگشتِ شہادت کو ملا کر فرمایا تھا:

انا والساعۃ کھاتین [2] — میں یعنی میرا دور اور قیامت دونوں آپس ان دو انگلیوں کی طرح متصل ہیں۔

---

[1] المنافقون (۶۳ : ۱۱)

[2] ترمذی (۴۴۱۲) ۳۲۴

Marfat.com

جیسے ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ اسی طرح میرے دورِ نبوت اور قیامت کے درمیان کوئی فاصلہ یا زمانہ نہیں۔ گویا یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمرِ مبارک کے تعین کے ساتھ ساتھ آپ کے ختمِ نبوت کے اعلان پر بھی مشتمل ہے۔ اس شہادت سے "قرآن" کی شانِ جامعیت پر روشنی پڑتی ہے۔

دوسری شہادت

امام غزالیؒ سے ایک غیر مسلم نے سوال کیا کہ اجرامِ فلکی یعنی سورج، چاند اور دیگر سیارگان فضا میں جو حرکت کرتے ہیں وہ دو طرح کی ہے۔ ایک سیدھی اور دوسری معکوس۔ مثلاً مشرق سے مغرب کی طرف اور پھر مغرب سے مشرق کی طرف۔ قرآنِ مجید میں ایک کا ذکر تو موجود ہے لیکن دوسری کا کہاں ہے؟ اس پر امام غزالیؒ نے اس غیر مسلم سے سوال کیا کہ پہلی حرکت کا ذکر کس آیت میں ہے؟ اس نے یہ آیت پڑھی۔

كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ [1] — سارے سیارے (فضا میں) تیرتے رہتے ہیں۔ یعنی حرکت پذیر رہتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے فرمایا۔ اسی آیت میں ان کی حرکتِ معکوس کا ذکر بھی ہے۔ اگر "كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ" کے الفاظ کو الٹ کر کے یعنی معکوس طریقے سے پڑھا جائے یعنی فلک کی ک سے شروع کر کے کلّ کی ک تک پڑھا جائے تو پھر بھی "كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ" ہی بنے گا۔ گویا آیت کے اس حصہ کو سیدھی سمت میں پڑھنے سے سیارگانِ فلکی کی سیدھی حرکت کا ذکر ہے اور معکوس سمت میں پڑھنے سے حرکتِ معکوس کا ذکر ہے۔

(كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ کو الٹی سمت سے پڑھیے، فلک میں آخری حرف ک

---

[1] یٰسین (۳۶: ۴۰)

Marfat.com

ہے۔ پھر "ل" ہے تو یہ "کل" بن گیا۔ اب اُلٹی سمت سے اگلا حرف "ف" ہے اور پھر "ی"۔ اس طرح یہ "فی" بن گیا۔ اس کے بعد "ف" آتا ہے۔ پھر "ل" اور آخری حرف "ک" ہے تو یہ "فلک" ہو گیا۔ چنانچہ اُلٹی ترتیب سے بھی كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ ہی بنتا ہے۔ یہی سیارگان کی سیدھی حرکت ہے اور انہی لفظوں میں اُن کی اُلٹی حرکت بھی مذکور ہے۔[1]

تیسری شہادت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ جلیل القدر صحابی ہیں جن کو حضور علیہ السلام نے ترجمان القرآن کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا اور ان کے بارے میں جبریلِ امین نے یہ خوشخبری بھی دی تھی؛

اِنَّهٗ كَائِنٌ حِبْرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ

عبداللہ ابن عباسؓ اس اُمت کے سب سے بڑے عالم ہیں

آپ فرماتے ہیں؛

لَوْ ضَاعَ لِیْ عِقَالُ بَعِیْرٍ لَوَجَدْتُّهٗ فِیْ کِتَابِ اللّٰهِ[2]

(صحبتِ نبوی کے فیضان سے مجھے قرآن کی اس قدر معرفت حاصل ہو چکی ہے) کہ میرے اونٹ کی رسی بھی گم ہو جائے تو قرآن کے ذریعے تلاش کر لیتا ہوں۔

اُونٹ کی رسی کا گُم ہونا کتنا معمولی واقعہ ہے۔ لیکن اہلِ بصیرت ایسا معمولی سے معمولی واقعہ اور حادثہ بھی قرآن سے معلوم کر لیتے ہیں۔

---

[1] امام غزالیؒ سے متعلق اصل حوالہ راقم الحروف کی نظروں سے نہیں گزرا۔ مجھ سے قبلہ والدِ محترم حضرت علامہ فریدالدین قادریؒ نے بیان فرمایا تھا۔

[2] الاتقان (۲: ۱۲۶)

Marfat.com

اس ضمن میں ایک اور | چوتھی شہادت ___ واقعۂ تسخیرِ ماہتاب اور قرآن" شہادت تسخیرِ ماہتاب

کے واقعہ سے متعلق ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل امریکہ کے تین سائنس دانوں کے ہاتھوں تسخیرِ ماہتاب کا عظیم تاریخی کارنامہ انجام پذیر ہوا تھا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے چودہ سو سال پہلے اعلان کر دیا تھا:

وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ	قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے،
طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ فَمَا	یقیناً تم طبق در طبق اوپر جاؤ گے۔ پس
لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ [1]	انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

اِن تینوں آیات کا باہمی ربط اور سیاق و سباق یہ ہے کہ اس سورت میں قیامت سے پہلے رُونما ہونے والے حادثات اور واقعات کا ذکر ہے۔ مذکورہ بالا آیات سے پہلے اجرامِ فلکی، کائناتی نظام اور بالخصوص نظامِ شمسی کے اہم پہلوؤں کا بیان ہے۔ اسی طرح اس میں کائنات کے اہم تغیرات کا بھی ذکر ہے۔ پھر مختلف قسمیں کھائی گئی ہیں۔ کبھی شفق کی اور کبھی رات کی۔ تیسری قسم چاند کی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے کہ "تم یقیناً ایک طبق سے دوسرے طبق تک پہنچو گے"۔ یعنی تم طبق در طبق پرواز کرو گے۔

اس آیت کی علماء نے متعدد تفسیرات بیان کی ہیں ___ اس کا معنوی اطلاق "واقعہِ معراج" پر بھی کیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے طبق در طبق سے انسانی اعمال و درجات کا بلند ہونا مراد لیا ہے۔ بعض نے حیاتِ انسانی کے مختلف مراحلِ ارتقاء اور احوال مراد لیئے ہیں۔ احادیثِ نبوی سے بھی "حال در حال"

---

[1] الانشقاق (۸۴: ۱۸-۲۰)

Marfat.com

کے معنی کا استشہاد لیا گیا ہے۔ الغرض اس قسم کی متعدد تعبیرات بیان ہوئی ہیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ درست اور ناقابلِ تردید ہیں۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اگر پہلے کسی آیت کی تفسیر بیان کی گئی ہو تو اس کا صرف وہی ایک ہی مفہوم ہوگا۔ باقی مفاہیم، مطالب اور تعبیرات غلط ہوں گی۔ تفسیرِ قرآن کے ضمن میں ایسی بات درست نہیں۔ قرآنِ حکیم کی ایک آیت سے اہلِ علم متعدد تعبیرات اخذ کرتے چلے آئے ہیں اور متقدمین و متاخرین کی کتبِ تفسیر اس پر شاہدِ عادل ہیں۔ مختلف احوال پر انطباق کے اعتبار سے ہر تعبیر اپنی اپنی جگہ درست ہوتی ہے۔ لیکن اس مقام پر ہم اس مخصوص تاریخی واقعہ کے حوالے سے تفسیرِ آیت عرض کرنا چاہتے ہیں۔ اب آیات پر دوبارہ غور فرمائیے:

وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ[1]	قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔
لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ[2]	یقیناً تم ایک سے دوسرے طبق تک اُوپر جاؤ گے۔
فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ[3]	پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان، ربطِ بین الآیات اور نظمِ عبارت کا ایک ایک پہلو بلکہ ایک ایک حرف مستقل مفہوم، نمایاں افادیت اور خاص حکمت و مصلحت کا حامل ہوتا ہے۔ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" سے پہلے متصلاً قرآنِ حکیم کا چاند کی قسم کھانا اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ آگے بیان ہونے والی خفیقت

---

[1] الانشقاق (۱۸:۸۴)

[2] 〃 (۱۹:۸۴)

[3] 〃 (۲۰:۸۴)

Marfat.com

چاند سے ہی متعلق ہو گی۔

لَتَرْکَبُنَّ، رکب یرکب سے مشتق ہے۔ اس کا معنی ہے کسی پر سوار ہونا، اسی سے اسم ظرف مَرْکَبْ نکلا ہے یعنی سوار ہونے یا بیٹھنے کی جگہ۔ گھوڑے پر سوار ہوتے وقت جس پہ پاؤں رکھا جاتا ہے اسے بھی اسی وجہ سے رکاب کہتے ہیں۔

گویا لترکبن کا لفظ اس امر پہ دلالت کرتا ہے کہ یہ اُوپر جانا کسی سواری کے ذریعے ہوگا۔ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں:

الرکوب فی الاصل کون الانسان علیٰ ظہر حیوان وقد یستعمل فی السفینۃ [1]	رکوب اصل میں انسان کے کسی حیوان پہ سوار ہونے کو کہتے ہیں لیکن اس کا استعمال جہاز پر بھی ہوتا ہے۔

لہٰذا اوّلین ترجیح کے طور پہ ہم "لَتَرْکَبُنَّ" کے اصل اور حقیقی معنی کا استعمال مراد لیں گے۔ کیونکہ بعض اوقات کوئی لفظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں پر دلالت کرتا ہے۔ لیکن عام حالات میں جب تک سائنس اور ٹیکنالوجی اس قدر فروغ پذیر نہ ہوئی تھیں کہ انسان زمین سے پرواز کر کے اُوپر کسی دوسرے طبق تک پہنچ سکے۔ اس وقت تک مجازی معنوں کی بنیاد پہ ہی آیت کا مفہوم بیان کیا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ حقیقی معنیٰ کا اطلاق ممکن نہ تھا۔ لیکن آج جب کہ سائنسی ترقی کے دور میں فضائی حدود میں انسانی پرواز نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہو گئی ہے تو لَتَرْکَبُنَّ کا اپنے حقیقی معنیٰ پہ اطلاق بلا شک و شبہ جائز ہوگا۔

---

[1] المفردات، (۲۰۲)

Marfat.com

مزید برآں لَتَرۡکَبُنَّ میں لامِ تاکید اور نونِ ثقیلہ دونوں اظہارِ مقصود میں خصوصی تاکید پیدا کر رہی ہیں جس سے مراد یہ ہے کہ آیت متذکرہ میں بیان ہونے والا واقعہ بہرصورت رُونما ہو کر رہے گا۔ کیونکہ یہ ترکیب مستقبل میں صدورِ فعل پہ دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا یہ آیت پیشینگوئی کے اعتبار سے ایک چیلنج کے طور پہ نازل کی گئی اور لَتَرۡکَبُنَّ کے اعلان سے قبل پے درپے قسموں کا ذکر منکرینِ قرآن کے لیے اس چیلنج میں مزید شدت اور سنجیدگی پیدا کرنے کے لیے تھا۔ مستزاد یہ کہ لَتَرۡکَبُنَّ جمع کا صیغہ ہے اور صیغۂ جمع عام طور پر عربی زبان میں کم از کم تین کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہو گئی کہ لَتَرۡکَبُنَّ کے فاعل کم از کم تین افراد ہوں گے۔ جو ایک طبق سے دوسرے تک پرواز کر کے جائیں گے۔ اب پھر آیات اور ان کی ترکیب ملاحظہ کیجئے:

قرآن قسم کھا کر کہہ رہا ہے کہ "قسم ہے چاند کی جب وہ پورا ہو جائے۔ اے بنی آدم تم میں سے کم از کم تین افراد پرواز کریں گے۔ کہاں سے کہاں تک ؟ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ" ایک طبق سے دوسرے طبق تک۔ پہلا طبق تو یقیناً زمین ہے کیونکہ مخاطب اہلِ زمین تھے اور کسی دوسرے طبق تک جائیں گے۔ دوسرے طبق کا تعین بھی حکیمانہ انداز میں کیا گیا۔ اگر یہاں دوسرے طبق کے لفظ کی بجائے سیدھا چاند ہی کہہ دیا جاتا تو پھر تسخیرِ کائنات کی مہم صرف طبقِ مہتاب تک محصور و محدود ہو کر رہ جاتی جبکہ ربِّ ذوالجلال کو یہ منظور نہ تھا کہ انسان کی پرواز زمین کے بعد چاند پہ جا کر رُک جائے بلکہ وہ چاند کے بعد دیگر اجرامِ فلکی کی تسخیر بھی چاہتا تھا۔ اس لیے لفظِ طبق کو تنوین کے ساتھ عام کر دیا تا کہ یکے بعد دیگرے انسان اجرام و طبقاتِ کائنات کو تسخیر کرتا چلا جائے اور رازِ کائنات فاش کرنے

Marfat.com

کی مہم جاری رہ سکے۔ لیکن پہلا طبق جس پر اولاً انسان پہنچے گا وہ چاند ہوگا۔ اس لیے اس کی قسم پہلے کھائی گئی۔ کیونکہ زمین کے سب سے زیادہ قریب چاند ہی کا طبق تھا۔ باقی سب اس کے مقابلے میں دُور تھے۔ آج سے چودہ سو سال قبل اہلِ زمین کو یہ پیشینگوئی سنائی گئی کہ تم میں سے کم از کم تین شخص کسی چیز پر سوار ہو کر پرواز کریں گے اور زمین کے طبق سے چاند تک پہنچیں گے۔ لیکن تسخیرِ مہتاب کے بعد انسان کی تگ و دو ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ جاری رہے گی۔ اب اسی طرح مریخ کے طبق تک بھی انسان رسائی حاصل کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ انسانی پرواز کی یہ کامیاب کاوشیں دراصل واقعۂ معراج کی صحت و حقانیت پر روشن مادی دلیلیں بنتی جا رہی ہیں۔ بقول اقبالؒ ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ معجزات و کرامات جن کے امکان و وقوع کو انسانی عقل منطقی پیمانوں پر سمجھنے سے قاصر تھی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ نے کسی حد تک ان کے سمجھنے کی مادی اور عقلی بنیادیں فراہم کر دی ہیں۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ امر منکشف ہوتا جا رہا ہے کہ انسان جس کام کو ایک دور میں ناممکن سمجھتا ہے وہ مستقبل میں نہ صرف ممکن بلکہ واقع ہو جاتا ہے۔ اس لیے نام نہاد تعقل پسند طبقے کے انکارِ خوارق کی یہ دلیل کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے اور سمجھ میں نہیں آتی، قابلِ التفات نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عقل کا انحصار صرف محسوسات و مشاہدات پر ہوتا ہے اور جب تک کوئی حقیقت محسوس نہ ہو یا اُس کی کوئی مثل مشاہدے میں نہ آئی ہو۔ عقل اس کے امکان کو کیونکر سمجھ

Marfat.com

سکتی ہے۔ اس لیے عقل کا فیصلہ جزئی و اضافی ہوتا ہے۔ وہ کلی و مطلق نہیں ہو سکتا۔ جب کہ قرآن کا ہر دعویٰ ابدی ہے۔ اس لیے عین ممکن ہے کہ انسانی عقل قرآن کے بعض دیگر دعاوی و اعلانات کو آج ممکن نہ سمجھے۔ لیکن مستقبل کے کسی دور میں وہ سب کچھ ممکن اور واقع نظر آنے لگے۔ لہٰذا محض عقل کے قصورِ فہم کی بنا پر کسی حقیقت کا انکار کر دینا نادانی ہے۔ عافیت ایمان بالغیب ہی میں ہی ہے۔

مزید برآں تسخیرِ مہتاب کی متذکرہ بالا قرآنی تعبیر کی نسبت اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس موقع پر تین امریکی سائنسدانوں میں سے صرف دو چاند کی سطح پر اترے تھے اور تیسرا شخص چاند گاڑی کے اس حصے پر رہا تھا، جو چاند کے گرد گھومتا رہا تھا تاکہ بعد ازاں گاڑی کے چاند پر اترنے والے حصے کو ساتھ ملا کر واپس لا سکے۔ لہٰذا لترکبن کا اطلاق تین افراد پر کیسے ہو گیا۔ یہ اعتراض دراصل غور و فکر نہ کرنے کے باعث پیدا ہو گا۔ بات چاند کی سطح پر اترنے کی نہیں بلکہ چاند کے طبق تک پہنچنے کی ہو رہی ہے اور یہی "لترکبن طبقاً عن طبق" کے الفاظ سے مستفاد ہے۔ اس امر کا اعتراف تو صاحبِ اعتراض کو بھی ہو گا کہ اس طبق تک تو تین ہی افراد پہنچے۔ ایک گاڑی پر چاند کے گرد گھومتا رہا اور دو اس کی سطح پر اتر گئے۔ طبق محض کسی سیارے کی سطح (SOIL SURFACE) کو نہیں کہتے بلکہ کسی سیارے اور اس کے گرد فضائی حدود پر مشتمل ... وسیع و عریض حلقے کو کہتے ہیں۔ جہاں تک اس سیارے کی کشش ثقل (FORCE OF GRAVITATION) اثر انداز ہوتی ہے اور یہ علاقہ یا طبق سیارے کی سطح کے گرد فضا میں ہزاروں میل تک محیط ہوتا ہے۔ جس طرح ہوائی جہاز کی پرواز زمین کی سطح پر نہیں بلکہ اس سے اوپر

Marfat.com

فضا میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہوتی ہے۔ لیکن طبق ارضی میں ہی تصور کی جاتی ہے۔

چنانچہ قرآن بھی طبق ارضی سے پرواز کر کے انسانوں کے دیگر طبقات فلکی تک پہنچنے کی پیشگوئی کر رہا ہے۔ انسان کی ایسی کامیابیوں کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کائنات کے اندر یعنی آسمانوں اور زمینوں کی وسعتوں میں جو کچھ موجود ہے وہ انسان کے لیے تخلیق کیا گیا اور انسان ہی کے لیے مسخر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ [1] — آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے۔

اس کے بعد سورۂ انشقاق کی زیر مطالعہ آیت سے آگے فرمایا گیا:

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ [2] — پس انہیں کیا ہے پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔

اے فرزندان آدم! تم میں سے کچھ افراد زمین سے اُٹھ کر چاند تک پہنچیں گے۔ لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے اس دعوے کے پورا ہو جانے اور اس طبق پر بھی ہماری قدرت کا نظام دیکھ لینے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے ایمان نہ لانے کا ذکر اس بات پہ دلالت کرتا ہے کہ تسخیر ماہتاب کی مہم غیر مسلموں کے ہاتھ سے سر ہوگی۔ آپ نے دیکھ لیا کہ تین غیر مسلم سائنسدان چاند تک

---

[1] الجاثیہ (۴۵: ۱۳)

[2] الانشقاق (۸۴: ۲۰)

Marfat.com

پہنچے، وہاں بھی تخلیقِ خداوندی کے مناظر دیکھے۔ اس کے نظامِ قدرت کا مشاہدہ کیا۔ لیکن قرآنی دعوے کے مطابق ان کی قوم قرآن کی حقانیت پر ایمان نہ لائی۔

تسخیرِ کائنات کے مذکورہ بالا قرآنی بیان کی تصدیق ایک غیر مسلم فرانسیسی سکالر (MAURICE BUCAILLE) نے اپنی کتاب "(THE BIBLE, THE QURAN & SCIENCE) کے صفحات نمبر ۱۶۷ تا ۱۶۹ پر (THE QURAN & MODERN SCIENCE) کے باب میں (THE CONQUEST OF SPACE) کے زیرِ عنوان ان الفاظ سے فراہم کی ہے۔

E. THE CONQUEST OF SPACE.

From this point of view, three verses of the Qur'an should command our full attention. One expresses, without any trace of ambiguity, what man should and will achieve in this field. In the other two, God refers for the sake of the unbelievers in Makka to the surprise they would have if they were able to raise themselves up to the Heavens; He alludes to a hypothesis which will not be realized for the latter.

There can be no doubt that this verse indicates the possibility men will one day achieve what we today call (perhaps rather improperly) 'the conquest of space'. One must note that the text of the Qur'an predicts not only penetration through the regions of the Heavens, but also the Earth, i.e. the exploration of its depths.

1) The first of these verses is sura 55, verse 33: "O assembly of Jinns and Men, if you can penetrate regions of the heavens and the earth, then penetrate them! You will not penetrate them save with a Power."

2) The other two verses are taken from sura 15, (verses 14 and 15). God is speaking of the unbelievers in Makka, as the context of this passage in the sura shows:

"Even if We opened unto them a gate to Heaven and they were to continue ascending therein, they would say: our sight is confused as in drunkenness. Nay, we are people bewitched."

The above expresses astonishment at a remarkable spectacle, different from anything man could imagine.

Marfat.com

When talking of the conquest of space therefore, we have two passages in the text of the Qur'an: one of them refers to what will one day become a reality thanks to the powers of intelligence and ingenuity God will give to man, and the other describes an event that the unbelievers in Makka will never witness, hence its character of a condition never to be realized. The event will however be seen by others, as intimated in the first verse quoted above. It describes the human reactions to the unexpected spectacle that travellers in space will see: their confused sight, as in drunkenness, the feeling of being bewitched . . .

This is exactly how astronauts have experienced this remarkable adventure since the first human spaceflight around the world in 1961.

It is a completely new spectacle therefore that presents itself to men in space, and the photographs of this spectacle are well known to present-day man.

چنانچہ یہ دعوٰے بجا طور پر حق ہے کہ کائنات کے اندر جو کچھ ہو چکا یا ہونے والا ہے۔ اس کا ذکر قرآن کے اندر موجود ہے۔

پانچویں شہادت

جامعیتِ قرآن کی نہایت وقیع اور عملی شہادت یہ بھی ہے کہ قرآن اپنی تعلیمات کے اعتبار سے انسان کی نجی زندگی کی فکری و عملی ضروریات سے لے کر عالمی زندگی کے جملہ معاملات پر حاوی ہے۔ حیاتِ انسانی کا مذہبی و روحانی پہلو ہو یا مادی و جسمانی، عائلی و خاندانی پہلو ہو یا سماجی و معاشرتی، سیاسی و معاشی پہلو ہو یا تعلیمی و ثقافتی، حکومت و سلطنت کی تاسیس ہو یا ادارات کی تشکیل، مختلف طبقاتِ انسانی کے تنازعات و معاہدات ہوں یا اقوامِ عالم کے باہمی تعلقات، الغرض قرآنی احکام و تعلیمات اس قدر جامع ہیں کہ ہر مسئلے میں اُصولی رہنمائی قرآن ہی سے میسر آتی ہے۔

Marfat.com

موضوعات کے لحاظ سے علماء نے آیاتِ قرآنی کی تقسیم بھی کی ہے معروف قول کے مطابق قرآن حکیم کی کل آیات (۶۶۶۶) کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔ آیات امر (۱۰۰۰) آیاتِ نہی (۱۰۰۰) آیاتِ وعدہ (۱۰۰۰) آیاتِ وعید (۱۰۰۰) آیاتِ مثال (۱۰۰۰) آیاتِ قصص (۱۰۰۰) آیاتِ تحلیل (۲۵۰) آیاتِ تحریم (۲۵۰) آیاتِ تسبیح (۱۰۰) آیاتِ متفرقہ (۶۶)

قرآنی احکام کا بیان و استنباط کہیں "عبارۃ النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اشارۃ النص" سے کہیں "دلالۃ النص" سے ہوتا ہے اور کہیں "اقتضاء النص" سے، کہیں اس کا انداز حقیقت ہے کہیں مجاز، کہیں صریح ہے کہیں کنایہ، کہیں ظاہر ہے کہیں مخفی، کہیں مطلق ہے کہیں مقید، کہیں عام ہے کہیں خاص؛ الغرض قرآنی تعلیمات مختلف صورتوں اور طریقوں میں موجود ہیں۔ ان میں اصل احکام (SUBSTANTIVE LAWS) بھی ہیں اور ضابطہ جاتی (PROCEDURAL LAWS) بھی۔ جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا [1] — ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک اصل قانون بنایا اور ایک اس کا ضابطہ و طریقِ کار

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فقہاء اسلام نے تمام شعبہ ہائے حیات سے متعلق قوانین اور اصول و ضوابط کا استخراج اصلاً قرآن ہی سے کیا ہے۔ محقق ابن سراقہ "کتاب الاعجاز" میں جامعیتِ قرآن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

مَا مِنْ شَيْءٍ فِي الْعَالَمِ — کائنات میں کوئی شے ایسی نہیں جس کا

---

[1] المائدہ (۵: ۴۸)

Marfat.com

اِلاَّ وھو فی کتاب اللہ[1]	ذکر قرآن میں موجود نہ ہو۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کوئی شے قرآن میں مذکور نہ ہو تو وہ کائنات میں موجود نہیں ہو سکتی۔ گویا قرآن میں کسی چیز کا مذکور نہ ہونا کائنات میں اس کے موجود نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں کسی چیز کے ذکر یا عدم ذکر کو کائنات میں اس کے وجود و عدم کی دلیل تصور کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امام شافعیؒ نے جامعیتِ قرآن کی نسبت یہ دعوٰی کیا:

سلونی عما شئتم اخبرکم عنہ فی کتاب اللہ[2]	جس چیز کی نسبت چاہو مجھ سے پوچھ لو، میں تمہیں اس کا جواب قرآن سے دوں گا۔

آپ نے حضرت سعید بن جبیرؒ کا یہ قول بھی اپنی کتاب "الام" میں نقل فرمایا ہے:

ما بلغنی حدیث عن رسول اللہ علی وجھہ الاَّ وجدت مصداقہ فی کتاب اللہ[3]	آج تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث مجھے ایسی نہیں ملی جس کا واضح مصداق میں نے قرآن مجید میں نہ پایا ہو۔

چھٹی شہادت — "قرآنی علوم کا بیان"

اسی طرح قرآن علوم کے بیان کے اعتبار سے بھی جامع و مانع ہے۔ دنیا کا کوئی مفید علم ایسا نہیں جس کا سرچشمہ قرآن نہ ہو، قاضی ابوبکر بن عربیؒ

---

[1] الاتقان (۲: ۱۲۶)

[2] الاتقان (۲: ۱۲۶)

[3] الاتقان (۲: ۱۲۶)

Marfat.com

اپنی کتاب "قانون التاویل" میں ابتدائی طور پر قرآنی علوم کی تعداد ستتر ہزار چار سو پچاس (۷۷۴۵۰) بیان کرتے ہیں۔ یہی تعداد قرآنِ مجید کے کلمات کی بھی ہے تو اس سے یہ حقیقت مترشح ہوئی کہ قرآنِ حکیم میں الحمد سے والناس تک استعمال ہونے والا ایک ایک کلمہ کسی نہ کسی مستقل علم اور فن کی بنیاد ہے۔ گویا ہر قرآنی حرف سے کوئی نہ کوئی علم اور فن جنم لے رہا ہے۔

یہاں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی یہ حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن کے ہر حرف کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور پھر ہر ظاہر و باطن کے لیے ایک حدِ آغاز ہے اور ایک حدِ اختتام۔ اس لحاظ سے ہر قرآنی حرف کے چار پہلو متعین ہوئے۔ چنانچہ قاضی ابوبکر ابن عربی مذکورۃ الصدر تعداد کو پھر چار سے ضرب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ درحقیقت قرآنی علوم کی تعداد کم از کم تین لاکھ نو ہزار آٹھ سو (۳۰۹۸۰۰) ہے۔ یہ تو ایک بزرگ کی وسعتِ نظر ہے۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست۔ امام رازیؒ سے پوچھیں تو وہ بتاتے ہیں کہ صرف تعوذ و تسمیہ (اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم) میں لاکھوں مسائل کا بیان ہے اور باقی آیات و کلمات کا تو ذکر ہی کیا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علوم کے اعتبار سے بھی قرآن کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی صحیح تعداد کا نہ شمار ہو سکتا ہے اور نہ اندازہ۔ ایسے اقوال یا تو ان اکابر کی تحقیقات ہیں یا ان کے ذاتی انکشافات۔ درحقیقت قرآنی علوم احصار و تحدید سے ماوراء ہیں۔ کوئی علم ہو یا فن، کوئی صنعت و حرفت ہو یا پیشہ و تجارت، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی کوئی دریافت ہو یا علومِ قدیمہ کی، اس کائنات میں کوئی ایسی شے معرضِ وجود میں نہیں آئی اور نہ آ سکتی ہے، جس کا ذکر خلاقِ عالم نے کسی نہ کسی انداز سے قرآن مجید میں نہ کر دیا ہو۔

Marfat.com

فلسفہ (PHILOSOPHY) تمام علوم کا سرچشمہ اور مبداء تصور کیا جاتا ہے۔ علم طبیعات (PHYSICS) اور علم حیاتیات (BIOLOGY) بھی ابتداءً فلسفے ہی کا حصہ تھے۔ طبیعی کائنات کے حقائق سے بحث کرنے والے علوم یہی تین ہیں۔

فلسفہ شروع سے آج تک تین چیزوں سے بحث کرتا چلا آیا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ علم کیا ہے اور کیونکر ممکن ہے۔ اور انسان کا اعلےٰ ترین نصب العین کیا ہے؟ گویا فلسفے کی بحث حقیقت، علم اور نصب العین سے ہے۔ اسی طرح طبیعات کا موضوعِ تحقیق یہ ہے کہ موجوداتِ عالم اور مظاہرِ طبیعی کا آغاز کب ہوا؟ کس طرح ہوا؟ اور ان مظاہرِ طبیعی کی حرکت کی علّت کیا ہے؟ حیاتیات کا موضوع یہ ہے کہ انسان اور دیگر مظاہرِ حیات کی اصل کیا ہے؟ اور تمام مظاہرِ حیات کی حرکت اور زندگی کی علت کیا ہے؟ تینوں علوم کا خلاصۂ مبحث یہ ہوا کہ:

فلسفہ، کائنات کی حقیقت، اعلیٰ نصب العین اور اس کے علم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ طبیعات، مظاہرِ طبیعی اور ان کی حرکت کو جاننے میں مصروف ہے۔ جب کہ حیاتیات، مظاہرِ حیات کے آغاز اور ان کے ارتقاء کو سمجھنے میں مشغول ہے۔ آج تک یہ علوم اقدام وخطا (TRIAL & ERROR) کے انداز میں اپنی ارتقائی منازل طے کرتے چلے جارہے ہیں اور ان میں سے کسی ایک بھی علم وفن نے یہ حتمی دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے مظاہرِ حیات کے نقطۂ آغاز کو یقینی طور پر جان لیا ہے یا اس نے ان کی حرکت کی علّت کو حتمی طور پر متعین کر لیا ہے۔ اسی طرح فلسفہ آج تک یہ دعوےٰ نہیں کرسکا کہ یہ حقیقت، کائنات کی حتمی وابدی حقیقت ہے۔ ہندوستان کے نوکے نو فلسفے نفسِ ناطقہ کو بھی حقیقت مانتے ہیں اور مادہ کو بھی۔

Marfat.com

○ فلسفہ اور قرآن ہزاروں سال کی انسانی جد وجہد کے باوجود آج تک یہ علوم وفنون اپنی صحت اور کمال کی حتمی منزل کو نہیں پہنچ سکے۔ لیکن آخری الہامی کتاب قرآن کا یہ عالم ہے کہ سورۂ علق کی صرف پہلی ہی پانچ آیتوں نے فلسفے کے تمام مسائل کو حل کر دیا ہے۔ آیات ملاحظہ ہوں:

۱- اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ	پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے (سب کچھ) پیدا فرمایا۔ انسان کو خون
۲- خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ	کے پھٹکے (یا داعیہ محبت) سے تخلیق
۳- اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ	کیا۔ پڑھیے اور آپ کا رب ہی سب سے
۴- الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ	زیادہ بزرگی والا ہے۔ جس نے قلم سے
۵- عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ [1]	لکھنا سکھایا (جس نے) انسان کو وہ سکھا دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اگر غور کریں تو ان آیات میں فلسفہ کے جملہ موضوعات اور ان کے حتمی جوابات بیان کر دیے گئے ہیں۔ فاعتبروا یا اُولی الابصار۔

ان آیات کی تفسیر اور وضاحت اپنے موقع پر کی جائے گی۔ یہاں صرف اس قدر بیان کرنا مقصود تھا کہ اس کائنات کی حقیقتوں کو جاننے کے لیے آج تک تاریخِ انسانی میں جتنی فلسفیانہ کوششیں ہوئی ہیں۔ وہ سب قطعیت وحتمیت سے محروم ہیں۔ لیکن قرآن کی جامعیت وقطعیت کا یہ عالم ہے کہ صرف پانچ مختصر فقرات میں فلسفے کے تمام موضوعات، مسائلِ تحقیق اور ان کے حتمی جوابات

---

[1] العلق (۹۶: ۱ تا ۵) ۲۴۰

Marfat.com

کی نشاندہی کردی گئی ہے۔ اب یہ اہلِ تحقیق کا کام ہے کہ وہ اس رُخ پر ریسرچ کریں اور ان حقائقِ کائنات کی کامل معرفت حاصل کریں۔

○ **سائنس اور قرآن** | اسی طرح طبیعی اور حیاتیاتی سائنس جن مسائل پر تحقیق سے عبارت ہے۔ وہ اصطلاحات کی صورت میں درج ذیل ہیں:

۱۔ تحقیقِ کائنات اور اس کا تشکیلی نظام (CREATION OF UNIVERSE AND ITS STRUCTURAL SYSTEM)

۲۔ زمانہ ہائے تخلیق اور ادوارِ ارتقاء (PERIODS OF CREATION AND ERAS OF EUOLUTION)

۳۔ وجودِ کائنات کی طبیعی اور کیمیائی اساس (PHYSICAL AND CHEMICAL BASIS OF THE FORMATION OF UNIVERSE)

۴۔ زمین اور ظہورِ زندگی (EARTH AND APPEARANCE OF LIFE)

۵۔ ارتقائے حیات کے طبیعی اور کیمیائی مراحل (PHYSICAL AND CHEMICAL PROCESS OF EVOLUTION OF LIFE)

۶۔ اجرامِ فلکی کی ماہیت اور نظامِ کار (NATURE AND PHENOMENA OF HEAVENLY BODIES)

۷۔ انسانی زندگی کا آغاز اور نظامِ ارتقاء (ORIGIN OF HUMAN LIFE AND ITS DEVELOPMENT)

۸۔ نباتات وحیوانات کی زندگی (THE VEGETABLE AND ANIMAL KINGDOMS)

۹۔ افزائشِ نسلِ انسانی کا نظام (SYSTEM OF HUMAN

Marfat.com

PRODUCTION AND SELF PERPETUATION)

ان تمام سائنسی موضوعات پر قرآنِ حکیم نے بہت سا بنیادی مواد فراہم کیا ہے جو اس میں سینکڑوں مختلف مقامات پر مذکور ہے۔ ہم استشہاد کے طور پر یہاں صرف تین مقامات کی نشاندہی کرتے ہیں:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ط وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ص وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ج وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ○ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ○ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ط اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ

کیا ان کافروں نے اس پر غور نہیں کیا کہ کائنات کے بالائی اور زیریں حصے، دونوں باہم پیوستہ تھے یعنی ایک تخلیقی وحدت (UNIT OF CREATION) کی صورت میں موجود تھے۔ ہم نے ان دونوں کو جدا جدا کر کے کھول دیا اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے تخلیق کیا۔ کیا وہ اب بھی ایمان نہیں لائیں گے اور ہم نے زمین کی تیز رفتاری کے باعث اس میں پیدا ہونے والی جنبش کو ختم کرنے کے لیے اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے تاکہ وہ اپنے اوپر بسنے والی مخلوق کو لے کر کانپے بغیر حرکت پذیر رہے اور ہم نے اس میں (بحری، بری اور فضائی) کشادہ راستے بنائے تاکہ لوگ اپنی اپنی منازلِ سفر تک جا سکیں اور ہم نے آسمانی کائنات

Marfat.com

الْخٰلِدُوْنَ ؁ [1]

کو محفوظ چھت بنایا۔ اور (کیا) وہ اس کی نشانیوں سے اب بھی روگرداں ہیں؟ اور وہی ذات ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند جو اپنے اپنے مدار اور فلک میں گردش پذیر ہیں اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر (ارضی مخلوق) کو ایسی ہمیشگی اور دوام نہیں بخشا (کہ وہ ہمیشہ اپنے حال پہ بدلے یا ختم ہوئے بغیر قائم رہی ہو)۔ اگر آپ انتقال فرما گئے تو کیا یہ طعنہ زنی کرنے والے ہمیشہ رہیں گے؟

وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ؁ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؁ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ؁ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ؁ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ؁ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ

حالانکہ اس نے تمہیں نوع بنوع اور درجہ بدرجہ تخلیق کیا۔ یعنی تمہیں تخلیق کے کئی مراحل، ادوار اور احوال سے گزار کر مکمل کیا۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ نے کس طرح آسمانی کائنات کے سات تدریجی طبقات بنائے اور ان میں چاند کو انعکاسی نور سے روشن کیا اور سورج کو چراغ (کی طرح روشنی کا منبع) بنایا۔ اور اللہ نے تمہیں زمین میں سے سبزے

---

[1] الانبیاء (۲۱ : ۳۰-۳۴)

Marfat.com

بسَاطًاہ لِتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ؎

(GENEOLOGICAL TREE) کی طرح اُٹھایا۔ پھر وہ تمہیں اسی میں لے جائے گا۔ اور تمہیں دوبارہ نئی زندگی کے ساتھ باہر نکالے گا۔ اور اللہ نے تمہارے لیے زمین کو بچھایا ہوا قطعہ بنایا۔ تاکہ تم اس کے کشادہ راستوں پر چلو۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ ط اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ہ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ثُمَّ یَعْرُجُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ہ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ

اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں یعنی چھ ادوار میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش یعنی کائنات کے تختِ اقتدار پر جلوہ افروز ہوا اسے چھوڑ کر نہ تمہارا کوئی کارساز ہے نہ سفارشی۔ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے وہ اپنے اوامر اور معاملات کی تدبیر آسمان سے اس لیے کرتا ہے کہ زمین یعنی نچلی کائنات میں ان کا نفاذ اور تعمیل ہو، پھر وہ اُمور رفتہ رفتہ اسی کی طرف اُوپر اُٹھائے جائیں گے اس تدریجی مرحلے کی تکمیل ایک دن (ONE ERA OF EVOLUTION) میں ہوگی جس کا عرصہ تمہارے شمار کے مطابق ہزار سال

؎ نوح (۷۱: ۱۴-۲۰)

Marfat.com

الرَّحِيْمُ ۝ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ [1]

پر محیط ہے۔ وہی ہر نہاں اور عیاں کا جاننے والا (اور) عزت و رحمت والا ہے۔ جس نے ہر اس چیز کو، جسے اس نے پیدا کیا (اس کے حال کے مطابق) نہایت احسن اور مناسب صورت میں تشکیل دیا۔ اور اس نے انسانی تخلیق کی ابتدا زمین کی مٹی یعنی غیر نامی مادے (INORGANIC MATTER) سے کی، پھر اس کی نسل کو کمزور اور بے قدر پانی (DESPISED FLUID) کے نچوڑ سے چلایا۔ پھر اس وجود کو صحیح شکل و صورت دی اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔ یعنی اسے زندگی عطا کی، بعد ازاں تمہیں سماعت اور دل و دماغ (PHYSICAL AND MENTAL FACULTIES) سے نواز دیا، لیکن تھوڑے لوگ ہی ان نعمتوں پر شکر بجا لاتے ہیں۔ یعنی ان کا صحیح استعمال کرتے ہیں۔

اگر آپ مذکورہ بالا تین مقامات پر ہی غور و فکر کریں تو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری

---

[1] السجدہ (۳۲: ۴-۹)

Marfat.com

نہیں ہوگی کہ طبیعات (PHYSICS) اور حیاتیات (BIOLOGY) کے جملہ مسائل پر اُصولی اور بنیادی رہنمائی قرآن میں موجود ہے۔ قرآن کی اسی وسعتِ علمی کا نام "جامعیت" ہے، جو اس کی وجہ تسمیہ ہے۔

ساتویں شہادت ــــ قرآن تمام الہامی کتب کے ثمرات و مطالب کا جامع ہے

تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب اور علوم و معارف کی جامع بھی یہی کتاب ہے۔ امام بیہقی حضرت حسنؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں جن میں کائنات کے تمام علوم و معارف بیان کر دیئے۔ پھر جملہ علوم و معارف کو چار کتابوں (تورات، زبور، انجیل اور قرآن) میں جمع کر دیا۔ پھر ان میں سے پہلی تین کتابوں کے تمام معارف کو قرآنِ حکیم میں جمع فرمایا اور اس طرح یہ قرآن ایسی جامع کتاب قرار پائی کہ ابن ابی الفضل المرسیؒ فرماتے ہیں،

جمع القرآن علوم الاولین والاخرین بحيث لم يحط بها علماً حقيقة الا المتكلم ثم رسول الله صلى الله عليه وسلم[1]

کہ اس قرآن نے اوّل سے آخر تک، ابتدار سے انتہار تک کائنات کے تمام علوم و معارف کو اپنے اندر اس طرح جمع کر لیا ہے کہ فی الحقیقت خدا اور اس کے بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ان کے علوم کا احاطہ نہ کوئی آج تک کر سکا اور نہ کر سکے گا۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے اس سلسلے میں مروی ہے،

---

[1] الاتقان (۲ : ۱۲۶)

Marfat.com

مَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ بِالْقُرْآنِ فَإِنَّ فِيهِ خَيْرَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ [1]

جو شخص علم حاصل کرنا چاہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کا دامن تھام لے۔ کیونکہ اسی قرآن میں ہی اوّل سے آخر تک سارا علم موجود ہے۔

تمام ظاہری و باطنی علوم و معارف کا جامع ہونا، تمام موجوداتِ عالم کے احوال کا جامع ہونا اور تمام آسمانی کتابوں کے ثمرات و مطالب کا جامع ہونا، یہ وہ نمایاں خصوصیات تھیں جن کے باعث اس مقدس کتاب کا نام اللہ تعالیٰ نے "القرآن" رکھا ہے۔

آٹھویں شہادت —— قرآن تمام عقلی و نقلی فنون کا ماخذ ہے

علوم و فنون کے اعتبار سے جامعیتِ قرآن کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ علماءِ اسلام نے جملہ علوم کی انواع و اقسام سب قرآنِ حکیم سے ہی اخذ کی ہیں۔ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں جب علوم و فنون کی باقاعدہ تقسیم اور علم و فن کی تفصیلات مرتب کرنے کا کام سرانجام دیا جانے لگا تو علماء کی ایک جماعت نے لغات و کلماتِ قرآن کے ضبط و تحریر کا فریضہ اپنے ذمہ لیا۔ اس نے مخارجِ حروف کی معرفت، مدِ کلمات کا شمار، سورتوں اور منزلوں کی گنتی، سجدات و علاماتِ آیات کی تعداد و تعین، حصرِ کلمات، متشابہ و متماثلہ آیات کا احصار، الغرض تعرّضِ معانی و مطالب کے بغیر جملہ مسائلِ قرأت کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ ان کا نام قُرّاء رکھا گیا اور اس طرح "علم القرأۃ و التجوید" منصۂ شہود پر آیا۔ بعض نے قرآن کے معرب

---

[1] الاتقان (۲: ۱۲۶)

Marfat.com

مبنی، اسماء و افعال اور حروفِ عاملہ و غیر عاملہ وغیرہ کی طرف توجہ کی تو "علم النحو" معرضِ وجود میں آیا۔ بعض نے الفاظِ قرآن، ان کی دلالت و اقتضاء اور ان کے مطابق ہر حکم کی تفصیلات بیان کیں تو "علم التفسیر" وجود میں آیا۔ بعض نے قرآن کے ادلہ عقلیہ اور شواہد نظریہ کی طرف التفات کیا اور اللہ تعالیٰ کے وجود و بقاء، قدم و وجوب، علم و قدرت، تنزیہ و تقدیس، وحدانیت و الوہیت، وحی و رسالت، حشر و نشر، حیات بعد الموت اور اس قسم کے دیگر مسائل بیان کیے تو "علم الاصول" اور "علم الکلام" وجود میں آئے۔ پھر انہی اصولیین میں سے بعض نے قرآن کے معانیِ خطاب میں غور کیا اور قرآنی احکام میں اقتضاء کے لحاظ سے عموم و خصوص، حقیقت و مجاز، صریح و کنایہ، اطلاق و تقیید، نص، ظاہر، مجمل، محکم، مخفی، مشکل، متشابہ، امر و نہی اور نسخ وغیرہ میں کلام کیا، انواعِ قیاس اور دیگر ادلہ کا استخراج کیا تو فن "اصولِ فقہ" تشکیل پذیر ہوا۔ بعض نے قرآنی احکام سے حلال و حرام کی تفصیلات و فروعات طے کیں تو "علم الفقہ" یا "علم الفروع" کو وجود ملا۔

بعض نے قرآن سے گزشتہ زمانوں اور امتوں کے واقعات و حالات کو جمع کیا اور آغازِ عالم سے قیامت تک کے آثار و وقائع کو بیان کیا۔ اس طرح "علم التاریخ" اور "علم القصص" وجود میں آئے۔ بعض نے قرآن سے حکمت و موعظت، وعد و وعید، تحذیر و تبشیر، موت و معاد، حشر و نشر، حساب و عقاب اور جنت و نار کے بیانات اخذ کیے جس سے "علم التذکیر" اور "علم الوعظ" کی تشکیل ہوئی۔ بعض نے قرآن سے "علم المیراث" اور "علم الفرائض" کی تفصیلات بیان کیں۔ بعض نے رات، دن، چاند، سورج اور ان کے منازل وغیرہ کے قرآنی ذکر سے "علم المواقیت" حاصل

Marfat.com

کیا۔ بعض نے قرآن کے حسنِ الفاظ، حسنِ سیاق، بدیع نظم اور اطناب و ایجاز وغیرہ سے "علم المعانی"، "علم البیان" اور "علم البدیع" کو مدوّن کیا۔ عرفاء کاملین نے قرآن میں نظر و فکر کے بعد اس سے معانی باطنہ اور دقائق مخفیہ کا انکشاف کیا۔ انہوں نے اس سے تزکیہ و تصفیہ، فناء و بقاء، غیبت و حضور، خوف و ہیبت، انس و وحشت اور قبض و بسط وغیرہ کے حقائق و تصورات بھی اخذ کیے۔ جن سے "علم التصوف" کی تشکیل ہوئی۔

بعض علماء نے قرآن سے طب، ہیئت، ہندسہ، جدل، جبر و مقابلہ، نجوم اور مناظرہ وغیرہ کے علوم و فنون اخذ کیے اور ان کی تفصیلات بھی طے کیں۔ اس طرح یہ مقدس اور جامع الہامی کتاب بالفعل دنیا کے ہر فن اور علم کے لیے منبع و سرچشمہ قرار پا گئی۔ باری تعالیٰ نے اس کی اسی جامعیت کے باعث اسے "القرآن" کے جامع و بلیغ نام سے سرفراز فرمایا۔

امام موسیٰؒ نے مزید تفصیل کے ساتھ مذکورہ بالا موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ جس کی تلخیص امام جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں کی ہے۔ الغرض دنیا میں موجود ہر فن و صنعت جو انفرادی، اجتماعی اور عالمی سطح پر انسانی زندگی کی بقاء و دوام اور فروغ و ارتقاء کے لیے ضروری ہے۔ اصلاً قرآن سے ثابت ہے۔ علوم و فنون کے حوالے سے قرآنِ مجید کی جامعیت کے اس بیان سے یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہو گئی کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو محض ذکر و عبادت اور اخلاق و روحانیت کا ہی درس نہیں دیتا بلکہ دنیا میں ہر قسم کی علمی، فنی، صنعتی، سائنسی اور فوجی ترقی کی راہیں بھی کشادہ کرتا ہے تاکہ ملتِ اسلامیہ ایک ہمہ گیر ترقی پسند اُمت کے طور پر اُبھرے اور آفاقی سطح پر انقلاب بپا کر کے عظیم مقام حاصل کر لے کیونکہ اس کے بغیر عالمگیر غلبہ حق کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس کی نشاندہی قرآن نے پیغمبر اسلام صلی اللہ

Marfat.com

علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کے حوالے سے فرمادی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ؕ [1]

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولِ معظم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر اس لیے بھیجا کہ اس نظامِ حق کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دے۔ بیشک مشرک یعنی کفر و طاغوت کے علمبردار اس کی مخالفت کرتے رہیں۔

اسی جامعیت کی بناء پر ربِ ذوالجلال نے اس مقدس کتاب کا نام "القرآن" رکھا۔ کیونکہ انبیاءِ ماسبق کے زمانوں میں وحی کا سلسلہ جاری تھا اور ہر ایک الہامی کتاب کا بدل اگلے زمانے میں بنی نوعِ انسان کو کسی دوسری الہامی کتاب یا صحیفے کی صورت میں میسر آ رہا تھا۔ اس لیے ان کتابوں کو اس قدر جامع بنانے کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی کسی کتاب کو ہمیشہ کے لیے اس حیثیت میں باقی رہنا تھا۔ لیکن ان کے برعکس خاتم الانبیاء علیہ السلام کے بعد نہ کوئی اور نبی یا رسول آسکتا تھا اور نہ قرآن کے بعد کوئی آسمانی وحی۔ چنانچہ ضروری تھا کہ نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو آفاقی، کائناتی، ابدی، کلی، حتمی، قطعی اور آخری بنانے کے لیے ہر اعتبار سے کامل اور جامع بنایا جائے اور اس طرح وہ کتاب جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اسے بھی عالمگیر اور ابدی بنانے کے لیے اس قدر جامع کیا جائے کہ انسانیت کو سب کچھ اس کتاب کے دامن سے میسر آسکے۔ اور کسی کو دوسری سمت میں متوجہ ہونے کی کوئی ضرورت ہی نہ رہے۔ لہٰذا قرآن اپنی جامعیت کا ذکر اس انداز میں کرتا ہے:

يَتْلُوا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً

وہ اس قرآن کی تلاوت کرتا ہے جو

---

[1] الصف (۶۱: ۹)

Marfat.com

فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ [1]

ایسا مقدس صحیفۂ آسمانی ہے کہ اس میں تمام آسمانی کتب کے علوم، ان کے ثمرات و مطالب اور حیاتِ انسانی کے تمام مفید و صحیح ضابطے درج ہیں۔

کوئی ضرورت کی چیز جس پر انسانی زندگی کا انحصار ہو قرآن سے خارج نہیں۔ باوجود قلتِ حجم کے اس میں وہ تمام علوم و معارف بیان کر دیئے گئے ہیں۔ جن کا احصار و استیفار کوئی فرد نہیں کر سکتا تھا۔ خود قرآن اعلان کرتا ہے:

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ [2]

اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں سب قلم بن جائیں اور سمندر ان کی سیاہی۔ اس کے بعد سات سمندر اور ہوں تو بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے (یعنی کلامِ الٰہی کی وسعت و جامعیت کا احاطہ نہیں ہو سکے گا) بیشک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

قرآنِ مجید کے اسی اعجاز جامعیت اور ابدی فیضان کا ذکر کرتے ہوئے امام جلال الدین سیوطی یہ شعر نقل کرتے ہیں:

كالبدر من حيث التفت رأيته ۔۔۔ يهدى الى عينيك نورًا ثاقبًا

كالشمس فى كبد السماء وضوءها ۔۔۔ يغشى البلاد مشارقًا ومغاربًا

---

[1] البینۃ (۹۸: ۲-۳)

[2] لقمٰن (۳۱: ۲۷)

Marfat.com

قرآن چودھویں رات کے چاند کی مانند ہے تو اسے جس طرف سے بھی دیکھے وہ تیری آنکھوں کو چمکتا ہوا نور عطا کرے گا۔ یہ قرآن آفتاب کی طرح آسمان کے وسط میں ہے۔ لیکن اس کی روشنی دنیا کے مشارق و مغارب سب کو ڈھانپ رہی ہے۔)

مذکورہ بالا وضاحت سے یہ امر اچھی طرح آشکار ہو گیا ہے کہ قرآن کی پہلی وجہ تسمیہ اس کی معنوی جامعیت ہے۔ جو آج تک اس شان سے دنیا کی کسی کتاب کو نصیب نہیں ہو سکی۔

Marfat.com

پانچواں امتیاز — نفیِ ریب کا چیلنج

ایمان بالکتب کے ضمن میں قرآن کریم کی ایک اور خصوصیت قابل ذکر ہے یعنی "لاریب" ہونا جس کی نسبت آغاز ہی میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ [۱] — یہ وہ کتاب ہے جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں۔

"لَا رَیْبَ فِیْہِ" کے الفاظ میں عمومیت بھی ہے اور اطلاق بھی۔ گویا تمام دنیائے کفر کو یہ چیلنج کیا جا رہا ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ ان الفاظ کے دو بنیادی مفہوم ہیں، ایک یہ کہ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کتاب کے مستند اور معتبر ہونے میں کوئی شک نہیں۔

یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ شک کرنے والے تو عہد رسالت میں بھی موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ منکرین اپنی کم فہمی کی بنا پر شک پیدا کرنے کی جتنی کوششیں چاہیں کرتے رہیں۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ایسی کتاب ہے جس میں شک کے وارد ہونے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا شخص کوتاہ بینی کی بنا پر اپنی جسارت میں بالآخر خود ہی ناکام و نامراد ہو جائے گا اور یہ کتاب ابدالآباد تک ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر رہے گی۔ یہ ایک ایسا تاریخی چیلنج ہے جس کی آج تک کوئی تکذیب نہیں کر سکا۔

---

[۱] البقرہ (۲: ۲)

Marfat.com

شک کی امکانی صورتیں

کسی بھی کتاب میں شک درج ذیل پہلوؤں پر وارد ہو سکتا ہے،

۱۔ کتاب کا اصلی، واقعی اور حقیقی ہونا اسے کتاب کی (GENUINESS) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ آیا بانی مذہب نے کوئی کتاب اپنی اُمت کو دی بھی تھی یا نہیں؟ اگر دی تھی تو کیا وہ وہی کتاب تھی جو اس پر وحیِ الٰہی کی صورت میں نازل ہوئی؟ اور اگر وہ وہی کتاب ہے تو کیا اس وقت موجود کتاب فی الواقع وہی ہے یا کوئی اور؟ ان سوالات کا جواب اثبات میں ہو تو کتاب کو" (GENUINE) "یعنی اصلی، واقعی اور حقیقی کہا جاتا ہے۔

۲۔ کتاب کا قابلِ اعتبار اور حقیقی ہونا اسے کتاب کی (AUTHENTICITY) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ کیا بانی مذہب کی وفات کے بعد اس کتاب میں کوئی لفظی ردّ و بدل تو نہیں ہوا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہو تو کتاب کو (AUTHENTIC) کہا جاتا ہے۔

۳۔ کتاب کا ہر قسم کی کمی بیشی سے محفوظ ہونا اسے کتاب کی (INTEGRITY) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ کیا بانی مذہب کی وفات کے بعد اس میں کسی قسم کی کمی بیشی تو نہیں کی گئی؟ یا بانی مذہب نے وہ اس قدر مکمل حالت میں دی تھی کہ اس میں ابدالآباد تک حذف اور اضافے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اگر جواب کمی بیشی کی نفی

Marfat.com

ہیں ہو تو کتاب کو تمام اور مکمل یعنی (PERFECT) کہا جاتا ہے۔

۴۔ کتاب کا ہر زمانے میں قابلِ عمل ہونا ایسے کتاب کی (PRACTICABILITY) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امر طے کیا جائے کہ کیا وہ کتاب ہر دور میں بدلتے ہوئے حالات میں قابلِ عمل بھی ہے یا نہیں۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہو تو کتاب کو (PRACTICABLE) کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی کتاب پر مذکورہ بالا پہلوؤں سے اعتراض یا شک وارد کیا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی کتاب ان چاروں معیارات پر پوری اُترے اور اس میں کسی لحاظ سے بھی شک ممکن نہ ہو تو صرف اسی کی نسبت "ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ" کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔

نفی ریب کے دعوے کا تقابلی جائزہ

قرآن کے سوا آج مذاہبِ دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جو مذکورہ بالا چار معیارات میں سے کسی ایک پر بھی کما حقہٗ پوری اُتر سکے۔ اکثر کتابیں ایسی ہیں جنہیں تحریری صورت میں بانیانِ مذاہب نے خود اپنی اُمتوں کو منتقل نہیں کیا، بلکہ ان کے بعد ان کے پیروکاران کی بیان کردہ زبانی تعلیمات کو ضابطۂ تحریر میں لے آئے جیسے انجیل وغیرہ۔ اگر کسی بانی مذہب نے کوئی کتاب تحریری صورت میں اپنی اُمت کو دی بھی تو یہ امر محلِ نظر ہے کہ آج موجودہ کتاب وہی ہے جو اس نے اپنی اُمت کو دی تھی یا یہ کوئی اور ہے۔ مثلاً آج کی تورات (خمسۂ موسوی) کو لیجیے۔ اس کی کتاب "استثناء" کے باب ۳۴ آیات نمبر ۵، ۶، ۷، ۸ ملاحظہ فرمائیے:

Marfat.com

"پس خداوند کے بندہ موسیٰ نے خداوند کے کہنے کے موافق وہیں موآب کے ملک میں وفات پائی۔ اور اس نے اسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل دفن کیا۔ پر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں اور موسیٰ اپنی وفات کے وقت ایک سو بیس (۱۲۰) کا تھا، پر نہ اس کی آنکھ دھندلانے پائی اور نہ اس کی طبعی قوت کم ہوئی اور بنی اسرائیل موسیٰؑ کے لیے موآب کے میدانوں میں تیس دن تک روتے رہے۔" (کتاب مقدس یعنی بائیبل، مطبوعہ بائیبل سوسائٹی لاہور ۱۹۷۲ء صفحہ ۱۹۲، ۱۹۳)

ان آیات کو پڑھنے کے بعد ذرا فیصلہ کیجیے کہ کیا یہ کتاب وہی ہو سکتی ہے جو حضرت موسیٰؑ نے خود اپنی اُمت کو دی یا ان پر ان کی زندگی میں نازل کی گئی۔ عبارت صاف بتا رہی ہے کہ نہ یہ کتاب حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ اُنھوں نے اپنی اُمت کو دی ہو۔ یہ تو ان کی وفات کے بعد لکھی گئی سوانح حیات معلوم ہو رہی ہے۔ تورات اور انجیل کے موجودہ تمام نسخے ایسے نمونوں سے لبریز ہیں۔ [1] یہ امر عالم یہودیت اور عالم عیسائیت کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

یہی حال دیگر کتابوں کا ہے۔ لہٰذا جب کوئی کتاب اصلی، واقعی اور حقیقی ہونے کے معیار پر بھی پوری نہیں اُترتی، تو اس میں ردّ و بدل یا کمی بیشی کی بات ہی غیر ضروری ہو جاتی ہے اگر ان معیارات پر بھی دیگر آسمانی کتابوں کا جائزہ لینا چاہیں تو ان کے اندر موجود کھلے تضادات اور عجیب و غریب تصورات اس امر پر دلالت

---

[1] اس موضوع پر دیکھیے رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق (اردو ترجمہ بائیبل سے قرآن تک، مطبوعہ کراچی)

Marfat.com

کرتے ہیں کہ نہ وہ معتبر ہیں، نہ مکمل اور نہ قابلِ عمل۔ اس لحاظ سے ہر کتاب شک شبہ کا مورد بن چکی ہے۔

لیکن قرآن ایک ایسی کتاب ہے، جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحریری صورت میں اپنی اُمت کو منتقل کی۔ یہی وہ کتاب تھی جو آپؐ پر نازل ہوئی اور یہی وہ کتاب ہے جو آج اُمت کے پاس موجود ہے۔ پوری دنیائے کفر ہزاروں تعصبات کے باوجود اس کا کوئی دوسرا نسخہ ثابت نہیں کر سکی۔ جب کہ عیسائیت آج بھی انجیل کے چار مختلف نسخوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ اس سے زیادہ قرآن کی "PERFECTION" کا اور ثبوت کیا ہوگا؟۔

قرآن کا قابلِ اعتماد ہونا بھی اظہر من الشمس ہے کیونکہ یہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود بھی ہر قسم کے رد و بدل اور تحریف و ترمیم سے محفوظ ہے۔ روئے زمین کروڑوں مسلمان مختلف علاقوں، مختلف نسلوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں، ہر جگہ قرآن مجید لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ اس کے کروڑوں قدیم اور جدید مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے دنیا میں موجود ہیں لیکن کسی نسخے میں ایک لفظ یا حرف تو درکنار زیر و زبر کا اختلاف بھی ثابت نہیں ہو سکا۔ اس سے بڑھ کر اس کی "INTEGRITY" کی اور کیا دلیل ہوگی؟۔

قرآن کا تمام و کمال مکمل ہونا بھی ثبوت کا محتاج نہیں ہے۔ اس میں آج تک نہ کسی آیت یا لفظ کی کمی واقع ہوئی اور نہ زیادتی۔ مدینہ، بیت المقدس، ترکی، روس اور دنیا کے کسی دوسرے ممالک مسلم و غیر مسلم ممالک میں قرآن مجید کے پرانے نسخے موجود ہیں جو عہدِ صحابہ اور عہدِ تابعین کے ہیں۔ ان میں اور عصرِ حاضر کے مطبوعہ نسخوں میں کمی یا بیشی کی ایک مثال بھی ثابت نہیں کی جا سکی اور نہ ہی یہ امر تاریخی طور پر ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے قرآن کی "COMPLETENESS" کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

Marfat.com

جہاں تک قرآن کے قابلِ عمل ہونے کا تعلق ہے، اس کا علم اور ہدایت زندہ و تابندہ ہے۔ یہ پہلے بھی قابلِ عمل اور نتیجہ خیز تھا، آج بھی قابلِ عمل اور نتیجہ خیز ہے اور قیامت تک اس کی یہ حیثیت اسی طرح برقرار رہے گی۔ اس سے کوئی کسی قدر استفادہ کرتا ہے، یہ ہر شخص اور ہر قوم کے نصیب کی بات ہے اس سے قرآن کی اثر انگیزی اور نتیجہ خیزی متاثر نہیں ہوتی۔

آج بھی نئی دریافت ہونے والی کئی حقیقتیں ایسی ہیں، جن کا ذکر قرآن چودہ سو سال پہلے کر چکا ہے۔ کئی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور قانونی تصورات ایسے ہیں جنہیں اقوامِ عالم ترقی یافتہ اعلیٰ تصورات کے طور پر اپنے نظاموں میں اپنا رہی ہیں، حالانکہ ان کی صراحت پہلے ہی سے قرآن میں موجود ہے۔ یہ مقام ان تفصیلات کے بیان کے لیے مناسب نہیں۔ اپنے اپنے مقام پر ان کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے گا۔ یہاں صرف یہ واضح کر دینا درکار ہے کہ قرآن اور اس کا علم آج بھی جدید (MODERN) ہے اور مستقبل میں بھی ہمیشہ جدید ہی رہے گا۔ کسی بھی دور کے تقاضے اس کے قابلِ عمل ہونے کے راستے میں رکاوٹ نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی ایسا سوچتا ہے تو یہ اس کے اپنے فہم کا نقص ہے، قرآن ایسے نقص سے پاک ہے۔

الغرض کسی لحاظ سے بھی قرآن کے ثقہ اور معتبر ہونے پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ہزاروں پہلوؤں کا بیان کتنے خوبصورت انداز میں صرف تین لفظوں "لاریب فیہ" میں کر دیا گیا ہے۔ اسی چیلنج سے قرآن مجید کا ابتدائی تعارف کرایا گیا ہے کیونکہ یہ اسلام کی حقانیت کی ایسی قطعی اور ابدی دلیل ہے جس کا انکار کسی بھی صاحبِ عقلِ سلیم کے لیے ممکن نہیں۔

اس کے برعکس دیگر کتبِ سماوی نے اپنی نسبت "نفیِ ریب" کا ایسا چیلنج

Marfat.com

ہی نہیں کیا۔ چنانچہ ان سب کے اصلاً حق ہونے کا ایمان ضروری ہے، جب کہ قرآن کے آج بھی واقعتہً حق ہونے کا یقین مطلوب ہے۔ دوسری کتابوں کا اُترنا حق تھا، مگر آج پایا جانا حق نہیں ہے جبکہ قرآن کا اُترنا بھی حق تھا اور آج پایا جانا بھی حق ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب تک کسی آسمانی کتاب کی اس کی اُمت کو ضرورت رہتی ہے، قدرت اسے محفوظ رکھتی ہے اور جب اس کی ضرورت مٹ جاتی ہے تو قدرت بجائے اسے محفوظ رکھنے کے نئی کتاب نازل کر دیتی ہے۔ سابقہ تمام کتابوں کا معاملہ اسی اصول پر ہوا۔ لیکن نہ قرآن کی ضرورت کو رہتی کائنات تک ختم ہونا تھا اور نہ اس کی حفاظت سے ہاتھ اُٹھایا گیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ جب تک قرآن انسان کے پاس ہے، اس وقت تک انسان کو اس کی ضرورت ہے اور اس کی ضرورت کا انکار گویا دیکھتے سمجھتے ہوئے ایک واضح حقیقت کا انکار ہے۔

چھٹا امتیاز ــــــ اعجازِ قرآن

قرآن کریم اپنے معانی اور اپنے الفاظ، دونوں کے اعتبار سے معجزہ ہے جب کہ کتب سابقہ کو یہ حیثیت حاصل نہ تھی۔

قرآن کریم نے اپنے دعوائے اعجاز پر مختلف دلائل قائم کیے ہیں جنہیں فنی اصطلاح میں "وجوہِ اعجاز القرآن" قرار دیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ عدم مثلیت

۲۔ کاملیت و تمامیت

۳۔ عدم اختلاف و تناقض

Marfat.com

۴۔ ندرتِ اسلوب ونظمِ کلام

۵۔ فصاحت وبلاغت

۶۔ صوتی ترنم وتغنّم

۷۔ اُمیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

۸۔ احوالِ غیب کا بیان

۹۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت

اس موضوع پر الجاحظ، الجرجانی، الواسطی، الخطابی، الرمانی، امام رازی، ابن سراقہ، امام الباقلانی اور ابن العربی وغیرہم نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے امام سیوطیؒ نے الاتقان میں، ابنِ حزم نے الفصل فی الملل والنحل میں، الزرکشی نے البرہان میں، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے الفوز الکبیر میں اور الزرقانی نے مناہل العرفان میں تفصیل سے اس مسئلے پر کلام کیا ہے۔ دورِ جدید کے مصنفین میں سے سید رشید رضا، سید قطب اور مصطفیٰ صادق الرافعی وغیرہم نے اس موضوع کے بعض گوشوں پر فنی گفتگو کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام ائمہ وعلما کی توجیہات اپنی اپنی جگہ پر قرآنِ حکیم کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو نمایاں کرتی رہی ہیں۔ ان وجوہ کا تعدُّد باہمی تعارض کا باعث نہیں بنا۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ حسن وجمال کا کوئی پیکرِ اتم اگرچند مختلف الذوق لوگوں کے سامنے جلوہ گر ہو جائے تو ہر شخص دادِ نظارہ دیتے ہوئے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے محاسن و اوصاف پر روشنی ڈالے گا۔ کوئی تناسبِ اعضا پر فریفتہ ہوگا، کسی کو رنگ و زینت پر شیفتگی ہوگی، کوئی قد و قامت کی موزونیت پہ نثار ہو گا، کوئی گیسوئے عنبرین کا اسیر ہو گا، کوئی چشمِ نرگسی میں ڈوب رہا ہو گا اور کوئی جمالِ آتشین کی فسوں کاریوں سے متاثر ہو گا۔ الغرض جب حسن کامل اور جمال اتم ہو گا تو اس کی ہر ہر ادا مشتاقانِ دید کو دعوتِ نظارہ دے گی اور اہلِ نظر کو ہر ہر قدم "جا این جاست" کا سماں نظر

Marfat.com

آئے گا اور وہ وہیں محوِ حیرت ہو جائیں گے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن کے اسی اعجازِ حُسن کو بیان کرتے ہوئے اس پر یہ شعر چسپاں کیا ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمۂ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجاست

تعبیرات و تشریحات اگرچہ مختلف ہو سکتی ہیں، اندازہائے بیان بھی بیشک بدل سکتے ہیں، لیکن یہ سب اسی ایک حسنِ تمام کی جلوہ پاشیاں ہوتی ہیں۔

۱۔ عدمِ مثلیت

قرآن نے اپنے دعوے کی صحت و حقانیت کی دلیل "عدمِ مثلیت" کو قرار دیا اور عالمِ انس و جاں کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ اس کے منزل من اللہ اور مبنی برحق ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ساری مخلوقات اپنی اجتماعی کوششوں کے باوجود اس کا مثل نہیں لا سکتی:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا [۱]	اے محبوبؐ! آپ فرما دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جن اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں، تب بھی وہ اس کا مثل نہیں لا سکتے۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

پھر اس کے بعد چیلنج کو نرم کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ پورے قرآن کی مثل لانا تو درکنار، قرآن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر افترا پردازی کرنے والے، اپنے قول کی تائید کے لیے صرف دس صورتوں کی مثل ہی لے آئیں

---

[۱] بنی اسرائیل (۱۷: ۸۸)

Marfat.com

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ [1]

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی قرآن گھڑ لیا ہے ؟ آپ کہہ دیجیے کہ اچھا تو تم اس طرح کی گھڑی ہوئی دس سورتیں ہی لے آؤ۔

لیکن اس پر بھی معترضین بے بس رہے تو باری تعالیٰ نے ایک اور چیلنج کیا :

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ [2]

جو ہم نے اپنے خاص بندے پر نازل کیا، اگر تمہیں اس میں کوئی شک ہو تو اس جیسی کوئی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلالو اگر تم سچے ہو۔

اس کے بعد ابد الآباد تک کے لیے اس امر میں پورے عالم کفر کی ناکامی کا بیان کیا گیا ہے، جس کی شہادت چودہ سو سال کی تاریخ ہے :

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ [3]

پھر اگر تم قرآن کی ایک سورت کی مثل بھی نہ لا سکو اور تم ہرگز نہ لا سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لیے تیار کر رکھی ہے۔

---

[1] ہود (۱۱ : ۱۳)

[2] البقرہ (۲ : ۲۳)

[3] البقرہ (۲ : ۲۴)

Marfat.com

اس قرآنی دلیل کی صداقت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ تمام عالم کفر یعنی عالم شرک، عالم یہودیت اور عالم عیسائیت اسلام کے خلاف جس طرح برسرپیکار رہے ہیں، تاریخ کا ہر طالب علم اس سے بخوبی آشنا ہے۔ آج بھی اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے کی جتنی کوششیں مغربی و اشتراکی اساطین کے ذریعے دنیا میں ہو رہی ہیں وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں۔ لیکن ان بھرپور مخاصمانہ کوششوں کے باوجود آج تک قرآن کی کسی ایک سورت یا آیت کی مثل نہیں بنائی جا سکی۔ اگر اس کے الہامی ہونے کا دعوی غلط ہوتا تو اس کے مماثل کئی نسخے معرض وجود میں آ چکے ہوتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عالم عیسائیت میں انجیل کے ایک سو تینتیس نسخے تصنیف ہو گئے تھے۔ جن میں بالآخر ۱۲۹ کو رد کر کے بقیہ چار کو سند صحت عطا کر دی گئی۔ آج تک انجیل یوحنا، انجیل مرقس، انجیل لوقا، انجیل متی کے نام سے چار مختلف نسخے موجود ہیں اور پوری دنیائے عیسائیت ان میں سے کسی ایک پر متفق نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس اسلام کے خلاف اندرونی اور بیرونی سطح پر لاکھوں سازشیں ہوئیں لیکن قرآن کا "عدم مثلیت" کا وصف اسی طرح برقرار رہا اور آج بھی مشرق و مغرب کے مختلف ممالک میں آباد نوّے کروڑ افراد پر مشتمل ملت اسلامیہ صرف ایک ہی متن کو قرآن مانتی ہے اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، بلکہ صفحۂ ہستی پر آج تک قرآن کا کوئی متبادل نسخہ پیش نہیں کیا جا سکا۔ بعض جھوٹے مدعیانِ نبوت نے جزوی طور پر ایسی جسارت کرنا چاہی، لیکن خاسر و خائب ہو کر رہ گئے اور اگر کسی اور نے بھی قرآن کی عظمت و اعجاز کو نہ سمجھتے ہوئے ایسا اقدام کرنا چاہا تو وہ بھی ساکت و صامت اور مجبور و مبہوت ہو کر رہ گیا۔

امام ابن جوزی اپنی کتاب "الوفا فی فضائل المصطفٰیؐ" میں امام ابن عقیل کے حوالے سے ابو محمد بن مسلم نحوی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اعجاز القرآن

Marfat.com

پر گفتگو کر رہے تھے، وہاں ایک فاضل شیخ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ قرآن میں ایسا کوئی کمال نہیں جس سے فضلا و بلغا عاجز آ جائیں۔ پھر وہ کاغذ قلم لے کر بالاخانے پر چڑھ گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ تین دن کے بعد قرآن مجید کی مثل لکھ کر لاؤں گا۔ جب تین دن گزر گئے اور وہ نیچے نہ اُترا تو ایک شخص نے بالاخانے پر چڑھ کر دیکھا تو اسے اس حال میں پایا کہ اس کا ہاتھ قلم پر سوکھ چکا تھا۔

یہ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز نہ کر سکو گے) کی زندہ شہادتیں ہیں۔

۲- کاملیّت و تمامیّت

باری تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ خود فرمایا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ ⁵

بیشک یہ قرآن ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

چنانچہ وعدۂ الٰہی کے مطابق قرآن آج تک ہر قسم کی کمی بیشی اور حذف و اضافہ سے محفوظ رہا ہے۔ اس لیے یہ کامل بھی ہے اور مکمل بھی۔ عہدِ رسالت میں قرآنی آیات متعدد اشیا پر معرضِ تحریر میں لائی جاتی تھیں اور مکمل طور پر محرّرا اور مرتب شدہ ایک صحیفہ بھی موجود نہ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دیگر صحابہ و صحابیاتؓ میں سے کئی ایک قرآن کے حافظ بھی تھے اور اسی دور میں اکثر صحابہؓ احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قلمبند کرتے تھے، لیکن حفاظتِ الٰہیہ کا انداز یہ تھا کہ قرآنی وحی اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو خود بھی "وحی خفی" ہے، کے درمیان التباس تک پیدا نہ ہونے دیا دونوں علوم کے ذخائر الگ الگ طور پر محفوظ رہے۔ جب رمضان المبارک میں جبرئیل

---

⁵ الحجر (۱۵ : ۹)

Marfat.com

امین علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر دورۂ قرآن کرتے تھے تو صحابہؓ و حفاظ اپنے اپنے متون کی اس دور سے مطابقت کر لیتے ہوں گے، بعد ازاں عہدِ صدیقیؓ میں مصحف کے نام سے ایک جامع نسخۂ قرآن مرتب کیا گیا۔ جسے سورتوں کی طوالت و قصارت کے اعتبار سے سبع طوال، مئین، مثانی اور مفصل میں تقسیم کر دیا گیا، لیکن سورہ و آیات کی ترتیب وہی رہی، جسے خود رسولِ اکرم نے بذریعہ وحی مقرر فرما دیا تھا۔ یاد رہے کہ یہ ترتیب تدوینی (توقیفی یعنی من جانب اللہ) ہے اور ترتیبِ نزول سے مختلف ہے۔ ان دونوں کی تعیین بذریعہ وحی کر دی گئی تھی۔

چنانچہ عہدِ عثمانیؓ میں پہلے سے موجود "مصحفِ صدیقی" کے تقریباً سات نسخے تیار کر کے عالمِ اسلام کے تمام بڑے بڑے شہروں کو ارسال کیے گئے۔ اسے تمام عالمِ اسلام نے وسیع پیمانے پر معتبر و مستند نسخۂ قرآن کے طور پر تسلیم کر لیا۔ یہ نسخہ پہلے مصاحف یا قرآنی نسخوں سے قطعاً مختلف نہ تھا۔ پہلے انتظامات نجی و انفرادی سطح پر تھے اور یہ نسخہ پورے عالمِ اسلام کے لیے سرکاری حیثیت سے مرتب ہوا تھا۔ اہلِ بیتِ نبیؐ اور دیگر صحابہ کرامؓ کے ہاں پہلے سے جس قدر نسخے موجود تھے، ان سب کو ملا کر اور جو صحابہؓ حافظِ قرآن تھے، ان سے سن کر، بلا اختلاف یہ مصحفِ قرآن مدون ہوا جسے اطراف و اکنافِ عالم میں پھیلا دیا گیا۔ دور دراز کے علاقوں میں جن لوگوں کے پاس قرآنی آیات پر مشتمل تحریری اوراق تھے، ان میں زبان، لب و لہجہ اور قرأت کے اختلافات کا اندیشہ تھا، ان سب کو حکماً تلف کروا دیا گیا تاکہ کبھی امتِ مسلمہ میں فتنہ و انتشار پیدا نہ ہو سکے۔ قرآن کی جمع و تدوین کا یہ کام جو عثمان غنیؓ کے ہاتھوں پایۂ انجام کو پہنچا، دراصل یہ خود اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت کی حفاظت میں ہو رہا تھا۔ کیونکہ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ — اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا

Marfat.com

وَقُرْآنَهُ لہ

ہمارے ذمہ ہے۔

یہاں ایک اور لطیف علمی نکتہ بیعتِ رضوان کے حوالے سے قابلِ ذکر ہے کہ باری تعالیٰ نے قرآن کی جمع و تدوین کا آخری کام متعدد صحابہ و خلفا کے موجود ہونے کے باوجود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں لیا۔ اس کی وضاحت صلح حدیبیہ کے واقعے سے ہوتی ہے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چودہ سو صحابہ کے ہمراہ مقام حدیبیہ میں پڑاؤ کیا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اہلِ مکہ کی طرف اپنا سفیر بنا کر بھیجا، مگر ہوا یہ کہ مخالفینِ اسلام نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کیے جانے کی افواہ اڑا دی۔ جب یہ خبر مسلمانوں کو پہنچی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیعت لی، جسے بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے۔ اس موقع کی منظر کشی قرآن نے یوں کی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ؕ لہ

بے شک جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں۔ یقیناً وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ اقدس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ اور آپ کی بیعت کو اپنی بیعت قرار دے دیا۔ جب تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کی بیعت ہو چکی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللّٰھم ان عثمان — اے اللہ! عثمان تیرے اور تیرے

لہ القیامہ (۷۵ : ۱۷)

لہ الفتح (۴۸ : ۱۰)

Marfat.com

فی حاجۃ اللہ وحاجۃ رسولہ فضرب باحدٰی یدیہ علی الاخرٰی فکانت ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان رضی اللہ خیرًا من ایدیھم لانفسھم [1]

رسولؐ کے کام کے لیے گیا ہوا ہے۔ پھر آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر رکھا اور اپنے ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر ان کے لیے بیعت لے لی۔ یہ بیعت دوسرے لوگوں کے ہاتھوں سے اچھی تھی۔

ابنِ ہشام لکھتے ہیں:

بایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعثمان رضی اللہ عنہ فضرب باحدٰی یدہ علی الاخرٰی [2]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بیعت لے لی۔

اس واقعہ سے تین امور مترشح ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ کفار و مشرکین کے قتلِ عثمانؓ کے غلط پراپگنڈے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مغالطے میں مبتلا نہیں کر دیا تھا۔ اگر آپؐ حضرت عثمانؓ کو مقتول سمجھ بیٹھے ہوتے تو خود ان کی طرف سے بیعت نہ لیتے، کیونکہ بیعت لینا تو زندہ افراد ہی کے لیے تھا۔ شہید ہو جانے کے بعد بیعت لینے کا کوئی جواز نہ تھا۔

---

[1] تفسیر ابنِ کثیر، مطبوعہ قاہرہ، جلد چہارم، ص ۱۸۶، ۱۸۷۔

[2] سیرت ابنِ ہشام، جلد سوم، ص ۳۳۰۔

Marfat.com

دوسرے یہ کہ اگر اسلامی سلطنت یا فوج کا کوئی سفیر مارا جائے یا اس کے قتل کیے جانے کی صرف اطلاع ہو جائے تو ملتِ محمدی کو اس کے انتقام کے لیے تیار ہو جانا چاہیے، کیونکہ سفیر کے خلاف ایسا اقدام براہِ راست حکومت کے خلاف جارحیت متصوّر ہوتا ہے۔ یہی مقصد بیعتِ رضوان کا تھا لیکن تحقیق سے قبل عملی کارروائی درست نہیں،

تیسرے یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا جبکہ "ید اللہ فوق ایدیھم" کے مطابق حضور علیہ السلام کے دستِ مبارک کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ حفاظت قرار دے دیا تھا، گویا بالواسطہ عثمانِ غنیؓ کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ اپنا دستِ حفاظت قرار دے رہا تھا، کیونکہ اسی ہاتھ سے جمع و تدوینِ قرآن کا کام انجام پانا تھا اور وعدۂ الٰہی "اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ" (قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے) کی عملی شہادت دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کی جانے والی تھی۔

یہ اسی حفاظتِ الٰہی کا کرشمہ ہے کہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود آج تک اس میں ایک آیت یا ایک لفظ و حرف کی حد تک بھی کمی بیشی نہیں ہو سکی۔ آج بھی بعض علاقوں میں ہزار بارہ سو سال پرانے کلام مجید کے نسخے محفوظ ہیں لیکن ان میں اور آج کے مطبوعہ نسخوں میں زیر و زبر تک کا فرق نظر نہیں آتا۔ اس سے بڑا اعجاز اور دلیلِ صحت اور کیا ہو سکتی ہے۔

۳۔ عدمِ اختلاف و تناقض | قرآن اپنے اعجاز کی دلیل بھی پیش کرتا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف اور تناقض نہیں ہے۔

عام مصنفین کی تالیفات سے قطع نظر دیگر مذاہب کی الہامی کتب کے موجودہ نسخوں میں بھی

Marfat.com

نظر ڈالیے تو آپ کو لاتعداد تضادات ملیں گے جن میں تطبیق بھی نہ ہوگی ۔ مضامین کا اختلاف، ناموں کا اختلاف، انبیاء علیہم السلام کے نسبوں پر (معاذاللہ) اختلاف، واقعات کا اختلاف، لشکر کی تعداد پر اختلاف، بیانات کا اختلاف، سنین و اوقات کا اختلاف، الغرض اجمال و تفصیل میں ہر جگہ مضحکہ خیز حد تک تضادات و تناقضات ہیں، جن کا جواب آج تک اس مذہب کے پیروکار نہیں دے سکے اور نہ ہی ایسی کتابوں کو موضوع اور محرّف ماننے کو تیار ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت کا مشاہدہ بائبل کے تنقیدی و تقابلی مطالعہ سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنِ حکیم کی اوّل سے آخر تک ہر آیت دوسری آیت کی مؤید اور ہر مقام دوسرے کا مصدّق ہے اور قرآنی مضامین و مشمولات کا یہ تسلسل و تواتر صدیوں سے بحال چلا آرہا ہے گویا:

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
گر دلیلت باید از وی رو متاب

قرآنِ حکیم میں بعض اوقات ایک واقعہ متعدد جگہ بیان ہوا ہے۔ ہر چند کہ ہر مقام پر اندازِ بیان اور سیاق و سباق مختلف ہوتے ہیں، لیکن اس کی واقعیّت میں کوئی خفیف سا اختلاف بھی نظر نہیں آسکا۔ اس امر کی صحیح اہمیت کا اندازہ اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر ہو سکتا ہے کہ قرآن دیگر کتابوں کی طرح تصنیف نہیں ہوا بلکہ ۲۳ سال کے عرصے میں، کبھی دن کو کبھی رات کو، کبھی سفر میں، کبھی گھر اور کبھی میدانِ جنگ میں، الغرض ہر ہنگامی صورت میں اس کی چند آیات جن کی تعداد بالعموم تین سے دس تک ہوتی تھی، نازل ہوتی رہی ہیں۔ آپ ذرا غور فرمائیے کہ اس طرح آیات کا تدریجی نزول ۲۳ سال تک جاری رہا۔ اس عرصے میں ہزاروں تبدیلیاں آئیں اور قرآن ساتھ ساتھ ایک کتابی صورت میں یعنی

Marfat.com

دو جلدوں کے درمیان مرتب بھی نہ ہو رہا تھا۔ بلکہ لوگ اپنے طور پر کاغذوں، کپڑوں، پتھروں اور ہڈیوں کے ٹکڑوں پر لکھ کر محفوظ کرتے تھے۔ اس انداز سے اس کا نزول اور طبع و تدوین عمل میں آئی۔ پھر بھی یہ ہر قسم کے معمولی و غیر معمولی اختلاف سے یکسر پاک ہو، تو پھر اس کے مُنَزَّل مِنَ اللہ اور مبنی بر حق ہونے میں کیا شبہ رہ سکتا ہے۔ مستزاد یہ کہ اس وقت پریس بھی نہ تھا۔ صرف قلمی نسخوں کے ذریعے قرآن کی اشاعت ہو رہی تھی اور نہ صرف عرب میں بلکہ فلسطین، مصر، شام، عراق اور ہندوستان تک کے عجمی ممالک میں قلمی نسخے تیار ہو رہے تھے اور ہر ایک کے سامنے صرف مصحفِ عثمانی کا معیار تھا۔ اگر حفاظتِ الٰہیہ شاملِ حال نہ ہوتی تو عمداً یا سہواً عباراتِ قرآنی میں کئی اختلافات پیدا ہو سکتے تھے۔ جس طرح احادیث کے معاملے میں وضعِ حدیث کا فتنہ جاری تھا، ایسا فتنہ دامنِ قرآن کو بھی متاثر کر سکتا تھا، لیکن یہ اعجازِ قرآن ہے کہ آج تک ایسا اختلاف زبر، زیر کی حد تک بھی پیدا نہیں ہو سکا۔ حالانکہ اعراب لگانے کا کام بھی عہدِ رسالت کے بہت بعد جا کر ہوا۔ اس سے پہلے تمام نسخے بغیر اعراب کے تھے۔ اندریں حالات قرآنِ حکیم کا ہر قسم کے اختلاف و تناقض سے مبرّا ہونا اس کے برحق اور منزل من اللہ ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

۴۔ ندرتِ اسلوب و نظمِ کلام | عہدِ نزولِ قرآن تک عربوں میں صرف چار اسالیب معروف و مروّج تھے۔ قصائد، مکتوبات، خطبات اور محاورات۔ عرب کسی پانچویں اندازِ بیان سے واقف نہ تھے۔ قرآن کریم کا ان معینہ و معلومہ اسالیب سے مختلف ایک نیا اسلوب پیدا کر لینا ایک معجزہ تھا۔

قرآن کی ندرتِ اسلوب کا یہ عالم ہے کہ یہ انداز آج تک کسی ادب میں پیدا نہیں

Marfat.com

ہو سکا۔ آج کتابیں ابواب و فصلوں پر منقسم ہوتی ہیں، لیکن قرآن ایسی تبویب و تفصیل سے پاک ہے۔ اس کے مختلف مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت بھی بیان نہیں کیا گیا۔ قرآن کے اسلوبِ بیان اور نظمِ کلام میں ایک تسلسل اور روانی ہے کسی جگہ پر انقطاع نظر نہیں آتا۔

شاہ ولی اللہؒ کے مطابق قرآن ایسے احکام و فرامین کا مجموعہ ہے جو شہنشاہِ مطلق اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے لوگوں کی ہدایت کے لیے مختلف اوقات میں مقتضائے حال کے مطابق جاری کیے۔ انہیں چھوٹی بڑی ایک سو چودہ سورتوں پر مشتمل کیا اور عہدِ رسالت میں انہی سورتوں کو الگ الگ منضبط اور محفوظ کر لیا گیا۔ بعد ازاں ان کو ترتیبِ الہامی کے تحت مرتب کر کے مصحف تیار کر لیا گیا۔ بعض سورتوں کو حمد و ثنا سے شروع کیا اور بعض کو غرضِ بیان کی وضاحت سے۔ بعض کا اختتام جامع کلمات پر کیا اور بعض کا نصیحتوں پر۔ کبھی وعد کا ذکر کیا کبھی وعید کا۔ کبھی تبشیر کا انداز اپنایا، کبھی تنذیر کا۔ کبھی تہدید کی اور کبھی تاکید۔ کبھی مخلوق کا بیان کیا، کبھی خالق کا، کبھی کائنات کی نشانیاں بیان کیں، کبھی قصص و واقعات بیان کیے، کبھی حلت و حرمت کے احکام دیے، کبھی استثناء اور رخصت کے۔ کبھی احقاقِ حق کیا اور کبھی ابطالِ باطل۔ کہیں مخاصمے کا رنگ ہے، کہیں موعظت کا، کہیں انبیاء و مرسلین کی تعلیمات و خدمات بیان کیں کہیں ان کی عظمتیں اور رفعتیں۔ کہیں خطاب ہے، کہیں تکلم۔ اندازِ کلام بغیر کسی تکلف کے بڑی بے ساختگی سے بدلتا رہتا ہے لیکن حلاوت اور دلکشی برقرار رہتی ہے۔ قرآن کے اسلوبِ بیان اور نظم و کلام کے سلسلے میں مزید دو اُمور قابلِ توجہ ہیں:

(الف) انتشارِ مطالب

Marfat.com

(ب) تکرارِ مضامین

(الف) انتشارِ مطالب : قرآنی علوم اور معارف و مطالب عام طور پر پانچ انواع پر مشتمل ہیں، علم الاحکام، علم المخاصمہ، علم التذکیر بالاء اللہ، علم التذکیر بایام اللہ اور علم التذکیر بالموت۔

قرآنی اسلوب میں انتشارِ مطالب کا معنی یہ ہے کہ قرآن اس امر کی رعایت نہیں کرتا کہ اس سورت میں صرف فلاں نوع کا علم مذکور ہوگا اور دوسری سورت میں فلاں نوع کا، بلکہ ایک ہی سورت میں متعدد انواع کے مطالب و معارف بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک علم کے ساتھ متصلاً دوسرا علم بیان کرنا کسی دوسری کتاب میں یقیناً مذاقِ لطیف پر گراں ہوتا ہے لیکن قرآنی اعجاز کا یہ عالم ہے کہ بدلتے ہوئے مضامین و مطالب کے باوجود بیان اور تفہیم میں روانی اور لطافت برقرار رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ایسا محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اب رخِ سخن بدل گیا ہے۔ بات بغیر بار کے دل میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ الضحیٰ میں چاشت اور رات کی قسم ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہ روٹھنے کا بیان ہے۔ پھر آپؐ کو خوشخبریاں سنائی گئی ہیں، پھر آپؐ کی یتیمی اور اپنی محبت میں وارفتگی کا ذکر ہے، اس کے بعد یتیموں اور سائلوں سے بھلائی کرنے اور تحدیثِ نعمت کا حکم ہے۔ اس چھوٹی سی سورت میں احکام، انعاماتِ الٰہیہ اور سابقہ احوال و واقعات سب کچھ درج ہو گیا ہے۔ اسی طرح سورۂ یوسف، سورۂ کہف، سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ ہود یا سورۂ یونس اور دیگر سورتوں کا مطالعہ کیجیے، آپ کو مطالب کے تنوع اور انتشار میں بھی ایک ہم آہنگی اور اتصال نظر آئے گا اور یہ خوبی دنیا کی کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی۔

سورۃ الکوثر پر نظر ڈالیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

Marfat.com

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝

اے محبوب! بیشک ہم نے تمہیں خیرِ کثیر عطا کی ہے۔ پس اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی دیجیے۔ بیشک جو تمہارا دشمن ہے وہی محروم ہے۔

اس مختصر سی سورت کے تین جملے ہیں اور تینوں جملوں میں الگ الگ اور اپنی اپنی جگہ مستقل معنیٰ و مطلب بیان کیا گیا ہے۔ تینوں آیتوں میں احکام مختلف ہیں، لیکن ایک دوسرے سے معنوی اعتبار سے پیوستہ معلوم ہوتے ہیں۔ گویا انتشارِ مطالب میں بھی ایک اتحاد و اتصال کی کیفیت نظر آتی ہے۔

(ب) <u>تکرارِ مضامین</u>: تکرارِ مضامین میں حکمت و مصلحت یہ ہے کہ بعض اوقات کسی بیان کا مقصد صرف حقیقتِ مندکرہ سے دوسرے کو آگاہ کرنا ہوتا ہے اور بعض اوقات اسے سامع کے دل میں جاگزیں کرنا ہوتا ہے۔ پہلے مقصد کے لیے تو صرف ایک مرتبہ کا بیان کافی رہتا ہے، لیکن دوسرے مقصد کے لیے بات کو بار بار مختلف انداز سے بیان کیا جاتا ہے۔ کئی مضامین کے لیے قرآن کے پیشِ نظر دوسرا مقصدِ تخاطب تھا۔ اسی بنا پر اس میں ایک ہی مضمون متعدد بار بیان ہوا، لیکن ہر دفعہ نئی حکمت و موعظت کے ساتھ۔ جس طرح ذوقِ لطیف کا حامل شخص ایک اچھا شعر بار بار سن کر نئی لذت اور نیا لطف حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں تکرارِ مضامین ہر بار نئی لذت اور لطف کا باعث بنتا ہے۔ عموماً کسی نثر کی کتاب میں ایسا ہو تو طبیعت پہ بوجھ بنتا ہے اور عبارت اپنی رنگینی و دلکشی کھو بیٹھتی ہے، لیکن نثر ہونے کے باوجود قرآن کے اس اسلوب کی بے پایاں لذت قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔

سورۃ الشعراء میں: اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ

Marfat.com

اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ" آٹھ بار آیا ہے۔ سورۂ قمر میں "وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ" چار بار آیا ہے۔ سورۂ مرسلات میں "وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ" دس بار آیا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں "فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ" اکتیس بار آیا ہے۔ لیکن ہر مرتبہ نیا لطف پیدا ہوتا ہے نئی کیفیت وارد ہوتی ہے تکرار سے دل و دماغ پر اکتاہٹ کے بجائے کیف و سرور مترتب ہوتا ہے اور ہر بار نئے معانی و مطالب اور اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔

علامہ بدر بن جماعہ نے اسی موضوع پر "المقتنص فی فوائد تکرار القصص" کے عنوان سے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے۔

۵۔ فصاحت و بلاغت

قرآن کا اسلوب سادگی اور سلاست کے علاوہ فصاحت و بلاغت کے اس اعلیٰ مقام پر ہے جس کا معارضہ دنیائے علم و فن کے بڑے سے بڑے زعماء کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس میں مقتضائے حال کی رعایت، استعارہ و کنایہ اور صنائع و بدائع کے حسن استعمال نے ناقابلِ بیان حسن اور بے پناہ دلکشی پیدا کر دی ہے؛ علامہ کرمانی اپنی کتاب "العجائب" میں لکھتے ہیں کہ معاندین نے عرب و عجم کے تمام کلام ڈھونڈ مارے، مگر کوئی کلام بھی حسن نظم، جودتِ معانی، فصاحتِ الفاظ اور ایجاز میں اس کی مثل نہ پایا اور بالآخر اس امر پر متفق ہو گئے کہ انسانی طاقت قرآن کی آیت کی مثل لانے سے قاصر ہے۔ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا یہ اعجاز تھا کہ دنیائے عرب کے ادبی شاہکار "سبع معلقات" جو خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں تھے، نزولِ قرآن کے بعد اُتار لیے گئے، کہ قرآنی فصاحت و بلاغت کے ساتھ کوئی شے بھی معارضہ نہیں کر سکتی۔

فصاحتِ قرآنی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

Marfat.com

مجاز وکنایہ

۱۔ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ [1] — عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

۲۔ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ [2] — یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو۔

۳۔ فَلَمَّا تَغَشَّاهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيفًا [3] — جب وہ (آدم) اس (حوا) کے پاس گئے تو اس نے ہلکا سا بوجھ اٹھایا (وہ امید سے ہو گئیں)

مذکورہ بالا آیات میں کتنی لطافت کے ساتھ مجاز اور کنایہ کے انداز میں ہر بات کہی گئی ہے، اس کا اندازہ ذوقِ لطیف ہی کر سکتا ہے۔

تشبیہ واستعارہ

۱۔ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكٰوةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ [4] — اس کے نور کی مثال قندیل کی ہے جس میں چراغ ہو۔

۲۔ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا [5] — گدھے کی طرح جس نے کتابیں اٹھا رکھی ہوں۔

---

[1] البقرہ (۲ : ۱۸۷)

[2] النساء (۴ : ۴۳)

[3] الاعراف (۷ : ۱۸۹)

[4] النور (۲۴ : ۳۵)

[5] الجمعہ (۶۲ : ۵)

Marfat.com

۳۔ وَالَّیۡلِ اِذَا عَسۡعَسَ ۙ [1] — قسم ہے رات کی جب پیٹھ دے (یعنی تاریکی ہلکی پڑے)

۴۔ وَالصُّبۡحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ [2] — اور صبح کی، جب دم لے (یعنی آہستہ آہستہ نمودار ہو۔)

چند آیات جن کی فصاحت و بلاغت رشکِ ادب ہے۔

۱۔ وَقِیۡلَ یٰۤاَرۡضُ ابۡلَعِیۡ مَآءَكِ وَیٰسَمَآءُ اَقۡلِعِیۡ وَغِیۡضَ الۡمَآءُ وَقُضِیَ الۡاَمۡرُ وَاسۡتَوَتۡ عَلَی الۡجُوۡدِیِّ وَقِیۡلَ بُعۡدًا لِّلۡقَوۡمِ الظّٰلِمِیۡنَ [3] — اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے، اور آسمان تھم جا۔ اور پانی خشک کر دیا گیا اور امر تمام ہوا اور کشتی جودی پر آ ٹھہری، اور فرمایا گیا، دور ہوں بے انصاف لوگ۔

امام سیوطی اتقان میں ابن ابی الاصبع کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے آج تک اس آیت کی مثل نہیں دیکھی۔ اس میں ۱۷ لفظ ہیں اور ۲۰ بدائع ہیں۔

۲۔ اسی طرح ایجاز کی مثال بھی "الاتقان" میں مذکور ہے،

وَلَكُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوةٌ [4] — کہ تمہاری زندگی کا راز قصاص میں مضمر ہے۔

---

[1] التکویر (۸۱ : ۱۷)

[2] التکویر (۸۱ : ۱۸)

[3] ہود (۱۱ : ۴۴)

[4] البقرہ (۲ : ۱۷۹)

Marfat.com

امام سیوطی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بھی ۲۰ صنعتیں بیان ہوئی ہیں۔

۳- اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا — اللہ ایمان والوں کا دوست ہے جو انہیں
يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ — تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکال لاتا ہے۔
اِلَى النُّوْرِ [1]

اس آیت کی فصاحت و بلاغت کے بیان پر امام سیوطی نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس میں ۱۲۰ بدائع بیان کیے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ جو لوگ وجدانِ صحیح اور ذوقِ سلیم رکھتے ہیں، ان کے لیے اعجازِ قرآن پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ فصاحت و بلاغتِ قرآنی خود اپنی صداقت و حقانیت پر دلیلِ قاطع ہے۔ جن لوگوں نے سلامتِ ذوق اور استقامتِ طبع کے ساتھ عرب کے اساتذۂ شعر و سخن کا کلام پڑھا اور اپنے ذوق و وجدان کو پختہ اور شائستہ بنا لیا، انہی کو فصاحتِ قرآن کی صحیح عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

احادیث سیر و مغازی اور تاریخِ اسلام کے طلبہ جانتے ہیں کہ عتبہ بن ربیعہ، انیس غفاری، ولید بن مغیرہ، عمرو بن جموح، حسان بن ثابت، کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ، لبید بن ربیعہ، طفیل بن عمرو، زید الجلیل، کعب بن زہیر، شعاس، اسود بن سوبع وغیرہم عرب کے معروف اور نامور سردار اور سخن گو شعراء قرآن کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" [2] کے الفاظ سنے اور سربسجود ہو گیا۔

۴- اسی طرح قرآن کریم کی یہ آیت فصاحت و بلاغت کا کیسا عظیم نمونہ ہے:
فَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ — اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی

---

[1] البقرہ (۲ : ۲۵۷)

[2] الحجر (۱۵ : ۹۴)

Marfat.com

مُوسٰی اَنْ اَرْضِعِیْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَیْهِ فَاَلْقِیْهِ فِی الْیَمِّ وَلَا تَخَافِیْ وَلَا تَحْزَنِیْ اِنَّا رَادُّوْهُ اِلَیْكِ وَ جَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ[۱]

بھیجی کہ تم اس کو دودھ پلاؤ اور جب تم کو اس کے متعلق خوف ہو تو اسے دریا میں ڈال دینا اور نہ خوف کرو اور نہ غم۔ پھر موسیٰ کو تمہاری طرف لوٹا دیں گے اور اس کو رسول بنائیں گے۔

سبحان اللہ کس قدر بلیغ کلام ہے۔ امام اصمعی سے منقول ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے بیک وقت دو امر اور دو نہی کے صیغے، دو خبریں اور دو بشارتیں جمع کر دی ہیں۔ قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت اس کے دعاوی و اعلانات کی صحت و حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

۶۔ صوتی ترنُّم و تغنُّم قرآن حکیم کی ہر آیت اور اس سے مطلع و مقطع میں ایک خاص قسم کا صوتی حسن و جمال پایا جاتا ہے۔ یہ معنوی نغمگی اور باطنی موسیقیت شعری اوزان و قوافی سے مبرا ہونے کے باوجود فراوانی کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کی سحر بیانی کافی حد تک اس صوتی حسن پر منحصر ہے۔ اس اعتبار سے قرآنی آیات تین اقسام پر منحصر ہیں، طویل مثلاً سورۃ النساء میں، متوسط مثلاً سورۃ اعراف اور انعام میں، قصیر مثلاً سورۃ الشعراء اور الدخان میں صوتی ترنُّم کی یہ کیفیت ہر شخص کے لیے عجیب لُطف کا سامان پیدا کر دیتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ[۲]

---

[۱] القصص (۲۸ : ۷)

[۲] القلم (۶۸ : ۱)

Marfat.com

۲۔ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۙ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۙ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۙ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۙ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۙ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا [1]

۳۔ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۙ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ [2]

۴۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ۙ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ۙ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۙ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ۙ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ [3]

۵۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۙ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۙ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ۙ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ۙ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ۙ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ۙ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا ۙ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا ۙ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا ۙ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا [4]

۶۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۙ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۙ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا [5]

---

[1] المرسلات (۷۷: ۱ تا ۶)

[2] المرسلات (۷۷: ۸ تا ۱۲)

[3] الغاشیہ (۸۸: ۸ تا ۱۲)

[4] الشمس (۹۱: ۱ تا ۱۰)

[5] الزلزال (۹۹: ۱ تا ۳)

Marfat.com

۷۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۙ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا [1]

مذکورہ بالا آیات میں سے ہر ایک کا اختتام ایک خاص صوتی نغمگی پیدا کر رہا ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور وزن، پھر ان کا آپس میں جوڑ اور ترکیب، پھر ان میں تلفظ کی سلاست اور بہاؤ ایک عجیب موسیقیت اور موزونیت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ ان آیات کو بار بار پڑھیں، سادگی سے پڑھیں یا مترنم انداز میں، زبان میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی اور ہر لمحہ عجیب سی حلاوت پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ مستزاد یہ کہ اگر مذاقِ لطیف اور حسِ ادب تیز ہو تو ان آیات کے تلفظ ہی سے معنیٰ و مفہوم کی ترجمانی ہوتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ سورۃ الناس کو بار بار پڑھیں تو ہر آیت کا آخری حرف "س" کثرت کے ساتھ استعمال ہونے سے سرگوشی کی فضا پیدا کر رہا ہے اور یہی سرگوشی و وسوسہ اندازی اس سورت کا موضوع ہے۔

۲۔ اسی طرح سورۃ الملک میں ارشاد ہوتا ہے:

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ [2]	کچھ بعید نہیں کہ جہنم غصے سے پھٹ جائے۔

یہاں لفظ تَمَيَّزُ کی تشدید ہی سے غیظ و غضب کی نشاندہی ہو رہی ہے۔

۳۔ سورۃ الفجر کی ان آیات کو پڑھیے اور ان کے تلفظ پر غور کیجیے:

اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا [3]	جب زمین ٹکرا کر پاش پاش کر دی جائے گی۔

---

[1] العادیات (۱۰۰ : ۴)

[2] الملک (۶۷ : ۸)

[3] الفجر (۸۹ : ۲۱)

Marfat.com

اس میں دُکَّتْ اور دَکًّا دَکًّا کے الفاظ ہی سے ٹکرانے اور پاش پاش ہونے کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے۔

۴۔ اسی طرح سورۃ الرحمان میں ملاحظہ فرمائیں:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ [1]	اس نے دو سمندر بہائے کہ دیکھنے میں ملے ہوئے معلوم ہوں۔

اس آیت کے الفاظ میں بہاؤ اور روانی کا سماں پایا جاتا ہے۔

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ [2]	ان میں دو چشمے ہیں، چھلکتے ہوئے۔

نَضَّاخَتٰنِ کے لفظ کو غور سے پڑھیے، اس میں بھنا اور چھلکنا کا مفہوم معلوم ہوتا ہے۔

۶۔ اسی طرح:

مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ [3]	تکیہ لگائے بچھونوں پر

ان الفاظ میں آرام و سکون کی نشاندہی ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآنی آیات اپنے اندر ایک قدرتی تناسب و توازن، موزونیت و موسیقیت اور ترنم و تغنّم رکھتی ہیں جس سے خاص قسم کی دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے، یہ صفت بھی قرآن ہی میں ہے۔ ایسا رنگ آج تک کسی اور کلام میں

---

[1] الرحمٰن (۵۵: ۱۹)

[2] الرحمٰن (۵۵: ۶۶)

[3] الرحمٰن (۵۵: ۷۶)

Marfat.com

دیکھنے میں نہیں آسکا۔

۷۔ اُمیتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیّت ایک ایسی حقیقتِ ثابتہ ہے کہ دعوتِ اسلام پر برہم ہوکر کفار و مشرکینِ مکہ نے آپؐ کو کیا کچھ نہیں کہا، وہ کون سا افترا و بہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبرِ اسلامؐ کے خلاف نہیں باندھا۔ آپ کو (معاذاللہ) ساحر کہا، کاہن کہا، مجنون کہا، ایذا رسانی میں اُنہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، لیکن سب کچھ کہنے اور کرنے کے باوجود پورے عالمِ کفر میں سے کسی کو یہ کہنے کو جرأت نہ ہوسکی کہ آپؐ اُمّی نہیں ہیں۔ اور یہ قرآن آپ کا اپنا تحریر کردہ ہے۔ گویا آپؐ پر اتّہامِ کذب کوئی نہیں لگا سکا۔ آج تک مخالفینِ اسلام میں سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکا کہ حضور علیہ السلام نے اعلانِ نبوت سے قبل یا بعد کسی سے کچھ پڑھا ہو، کسی مکتب میں تعلیم حاصل کی ہو، کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیے ہوں، کسی فاضل سے علوم و معارف، عربی ادب کی فصاحت و بلاغت، شعر و سخن کے اُصول اور حکمت و دانائی کے خزانے حاصل کیے ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معاشرے میں اُمّی اور صادق و امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ قرآن جیسے علم و معرفت سے معمور کلام کا آپ کی زبان مبارک سے ادا ہونا ہی مُنَزَّلٌ مِّنَ اللہ ہونے پر دلالت کرتا ہے، اسی لیے ارشادِ ربّانی ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ [۵]

اور آپ نے قرآن سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھی تھی اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ باطل پرست شک کرتے

۵۔ العنکبوت (۴۸:۲۹)

Marfat.com

پھر اسی سورت میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ[۱] — کیا ان لوگوں کے لیے یہی دلیل کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے۔

گویا آپ پر ایسی کتاب کا نازل ہونا اور آپ کا اسے تلاوت کرنا ہی اس وحی کی صداقت و حقانیت کی روشن دلیل ہے۔ کوئی شخص کسی مکتب و مدرسہ یا اُستاد سے پڑھے بغیر گزشتہ و آئندہ زمانوں کے احوال بھی بیان کرے، عقائدِ صحیحہ کا مدلّل احقاق اور عقائدِ باطلہ کا قوی ابطال کرے، انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے اصول و ضوابط بھی بیان کرے، اعلیٰ اخلاق اور مذہبی تعلیمات کا بھی پرچار کرے، طبیعیاتی اور مابعد الطبیعیاتی حقائق کا تفصیلی ذکر بھی کرے، سیاست و معاشرت، اقتصاد و معیشت اور تہذیب و ثقافت کے اصولوں کی تعلیم بھی دے اور ان پر کامیابی سے عمل پیرا بھی ہو۔ صلح و جنگ اور قومی و بین الاقوامی تعلقات کے قوانین بھی بتائے۔ حکمت و دانائی، تدبر و بصیرت اور ضابطۂ اصلاحِ احوال پر مبنی اس اعلیٰ فلسفۂ حیات کی بھی بات کرے جو ابدالآباد تک قابلِ عمل اور انقلاب آفریں ہو ——— اس سب کچھ کے باوجود یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کا کلام حق تصوّر نہ کیا جائے۔ بلاشک و شبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمّیت قرآن کے من جانب اللہ نازل ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ حضور علیہ السلام نے اُمّی ہونے کے باوجود "ماکان ومایکون" کے جمیع علم خود ربّ ذوالجلال سے حاصل کر لیے تھے۔

---

[۱] العنکبوت (۲۹، ۵۱)

Marfat.com

۸ - احوالِ غیب کا بیان

قرآنِ حکیم کی صداقت و حقانیت کا ایک بہت بڑا ثبوت اس میں احوالِ غیبی کا بیان ہے۔ قرآن مجید نے اپنی اس حیثیت کو خود اپنے لفظوں میں اس طرح واضح کیا ہے:

ذَالِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ [1]

یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر اس کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا:

تِلْكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَا اِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا [2]

یہ غیب کی باتیں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کو نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔

قرآنی اعجاز کا یہ پہلو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمایاں معجزات میں سے بھی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی علوم غیب کے بیان میں بخل نہیں کرتے تھے۔ سائل جس قسم کا بھی سوال لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا، تسلی بخش جواب پاکر جاتا تھا، حضور علیہ السلام کی ہمہ پہلو شخصیت کے اس گوشے کا ذکر قرآنِ حکیم یوں کرتا ہے۔

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ [3]

اور رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) غیب بیان کرنے میں کوئی بخل نہیں کرتے

---

[1] آل عمران (۳ : ۴۴)

[2] ہود (۱۱ : ۴۹)

[3] التکویر (۸۱ : ۲۴)

Marfat.com

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں :

"یعنی یہ پیغمبر ہر قسم کے غیب کی خبر دیتا ہے ، ماضی سے متعلق ہوں یا مستقبل سے ، اللہ کے اسماء و صفات سے یا احکام شرعیہ سے ، مذاہب کی حقیقت و بُطلان سے یا جنّت و دوزخ کے احوال سے یا واقعات بعد الموت سے ۔ اور ان چیزوں کے بتلانے میں آپ ذرا بخل نہیں کرتے ۔"

بعد میں وہ پیغمبر علیہ السلام کے بیان غیب کے اس علم کے پیش نظر لکھتے ہیں :

"کاہنوں کو ان سے کیا نسبت ہو سکتی ہے ، کیونکہ وہ تو محض غیب کی جزئی اور نامکمل بات وہ بھی جھوٹ ملا کر ، بیان کرتے ہیں اور اتنی بات میں بھی بخیل ہوتے ہیں ۔"

قرآن حکیم میں احوالِ غیب کا بیان کئی اعتبارات سے آیا ہے لیکن یہاں صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے :

(الف) اُمم سابقہ کے احوال و واقعات

(ب) مستقبل کی پیشین گوئیاں

(الف) اُمم سابقہ کے احوال و واقعات

قرآن حکیم نے اُمم سابقہ اور گزشتہ انبیاؑ کے حوالے سے بہت واقعات و حالات بیان کیے ہیں جن میں سے کئی ایک کا ذکر پہلی کتابوں میں سرے سے موجود ہی نہ تھا ۔ اور بعض کا ذکر پہلی کتابوں میں تھا لیکن وہ اس قدر محرّف و متبدل صورت میں تھا ، جس کی صحت کے بارے میں کسی کے پاس کوئی یقینی شہادت موجود نہ تھی ، قرآن نے ان احوال و واقعات اور ان انبیاؑ کی تعلیمات و خدمات کو سندِ تصدیق عطا کر دی ۔

اس لیے اس کا لقب "مُصَدِّقٌ لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ (اپنے سے

Marfat.com

پہلے کی تصدیق کرنے والا قرار پایا۔ قرآن نے کئی مقامات پر حضرت آدمؑ، حوّاؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، اسماعیلؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، خضرؑ، سلیمانؑ، داؤدؑ، یونسؑ، ذوالکفلؑ، صالحؑ، شعیبؑ، ذکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ، اصحابِ کہفؑ وغیرہم کے حالات کا بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ قوم ہود، قوم ثمود، قومِ عاد، قومِ لوط اور دیگر اقوام و ملل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرعون، نمرود، قارون اور ہامان وغیرہم کے احوال کا بیان بھی کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی قرآنِ حکیم میں اسی قبیل کے متعدد قصص بیان کیے گئے ہیں۔ کئی علما نے "قصص الانبیا" کے موضوع پر باقاعدہ تصانیف رقم کی ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کے اعجاز اور اس کی صحت و حقانیت کی دلیل یہ ہے کہ ایک ایسی ہستی کی زبان سے جس نے نہ کوئی تاریخ پڑھی ہو اور نہ کسی مؤرخ سے علمی استفادہ کیا ہو، ان احوال و واقعات کا بیان ہونا، پھر اس کا بعض روایات اور تاریخی نقطہ ہائے نظر کی تردید اور بعض کی تصدیق کرنا، بلاشبہ بہت بڑا معجزہ تھا۔ جب قرآن نے اپنے منکرین و مخالفین کے سامنے خود اپنے بیان کردہ قصص کو انباء الغیب (غیب کی خبریں) سے تعبیر کیا تو کسی بھی دشمن کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ ان قصص و واقعات کا کوئی زبانی یا کتابی مآخذ بنا کر قرآن کے اس دعوے کی تردید کر سکتا۔ اور یہ کہہ سکتا کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تم یہ دعویٰ کیسے کرتے ہو، حالانکہ تمہیں تو یہ معلومات فلاں ذریعے سے حاصل ہوئی ہیں،" لیکن تاریخِ عالم شاہد ہے کہ آج تک یہ بات کوئی نہ کہہ سکا۔ پھر اس سے بھی زیادہ حیران کن بیان احوالِ غیب کا دوسرا پہلو تھا جو مستقبل میں رونما ہونے والے اہم واقعات سے متعلق تھا۔

(ب) مستقبل کی پیشین گوئیاں

پیشین گوئی کا طریقہ کسی دعوای کی صحت و حقانیت کے اثبات میں سب سے

Marfat.com

زیادہ نازک اور اہم ہوتا ہے۔ حقانیتِ قرآن کے داخلی دلائل میں سے یہ دلیل بھی بہت مؤثر اور فیصلہ کن ہے کہ قرآن نے بعض پیشین گوئیاں ایسے حالات میں کیں، جن میں ظاہراً ان کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ مخالفینِ قرآن وہ پیشین گوئیاں سن کر حیران و ششدر رہ گئے۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیشین گوئیاں اپنے اپنے وقت پر حقائق و وقائع میں بدلتی چلی گئیں۔ یہ سب کچھ اب تاریخ کا ناقابلِ انکار حصہ بن چکا ہے۔ جو زبانِ حال سے قرآن کی صداقت و حقانیت کا اعلان کر رہا ہے ذیل میں چند قرآنی پیشین گوئیاں بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ غلبۂ روم کی پیشین گوئی

یہ پیشین گوئی سب سے نمایاں اور حیرت انگیز ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ ھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۬ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ [1]	الٓمّٓ۔ قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوں گے۔ چند برسوں میں جن کی حد نو برس ہے۔ حکم اللہ ہی کا ہے، پہلے بھی اور بعد میں بھی۔

یہ آیت بعثتِ نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی، یعنی ۶۱۴ عیسوی میں۔ جبکہ ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا۔ جو بالآخر ۶۱۶ء میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اس جنگ میں بعض مؤرخین کے مطابق رومیوں کے نوّے ہزار آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو نذرِ آتش کر دیا گیا اور سلطنتِ روم کو ناقابلِ تلافی

---

[1] الروم (۳۰: ۱تا۴)

Marfat.com

نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں یہ پیشین گوئی کی کہ چند برس کے اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ اس وقت اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ہرقل کی حکومت کے یہ سال سلطنتِ روم کی تباہی و خاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔ بہرحال ان نامساعد و ناموافق حالات میں قرآن نے غلبۂ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیشین گوئی کا اعلان کیا اور رومیوں کی فتح یابی کے لیے "بضع سنین" کہہ کر نو برس کی حد مقرر کر دی۔ مستدرک، حاکم اور ترمذی کے باب "تفسیر سورۂ روم" میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ "بضع کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے۔" اس لحاظ سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی آخری حد ۹ برس مقرر ہوئی۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں بلند آواز سے اس پیشین گوئی کا اعلان کرتے پھرتے تھے۔

اس پیشین گوئی کے اعلان یعنی رومیوں کے آغازِ شکست سے ٹھیک آٹھ برس بعد ۶۲۲ء میں رومیوں کے تنِ مردہ میں پھر جان پیدا ہو گئی۔ وہ اسی کاہل و عشرت پرست کمانڈر ہرقل کے زیرِ قیادت منظم ہوئے اور ایرانیوں پر حملہ آور ہو گئے۔ ۶۲۳ء میں یعنی پیشین گوئی کے ٹھیک نویں برس رومی فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ بالآخر یہ فتح اس شان سے پایۂ تکمیل کو پہنچی کہ انہوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ و فرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ اس طرح قرآن کی پیشین گوئی کے سچ ثابت ہونے پر بیشمار کافر مسلمان ہو گئے۔

۲۔ فتحِ مکہ کی پیشین گوئی ۶ھ میں جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو ان میں عام بددلی اور مایوسی پائی جاتی

Marfat.com

تھی۔ وہ اس صلح اور اس کی شرائط کو اپنے لیے شکست کا اعتراف سمجھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ بعض نے صاف لفظوں میں اس خیال کا اظہار بھی کر دیا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اطمینانِ قلب کے لیے قرآن مجید کی اس پیشگوئی کا اعلان فرمایا:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا [1] — ہم نے تمہارے لیے عظیم الشان فتح مقدر کر دی ہے۔

اس آیت میں یہ اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ سمجھو، بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا، جو فتح مکہ کی صورت میں تمہیں حاصل ہونے والی ہے۔ چنانچہ اسی صورت میں فرمایا گیا۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ [2] — بیشک تم ضرور مسجدِ حرام میں داخل ہوگے، اگر اللہ چاہے۔ امن و امان سے اپنے سروں کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہوئے بے خوف ہو کر۔

بالآخر اس پیشین گوئی کا ظہور فتح مکہ کی صورت میں ۸ ھ میں ہوا۔ صلح حدیبیہ سے مایوس ہونے والوں نے نتیجۃً اس صلح نامہ کی کامیابی و کامرانی کو دل و جان سے تسلیم کر لیا۔ اور کفار مکہ ہی اس معاہدے سے روگرداں ہو گئے جس کا خمیازہ انہیں کئی صورتوں میں بھگتنا پڑا۔

---

[1] الفتح (۴۸ : ۱)

[2] الفتح (۴۸ : ۲۷)

Marfat.com

نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں یہ پیشین گوئی کی کہ چند برس کے اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ اس وقت اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی۔ کیونکہ ہرقل کی حکومت کے یہ سال سلطنتِ روم کی تباہی و خاتمے کا اعلان کر رہے تھے۔ بہرحال ان نامساعد و ناموافق حالات میں قرآن نے غلبۂ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیشین گوئی کا اعلان کیا اور رومیوں کی فتح یابی کے لیے "بضع سنین" کہہ کر نو برس کی حد مقرر کر دی۔ مستدرک، حاکم اور ترمذی کے باب "تفسیر سورۂ روم" میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ "بضع کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے"۔ اس لحاظ سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی آخری حد ۹ برس مقرر ہوئی۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں بلند آواز سے اس پیشین گوئی کا اعلان کرتے پھرتے تھے۔

اس پیشین گوئی کے اعلان یعنی رومیوں کے آغازِ شکست سے ٹھیک آٹھ برس بعد ۶۲۲ء میں رومیوں کے تنِ مردہ میں پھر جان پیدا ہو گئی۔ وہ اسی کاہل و عشرت پرست کمانڈر ہرقل کے زیرِ قیادت منظم ہوئے اور ایرانیوں پر حملہ آور ہو گئے۔ ۶۲۳ء میں یعنی پیشین گوئی کے ٹھیک نویں برس رومی فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ بالآخر یہ فتح اس شان سے پایۂ تکمیل کو پہنچی کہ انہوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ و فرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ اس طرح قرآن کی پیشین گوئی کے سچ ثابت ہونے پر بیشمار کافر مسلمان ہو گئے۔

۲۔ فتحِ مکہ کی پیشین گوئی ۶ھ میں جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو ان میں عام بددلی اور مایوسی پائی جاتی

Marfat.com

تھی۔ وہ اس صلح اور اس کی شرائط کو اپنے لیے شکست کا اعتراف سمجھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ بعض نے صاف لفظوں میں اس خیال کا اظہار بھی کر دیا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اطمینانِ قلب کے لیے قرآن مجید کی اس پیشینگوئی کا اعلان فرمایا:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا [1] — ہم نے تمہارے لیے عظیم الشان فتح مقدر کر دی ہے۔

اس آیت میں یہ اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ سمجھو، بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا، جو فتح مکہ کی صورت میں تمہیں حاصل ہونے والی ہے۔ چنانچہ اسی صورت میں فرمایا گیا۔

لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُءُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ [2] — بیشک تم ضرور مسجدِ حرام میں داخل ہو گے، اگر اللہ چاہے۔ امن وامان سے اپنے سروں کے بال منڈوانے یا ترشواتے ہوئے بے خوف ہو کر۔

بالآخر اس پیشین گوئی کا ظہور فتح مکہ کی صورت میں ۸ ھ میں ہوا۔ صلح حدیبیہ سے مایوس ہونے والوں نے نتیجۃً اس صلح نامہ کی کامیابی وکامرانی کو دل وجان سے تسلیم کر لیا۔ اور کفار مکہ ہی اس معاہدے سے روگرداں ہو گئے جس کا خمیازہ انہیں کئی صورتوں میں بھگتنا پڑا۔

---

[1] الفتح (۴۸: ۱)

[2] الفتح (۴۸: ۲۷)

Marfat.com

۳۔ فتح خیبر کی پیشین گوئی

غزوۂ خیبر کی فتح کے بارے میں بھی سورۃ الفتح میں پیشینگوئی کی گئی۔ ارشاد فرمایا گیا:

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَىٰ مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ ؎

عنقریب کہیں گے پیچھے بیٹھ رہنے والے، جب تم غنیمتیں لینے چلو تو ہمیں بھی اپنے پیچھے آنے دینا۔

جو لوگ حدیبیہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہیں آئے تھے، ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ صلح حدیبیہ سے واپس لوٹتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح خیبر کی پیشین گوئی بھی دی اور صراحت کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ غزوۂ خیبر میں تمہارے ہاتھ بہت سا مالِ غنیمت بھی آئے گا لیکن ہم نے وہ مالِ غنیمت صرف ان مجاہدین کے لیے مخصوص کر دیا ہے جو حدیبیہ کے موقع پر حضور علیہ السلام کے ہمراہ ہیں۔ اس وقت ساتھ نہ دینے والے اس مالِ غنیمت سے بھی محروم رہیں گے۔ چنانچہ اس پیشینگوئی کی صداقت بھی تاریخ عالم کے صفحات پر نمایاں انداز میں مرقوم ہے۔ فتح خیبر بھی ہوا اور بے شمار مالِ غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

۴۔ غلبۂ اسلام کی پیشین گوئی

سب سے بڑھ کر حیرت انگیز وہ پیشینگوئی ہے جس میں مسلمانوں کو روئے زمین پر عظیم الشان تمکن و استخلاف اور اقتدار و استحکام کی خوش خبری سنائی گئی تھی۔ حالانکہ اس وقت روم و ایران کی دو عظیم عالمی طاقتیں مشرق و مغرب پر اس طرح قابض و متصرف تھیں، جس طرح آج امریکہ اور روس۔ صحرائے عرب کے ان مکینوں کے بارے میں اس بے سروسامانی کے عالم میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ بھی

؎ الفتح (۴۸: ۱۵)

Marfat.com

بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم اور مؤثر طاقت بن کر ابھر سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں عالمی طاقتیں اس انقلابی قوم کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تُلی ہوئی تھیں۔ اندریں حالات قرآن نے اس بشارت کا اعلان ان الفاظ میں کیا :

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ[1]	اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور اچھے کام کرنے والوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ ضرور تمہیں زمین میں حکومت دے گا جس طرح پہلوں کو دی تھی اور ضرور ان کے لیے ان کا وہ دین (اسلام) جو اللہ نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے، مستحکم کر دے گا اور ضرور ان کے سابقہ خوف کو امن میں بدل دے گا۔

اس پیشینگوئی کا عملی ظہور بھی چشم فلک نے دیکھ لیا۔ عہدِ رسالت میں اسلامی فتوحات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، روز افزوں ترقی پذیر رہا۔ عہدِ خلافتِ راشدہ میں روم اور ایران سمیت قریباً ۱۲ لاکھ مربع میل سے زائد رقبہ اسلامی سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ عہدِ فاروقی ہی میں بلوچستان کی سرحدوں تک مسلمان پیغامِ اسلام لے کر پہنچ چکے تھے۔ ابھی اسلام کی پہلی صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ سپین سے آگے سرحد فرانس تک، مشرق میں سندھ اور ملتان تک، مزید برآں ماوراء النہر سے آگے سرحدِ چین تک، وسطی ایشیا، شمالی افریقہ، اور دنیا میں انسانیت کے کثیر ترین حصے پر پرچمِ اسلام لہرانے لگا۔ سطوتِ اسلام کا یہ پُرشکوہ نظارہ قرآنی وعدے کے مطابق تقریباً چھ سو سال تک قائم و دائم رہا۔ زوالِ بغداد کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر عثمانی ترکوں کی زیرِ قیادت ملتِ اسلامیہ کی

[1] النور، ۲۴ : ۵۵

Marfat.com

سیاسی قوت مجتمع ہوئی اور بالآخر بین الاقوامی سطح پر غلبۂ اسلام کا دور پھر چھ سو سال تک منصّۂ عالم پر شہود پذیر رہا۔

اس طرح کی پیش گوئیاں، جو قرآن نے بیان کیں اور اپنے اپنے وقت پر عالمِ خارج میں واقع ہو کر حقانیتِ قرآن کی حتمی دلیلیں بنتی رہیں، تعداد میں اتنی ہیں کہ ان کا احصاء و شمار آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔

۹۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت

قرآنی اعجاز کی دلیلِ ناطق اس کی ہدایت کا نتیجہ خیز ہونا ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف اپنی ہر دعوت کو حتمی، قطعی اور یقینی طور پر فیصلہ کن اور نتیجہ خیز قرار دیا ہے بلکہ معیارِ صداقت حقانیت بھی نتیجہ خیزی ہی کو قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم میں کامل یقین کے میسر آنے کی جس تدبیر کا بھی ذکر کیا گیا ہے وہ بہرصورت تجربی توثیق اور مشاہدۂ حقیقت اور نتیجہ خیزی کے تصور پر مبنی ہے۔ موضوعِ مذکورہ کی وضاحت سے قبل ضروری ہے کہ نتیجہ خیزی کا مفہوم اور یقین کا تصور اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

مطالعۂ قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشاہدۂ کائنات اس لیے کروایا گیا تھا کہ انہیں یقین کے اعلیٰ مقام پر فائز کیا جا سکے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِیْ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِیَكُوْنَ مِنَ	اور ہم نے اسی طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہتوں کا مشاہدہ کروایا، تاکہ وہ صاحبِ یقین

Marfat.com

الْمُوْقِنِيْنَ [1] ہو سکے۔

حالانکہ کائنات ارض وسماء کے وجود پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تو پہلے بھی تھا اور یہ بھی یقیناً ان کے ایمان میں شامل تھا کہ آسمان و زمین کی ساری حکومت و سلطنت کا مالک باری تعالیٰ ہے لیکن ایمان کے بعد ایقان کو نتیجۂ مشاہدہ پر منحصر قرار دیا گیا۔ اسی طرح باری تعالیٰ کی قدرتِ اماتت و احیاء پر بھی ابراہیمؑ کا بحیثیت پیغمبر ایمانِ کامل تھا کہ وہ ذات جس طرح مارتی ہے اسی طرح زندہ کرنے پر بھی قادر ہے لیکن اس کے باوجود آپ نے عرض کیا :

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی [2] اے میرے رب ! مجھے مشاہدہ کروا، تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

اس مطالبہ پر ارشادِ باری ہوا :

قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ [3] کیا تو اس بات پر ایمان نہیں رکھتا؟۔

حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ حق بھی اس امر سے بے خبر نہ تھی کہ ابراہیمؑ میری قدرت پر ایمان تو رکھتے ہیں لیکن سوال کیوں کر رہے ہیں۔ قدرتِ باری پر ایمان کے بغیر 'پیغمبری' کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا اور ابراہیمؑ تو جد الانبیاء تھے۔ یہ سوال و جواب محض اس مقصد کے لیے تھا کہ خلقِ خدا ادھر متوجہ ہو اور قدرتِ الٰہیہ کے مفروضی نتیجے کا مشاہدہ کر کے حضرت ابراہیمؑ کی طرح دولتِ یقین سے بہرہ ور ہو سکے۔ آپ نے عرض کیا :

---

[1] الانعام (۶ : ۷۶)

[2] البقرہ (۲ : ۲۶۰)

[3] البقرہ (۲ : ۲۶۰)

Marfat.com

قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ ؎۱

انہوں نے جواب دیا (اے باری تعالیٰ) ایمان تو رکھتا ہوں لیکن مشاہدے سے اطمینانِ قلب چاہتا ہوں۔

چنانچہ آپؑ نے پرندوں کو ذبح کر کے ان کے ٹکڑوں کو مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں پر متفرق طور پر رکھ دیا اور انہیں ندا دی تو وہ زندہ ہو کر دوڑتے ہوئے چلے آئے۔ جب اُنہوں نے حکمِ الٰہی کی یہ نتیجہ خیزی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تو فرمایا گیا،

وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ؎۲

پس اب جان لے کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام نے بھی مردوں کو زندہ ہونے کے امر کا مفروضی نتیجہ دیکھنا چاہا۔ چنانچہ اُنہیں سو سال کے بعد پھر زندہ کیا گیا۔ ان کی سواری کو ان کے سامنے مٹی میں سے زندہ کیا گیا اور دوسری طرف انہیں یہ بھی دکھایا گیا کہ سو سال گزر جانے کے باوجود ان کا کھانا ابھی باسی نہ ہوا تھا۔ باری تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے یہ نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ کر عزیرؑ فرمانے لگے،

اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ؎۳

میں جان گیا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

مشاہدۂ نتائج سے حاصل ہونے والا یہ علم ایمان کے لیے نہ تھا۔ کیونکہ ایمان بالغیب تو پہلے ہی موجود تھا یہ علم حصولِ ایقان کے معنوں میں بیان کیا گیا ہے۔

؎۱ البقرہ (۲ : ۲۶۰)

؎۲ " " "

؎۳ " " "

Marfat.com

مذکورہ بالا تین واقعات سے استشہاد و استدلال کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ قرآن کے نزدیک یقین "نتیجہ خیزی کی اس ضمانت" کا نام ہے جو معروضی نتائج کے مشاہدے کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ [1]

اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے معروضی کامیابی اور نتیجہ خیزی کی ضمانت میسر آجائے۔

مشاہدے کی اسی منزل کا نام یقین ہے جس تک پہنچنے کے لیے حکم عبادت دیا جا رہا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ اگر کسی کے پیش کردہ نظریۂ علم میں ایجابی اور منفی دونوں طرز کے نتائج پیدا کرنے کی ضمانت موجود ہو تو اس علم کو یقینی علم کہا جائے گا اور یہی خوبی قرآنی علم و ہدایت کا طرۂ امتیاز ہے۔

یقین اور نتیجہ خیزی کا مفہوم سمجھ لینے کے بعد قرآن مجید کا یہ اعجاز اور اس کی حقانیت کی یہ داخلی دلیل سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ قرآن میں نتیجہ خیزی کی ضمانت کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے سلسلۂ علم و ہدایت کا یہ اعجاز ہے کہ اس کا ہر دعویٰ تجربی توثیق کی بنا پر معروضی نتائج پیدا کرنے کا ضامن ہے۔ اس سلسلے میں چند ارشادات قرآنی ملاحظہ ہوں:

- قرآنی ہدایت کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو دنیا و آخرت میں خوف و غم کی محیط کیفیت سے نجات دے دی جائے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے اس دعویٰ کی نتیجہ خیزی کا بیان اس طرح کیا:

---

[1] الحجر (۱۵: ۹۹)

Marfat.com

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ [1]

پس جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آجائے تو تم میں سے جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا پس اس کو نہ کوئی خوف رہے گا اور نہ کوئی غم۔

- اسی طرح قرآن "اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ" (بیشک خدا کا گروہ ہی غالب ہونے والا ہے) کا اعلان کرکے اس دنیا میں باطل کے مقابلے میں غلبۂ دینِ حق کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ دعویٰ محض اس لیے نہیں کیا گیا کہ مسلمان اس کی آرزو تو کر سکیں لیکن اس کی عملی اور واقعاتی نتیجہ خیزی کا مشاہدہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس امر کی ضمانت بھی ساتھ ہی مہیا کر دی گئی:

- لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ [2]

  تم پست ہمت نہ ہونا اور نہ غم کرنا، بیشک غلبہ و کامیابی تم ہی کو ملے گی۔ اگر تم (صحیح طور پر) صاحبِ ایمان رہے۔

- ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

  فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ [3]

  پس تم سستی نہ کرو اور نہ باطل سے سمجھوتہ کرو، پھر تم ہی غالب ہو کر رہو گے، اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہاری کوششوں کو بے نتیجہ (یا خسارے میں) نہیں جانے دے گا۔

---

[1] البقرہ (۲: ۳۸)

[2] آل عمران (۳: ۱۳۹)

[3] محمد (۴۷: ۳۵)

Marfat.com

- ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ [1]

اور جو اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کو (صحیح معنوں میں) دوست بنائے بیشک (وہی) اللہ کا گروہ (ہے جو) غالب و کامیاب ہوگا۔

- اس امر کی مزید وضاحت درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے:

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۞ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۞ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ [2]

اور بیشک ہمارا یہ وعدہ اپنے ان بندوں کے ساتھ جو انبیاء و رسل تھے پہلے ہی سے ہو چکا ہے۔ یقیناً ہماری مدد و نصرت انہیں کو حاصل رہی ہے۔ اور یقیناً ہمارا ہی لشکر (یعنی گروہ) باطل کے مقابلے میں ہمیشہ غالب آتا ہے۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ خدا کا وعدہ محض دعوے سے نہیں بلکہ فی الواقع اس کارگہِ حیات میں حق و باطل کے درمیان ہونے والی کش مکش میں اہلِ حق کو غالب اور فتحیاب کر دینے سے ہی پورا ہو سکتا ہے اور یہی دعوئ قرآن کی نتیجہ خیزی ہے۔

- قرآنِ مجید انبیاء سابق کے حوالے سے اقوامِ حق و باطل کی منظم کش مکش کے ضمن میں ارشاد فرماتا ہے:

---

[1] المائدہ (۵ : ۵۶)

[2] الصّٰفّٰت (۳۷ : ۱۷۱ تا ۱۷۳)

Marfat.com

وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍۭ بِرَسُوْلِهِمْ لِيَاْخُذُوْهُ وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ[1]

اور ہر گمراہ قوم نے اپنے رسول کے بارے میں ارادہ کیا کہ اسے پکڑ لیں یعنی شکست دے دیں۔ اور وہ باطل قوت کے ذریعے اس سے جھگڑتے بھی رہے تاکہ اس کوشش سے حق کی تاثیر اور نتیجہ خیزی کو زائل کر دیں۔ یعنی نتائج کے اعتبار سے پیغمبرانہ جدوجہد کو ناکام بنا دیں۔ لیکن ہوا یہ کہ میں نے انہیں اپنی گرفت میں لے کر شکست دے دی۔ پس میری سزا کیسی تھی؟۔ اور (جس طرح اس دنیا میں میرا یہ وعدہ کہ حق کو فتح اور باطل کو ذلت آمیز شکست ہوگی، نتائج کے لحاظ سے سچا ثابت ہوا) اسی طرح تیرے رب کی یہ بات بھی کفار پر حق ثابت ہوگئی کہ وہی آگ میں جلیں گے۔

اگر اس آیت کے مضمون غور فرمائیں تو آپ پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ قرآن نے اس دنیا میں اہل حق کی نتیجہ خیز کامیابی کو آخرت کی کامیابی کی دلیل قرار دیا ہے۔ یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ جو قرآن آخرت میں اہل حق کی کامیابی اور اہل باطل کی ناکامی کے تصور کی حقانیت و صداقت کے لیے اس دنیا میں وعدہ غلبہ حق کی تکمیل کو بطور ثبوت پیش کر رہا ہے کس طرح ممکن ہے کہ اس قرآن نے اپنے ہر دعوے کی صداقت

---

[1] المومن (۴۰: ۵-۶)

Marfat.com

اور دُنیا میں اسکی نتیجہ خیزی کی ضمانت مہیّا نہ کی ہو گی۔ بلکہ اس کے برعکس جدّوجہد کا اس دنیا میں اور نتیجہ و انجام کا وعدہ آخرت میں کیا ہو گا ——— عقلِ سلیم اس امر کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے جو ذہن اس تصور پر قانع اور مُصر ہے کہ "جدوجہد کرنا ہمارا فرض ہے، مطلوبہ نتائج پیدا ہوں یا نہ ہوں اس دنیا میں اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ یہاں کی کامیابی کوئی معنی نہیں رکھتی، اصل کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے" وہ دینِ حق کی صحیح معرفت سے محروم ہے اور وہ لاشعوری طور پر قرآنی ہدایت کی عظمت اور صداقت و حقانیت کا انکار کر رہا ہے۔ یہی پہلو تو درحقیقت قرآنی اعجاز کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اس کا کیا ہوا ہر وعدہ اسی دنیا میں نتیجہ خیزی کے ذریعے اپنی صحت و صداقت کا ثبوت فراہم کرتا ہے اور یہاں معروضی نتائج کا مشاہدہ کروا تنبیہ کرتا ہے کہ اسی طرح آخرت میں بھی کامیابی اہلِ حق کو اور ناکامی اہلِ باطل کو نصیب ہو گی۔ قرآن کا ہر دعویٰ ایک فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حقیقت ہے، شاعرانہ تعلّی نہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ [1]	اور ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو شعر نہیں سکھائے نہ وہ اُن کے شایانِ شان تھے۔ بلکہ یہ تو کھلی نصیحت ہے اور روشن قرآن ہے۔

اس آیت کے ذریعے یہ حقیقت واضح کر دی گئی کہ قرآن کے دعاوی اور اعلانات شاعرانہ تعلی نہیں ہیں جن کا عملی زندگی اور نتیجہ خیزی کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہو بلکہ یہ تو ایسی کھلی اور روشن حقیقتیں ہیں، جو خود ہی اپنی صداقت و حقانیت پر

---

[1] یٰسین (۳۶ : ۶۹)

Marfat.com

دلالت کرتی ہیں۔

قرآنِ مجید نے اپنی تاثرات وخصوصیات کا ذکر مختلف عنوانات کے ذریعے کیا ہے، اگر ان کی معنوی دلالت پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قرآن ہر عنوان کے تحت اپنی کسی نہ کسی فیصلہ کن اور نتیجہ خیز حیثیت کو بیان کر رہا ہے۔ مثلاً:

● ــــ قرآن ــــ ہدایت ہے ــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (اسراء: ۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تاریکی وظلمت اور بے یقینی کی کیفیت سے نکال کر منزلِ مقصود تک پہنچا دینے کی حتمی وقطعی ضمانت عطا کرتا ہے۔

● ــــ قرآن ــــ تصدیق ہے ــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا، وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (یوسف: ۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن صحفِ ماقبل کی آسمانی حیثیت اور ان کے احکام وتعلیمات کی حقانیت کی فیصلہ کن ضمانت عطا کرتا ہے۔

● ــــ قرآن ــــ تفصیل وتبیین ہے ــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا، وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ (یوسف: ۱۱۱) اور وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل: ۸۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حقائقِ کائنات کے تمام گوشوں کی تفصیلی وضاحت اور علمی وفکری تشکیک کے خاتمے کی یقینی ضمانت عطا کرتا ہے۔

● ــــ قرآن ــــ رحمت ہے ــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا، وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (یوسف: ۱۱۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی اذیت سے نجات کی اطمینان بخش ضمانت عطا کرتا ہے۔

Marfat.com

● —— قرآن —— شفا ہے —— اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا : وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ (یونس، ۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن ہر فرد اور معاشرے کو داخلی و خارجی اور ظاہری و باطنی (ہر قسم کے) امراض و مصائب سے کلی نجات کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

● —— قرآن —— موعظت ہے —— اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا : قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (یونس، ۵۷) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن تنبیہ، تنذیر اور تبشیر کی صورت میں نفسیاتی تبلیغ کے ذریعے شعورِ انسانی کو طلبِ کمال اور اس کے حصول کی حتمی ضمانت عطا کرتا ہے۔

● —— قرآن —— بشارت ہے —— اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا ، وَ هُدًی وَّ رَحْمَةً وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ (نحل، ۸۹) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن دنیا و آخرت میں خیر اور حق کو شر اور باطل کے مقابلے میں فتح و نصرت اور کامیابی و کامرانی کی بشارت انگیز ضمانت عطا کرتا ہے۔

● —— قرآن —— فرقان ہے —— اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا : وَ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ (بقرہ : ۱۸۰) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان واضح نتیجہ خیز اور فیصلہ کن امتیاز کے ظہور کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

● —— قرآن —— مخرج من الخوف والحزن ہے —— اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا ، فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (بقرہ : ۳۸) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن فرد اور معاشرے کو اپنی پیروی کی صورت میں ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی خوف و غم سے بے نیاز کر دینے کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

Marfat.com

● ـــــ قرآن ـــــ روشن کتاب ہے ـــــ اس ضمن میں ارشاد فرمایا گیا: تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُّبِينٍ (النمل: ۱) اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن واضح اور فیصلہ کن انداز میں ـــــ غلبۂ حق کی جد وجہد کے تمام مراحل کے لیے جملہ تفصیلات کی فراہمی اور قطعی نتیجہ خیزی کی ضمانت عطا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا قرآنی حیثیات ـــــ جہاں اپنی تاثیر اور افادیت کے لحاظ سے عام ہیں ـــــ وہاں ان کا فیض بھی عام ہے، اور فیصلہ و نتیجہ بھی۔ خواہ اس ابدی اور آفاقی اصول اور ضابطے کو مسلمان اپنا لیں یا غیر مسلم چونکہ قرآن کا فیضان کائناتی ہے اور اس کا دائرۂ خطاب بھی آفاقی ہے۔ لہٰذا بلا امتیاز رنگ و نسل اور علاقہ و مذہب جو قوم و ملت اور طبقۂ افرادِ انسانی، قرآنی تعلیم اور ہدایت کے جس گوشے کو عملاً اپنا لے گا، قرآن کا فیصلہ اپنی تاثیر کے اعتبار سے اسی کے حق میں ناطق اور نتیجہ خیز ہوگا۔ قرآنی تعلیمات اپنی نفع بخشی اور فیض رسانی کے باب میں کسی کے لیے بھی جانب دار نہیں ہیں۔

اس نکتے کی وضاحت سے یہ اشکال رفع ہو جائے گا کہ آج مسلمان قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود عالم کفر کے مقابلے میں شکست خوردہ، کمزور، ناتواں اور پریشان حال کیوں ہیں؟

قرآنی تعلیمات کی فیصلہ کن تاثیر اور نتیجہ خیزی ان پر محض ایمان لانے سے نہیں بلکہ ان کو انسانی زندگی میں واقعہ بنانے سے میسر آتی ہے۔ ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر ان تعلیمات کو عملاً خیرباد کہہ چکے ہوں اور کفر و طاغوت کے علمبردار اپنی زندگی کے بعض گوشوں میں ان تعلیماتی حقائق کو عملاً واقعہ بنا چکے ہوں تو کیا وجہ ہے کہ وہ اس کائناتی کتاب کی نتیجہ خیز ہدایت کے فیضان سے محروم رہیں۔ قرآنی ہدایت کی نتیجہ خیزی کا وعدہ بالعموم اس کی تعلیمات کے حوالے سے ہے نہ کہ افراد و طبقات کے حوالے سے، اس لیے جو کوئی بھی کسی مخصوص قرآنی تعلیم کی نتیجہ خیزی کی شرائط کو

Marfat.com

پورا کیے بغیر نتیجہ خیزی کی آرزو کرے گا، یہ آرزو محض عبث ہو گی۔ اور جہاں تک اُخروی فلاح کا تعلق ہے تو وہ ہے ہی ہی صرف مومنین و صالحین کے لیے۔ اس لیے اس میں سے ہر ایک برابر حصہ نہیں لے سکتا۔ قرآنی ہدایت و تعلیمات اور اس کے اصول و ضوابط کے درمیان مذکورہ بالا امتیاز کو سمجھ کر ہر سوال کا تسلی بخش جواب میسر آسکتا ہے۔ اگر قرآن کے بیان کردہ تمام ضابطوں کی افادیت، تاثیر اور نتیجہ خیزی صرف ایک کلمہ گو طبقے تک محدود کر دی جائے تو اس کی آفاقی و کائناتی حیثیت برقرار نہیں رہتی۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ قرآن پوری نوعِ انسانی کی رہنمائی اور فلاح و بہبود کے لیے نازل ہوا ہے اور رسالتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی اسی طرح عالمگیر ہے۔ قرآن خود اعلان کرتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا [1] — اے نسلِ بنی آدم! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں۔

چنانچہ جو کوئی جتنا قرآنی ہدایت کو عملاً قبول کرے گا وہ اسی قدر حصہ پائے گا۔ اسی "قرآنی نتیجہ خیزی کی ضمانت" کا نام مشیتِ الٰہی ہے۔ ربِ ذوالجلال نے آفاقی اصول و ضوابط بنی نوعِ انسان کو عطا کر دیے ہیں اور انہیں ان کے رد و قبول میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ جو کوئی ان پر عمل کرے گا یا ان سے انحراف کرے گا، مقررہ ایجابی اور منفی نتائج بھگت کر رہے گا۔ مسلم ہو یا غیر مسلم مشیتِ الٰہی کے اس نتیجہ خیز فیصلے سے کسی کو مفر نہیں ہو سکتا۔ قرآنی ہدایت کی یہ خوبی اس کی حقانیت اور اعجاز کی ایسی ابدی دلیل ہے جس کا مشاہدہ آج بھی زوال پذیر ملتِ اسلامیہ کر رہی ہے۔

---

[1] الاعراف، ۷: ۱۵۸

Marfat.com

Marfat.com

باب چہارم

ایمان بالملائکہ

Marfat.com

Marfat.com

○

ملائکہ کی حقیقت

ملائکۃ۔ مَلْاَکٌ کی جمع ہے۔اس سے مفاعل کے وزن پر ملائک ہے جیسے مطلع کی جمع مطالع آتی ہے۔ ملائک کے بعد "ۃ" تانیث جمع کے طور پر آئی ہے۔ملائکۃ کا واحد مَلَکٌ بھی بتایا گیا ہے۔اس کا مادہ اَلْکٌ ہے جس کے معنی اَرْسَلَ (اس نے بھیجا) کے ہیں۔اسی طرح اَلُوْکَۃٌ کے معنی بھی رسالت یعنی پیغام رسانی کے آتے ہیں۔چونکہ یہ مخلوق باری تعالیٰ کے پیغامات اس کے مقبول اور مقرب بندوں تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے اس لیے اسے "مَلَائِکَۃ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔علماء فرماتے ہیں انھم وسائط بین اللہ تعالیٰ وبین الناس" (یہ ملائکہ، اللہ تعالیٰ اور انسانوں کے درمیان واسطے اور وسیلے کی حیثیت رکھتے ہیں)۔
اہل علم نے ملائکہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی اقوال اور تعریفات بیان کی ہیں۔لیکن صحیح ترین اور متفقہ قول یہ ہے "انھا اجسامٌ لطیفۃٌ قادرۃٌ علی التشکل باشکال مختلفۃ" (البیضاوی) (یہ وہ لطیف اور نورانی اجسام ہیں، جنہیں اپنی لطافت کے باعث مختلف شکلیں بدلنے پر قدرت

Marfat.com

حاصل ہوتی ہے)۔

عام انسان انہیں ان کی اصل صورت میں نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ انسانی آنکھ صرف کثیف اور مادی اجسام کو ہی دیکھ سکتی ہے۔ غیر مادی اور لطیف اشیاء کو نہیں۔ مگر وہ عرفاءِ کاملین جنہوں نے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے ذریعے اپنی باطنی آنکھ روشن کرلی ہوتی ہے اور ان کی چشم بصیرت سے مادی حجابات اُٹھ چکے ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف ملائکہ کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ انہیں ان سے ملاقات اور اکتسابِ فیض کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے۔

فرشتوں کے غیر حسّی اور غیر مرئی ہونے کے باعث بعض کم فہم لوگوں نے ان کے خارجی وجود (EXTERNALITY) کا ہی انکار کر دیا ہے۔ اور چونکہ قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر بصراحت فرشتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس لیے اِن آیاتِ قرآنی کی تاویلِ فاسد کرتے ہوئے فرشتوں کو مجرّد انسانی قوتوں، نیک انسانی روحوں، قوائے عالم یا صفاتِ باری تعالیٰ سے تعبیر کر دیا ہے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے جبرئیل امین کو عین ملکۂ نبوت قرار دے دیا ہے۔ یہ سب تصوّرات گمراہی پر مبنی ہیں اور فلسفۂ حسیت کی پیداوار ہیں۔

تصوّرِ ملائکہ اور قرآن

قرآنِ مجید کی بیسیوں آیات اور احادیثِ نبوی سے فرشتوں کے جس تصوّر کی تائید ہوتی ہے۔ وہ وہی ہے جس کو جمہور اہلِ اسلام اوائلِ تاریخ سے آج تک اپنائے ہوئے ہیں۔ فرشتے انسانی روحیں، قوتیں یا صفاتِ الٰہیہ ہرگز نہیں بلکہ انسانوں اور جنوں سے الگ ایک مستقل نوع کی لطیف مخلوق ہیں جن کا مسکن آسمان ہیں۔ اُنہیں باری تعالیٰ نے اپنے خصوصی اُمور کی انجام دہی اور احکامِ قدرت کی

Marfat.com

تدبیر و تعمیل اور تنفیذ کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ گویا یہ ذاتِ حق کے وہ کارکن ہیں جن سے خلقی طور پر نافرمانی اور گناہ صادر ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنے خمیر اور ہیئتِ تخلیق کے اعتبار سے ہی "معصوم" ہیں۔ ان کا وجود سراسر نُور ہے۔ ان میں جنّات اور انسانوں کی طرح شر و فساد اور فتنہ و ظلم کا نہ کوئی ملکہ ہے اور نہ استعداد۔ اس لیے روزِ قیامت یہ جواب دہی اور مواخذے سے بھی مستثنیٰ ہوں گے۔ بعض اقوام نے انہیں غلطی سے خدا کی بیٹیاں تصوّر کیا، بعض نے ان کے کام کی نوعیت کے پیشِ نظر انہیں خدائی میں شریک بنا دیا۔ جب کہ بعض نے ان کی پرستش بھی کی۔ قرآنِ مجید نے کئی مقامات پر ان تمام تصوّراتِ باطلہ کی تردید کی ہے اور ان کے بارے میں صحیح تصوّر یوں واضح کیا ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا [1] — اور انہوں نے ان فرشتوں کو جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اس کی بیٹیاں بنا دیا۔

ایک اور مقام پر اس کی تصریح یوں کی گئی ہے:

بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ [2] — بلکہ وہ فرشتے خدا کے معزز بندے ہیں۔

ان کی بندگی کا یہ عالم ہے کہ:

يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ [3] — فرشتے دن رات خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور ہرگز نہیں تھکتے۔

ایک اور مقام پر مذکور ہے:

---

[1] الزخرف (۴۳ : ۱۹)

[2] الانبیاء (۲۱ : ۲۶)

[3] الانبیاء (۲۱ : ۲۰)

Marfat.com

وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ [1]

اور آپ فرشتوں کو عرش کے ارد گرد خدا کی تسبیح کرتے ہوئے دیکھیں گے۔

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا،

لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ [2]

فرشتے خدا سے بات کرنے میں پیشقدمی نہیں کرتے اور وہ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتے رہتے ہیں۔

جہاں باری تعالیٰ چاہتا ہے۔ ان کے ذریعے اپنے مقبول بندوں اور دوستوں کی مدد کرتا ہے۔ جیسا کہ جنگِ بدر میں فرشتوں نے مسلّح ہو کر مجاہدینِ اسلام کی مدد کی۔ ارشادِ قرآنی ہے:

يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ [3]

تمہارے رب نے پانچ ہزار مسلّح فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کی۔

فرشتوں کے بارے میں غلط تصوّرات کی نفی

ان تمام آیات کے مطالعہ سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرشتوں کو بحیثیت مخلوق باقاعدہ وجود اور تشخص حاصل ہے۔ وہ مستقل ہستیاں ہیں، مجرّد قوتیں

---

[1] الزمر (۳۹ : ۷۵)

[2] الانبیاء (۲۱ : ۲۷)

[3] آل عمران (۳ : ۱۲۵)

Marfat.com

یا نظامِ عالم کے اسباب (CAUSES OF PHYSICAL PHENOMENA) نہیں ہیں۔ جیسا کہ بعض ان تجدد پسند لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے بلاجواز انہیں سائنسی تحقیق کا موضوع بنا لیا ہے۔ انہوں نے آیاتِ قرآنی کی فاسد تاویلات اور احادیثِ نبوی کے انکار کی بنا پر فرشتوں کے تصور کو اس طرح مسخ کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ کسی نہ کسی سائنسی اُصول اور معیار کے تابع ہو جائے۔ ایسے لوگ اس حقیقت کو یکسر نظرانداز کر دیتے ہیں کہ فرشتے جس نوعِ تخلیق سے تعلق رکھتے ہیں وہ سائنس کے دائرۂ تحقیق (SCOPE OF RESEARCH) سے ہی خارج ہے۔ سائنس صرف عالمِ حیات و مادیات (PHYSICAL AND MATERIAL WORLD) کے حقائق سے بحث کرتی ہے۔ اسے مابعد الطبیعی اور روحانی حقیقتوں (META-PHYSICAL AND SPIRITUAL REALITIES) سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اس لیے سائنس کا یہ کام نہیں کہ اپنے موضوعِ تحقیق سے ہٹ کر کسی غیر متعلقہ حقیقت سے بحث کرے۔ اس کی ماہیت اور وجود کے بارے میں رائے زنی کرے جو شے اس کی حدِ جستجو سے ماوراء ہو اس کا انکار کر دے۔ سائنس کے نام پر ایسی نام نہاد تحقیق خود غیر سائنسی (UN-SCIENTIFIC) بات ہے۔

اگر ہماری عقل اپنی محدود وسعتِ نظر کی بنا پر فرشتوں کا صحیح ادراک نہ کر سکتی ہو تو اس وجہ سے ہم فرشتوں کے تصوّر کو "خلافِ عقل" قرار نہیں دے سکتے۔ بلکہ اسے "وراء عقل" کہیں گے۔ کسی چیز کا خلافِ عقل ہونا اور بات ہے اور وراءِ عقل ہونا اور بات۔ عقل وخرد کے ادراک کا تمام تر انحصار حواسِ خمسہ (FIVE SENSES OF PERCEPTION) پر ہوتا ہے۔ جو چیز آنکھ، کان، ناک، زبان یا ہاتھ کے ادراک میں آسکے، عقل صرف اسی کو سمجھ سکتی ہے اور اسی کے بارے میں کوئی رائے وضع کر سکتی ہے۔ لیکن جس شے کا وجود ہی سرے سے غیر حسّی اور غیر مادی ہو اسے نہ دیکھا

Marfat.com

جاسکتا ہو اور نہ سونگھا جاسکتا ہو، نہ سُنا جاسکتا ہو، نہ چکھا جاسکتا ہو، نہ چھونا ممکن ہو، گویا حواس ظاہری جس حقیقت کے بارے میں کوئی خام مواد اور ابتدائی معلومات ہی فراہم نہ کرسکیں تو آپ خود ہی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ عقل اس کے بارے میں کوئی تصور کس طرح قائم کرسکے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ عقل اس معاملے میں خاموش ہی رہے گی۔ عقل کا خاموش رہنا اس کی اپنی حدود (LIMITATIONS) کی وجہ سے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ کبھی اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ اس حقیقت کا ہی سرے سے کوئی وجود نہیں۔ آخر ہر چیز کو عقل اور سائنس کے حیطۂ ادراک (SCOPE OF PERCEPTION) میں کھینچ لانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا عقل اور سائنس کی حدِ جستجو سے اوپر یا خارج کوئی حقیقت موجود نہیں؟ یہ اندازِ فکر ہمیں خدا و رسولؐ، وحی و آخرت بلکہ جملہ اجزائے ایمان سے انکار کی حد پر لا کھڑا کریگا اور "ایمان بالغیب" کا تصور ہی بالکل معدوم ہو جائیگا۔

جس طرح ہر چیز کو جاننے کا ایک خاص ذریعہ ہوتا ہے۔ مثلاً آواز کو جاننے کا ذریعہ کان ہیں، ذائقے کو جاننے کا ذریعہ زبان ہے اور خوشبو کو جاننے کا ذریعہ ناک ہے۔ اس مخصوص ذریعے کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے اس مخصوص حقیقت کو نہیں جانا جاسکتا۔ اسی طرح محسوسات اور معقولات سے ماوراء حقیقتوں کو جاننے کے بھی کچھ مخصوص ذرائع ہیں جنہیں صرف انہی کی مدد سے جانا جاسکتا ہے ان کے بغیر نہیں اور وہ ہیں نورِ باطن یا وحی الٰہی۔ نورِ باطن ایسا ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی قلبی اور روحانی استعداد کے طور پر ان کے اندر رکھا ہے۔ اس ذریعے کا کام (FUNCTION) صرف تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کے مراحل طے کرنے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں اور جن مابعد الطبیعی حقیقتوں کے کامل ادراک سے یہ باطنی ذریعہ بھی قاصر ہو۔ انہیں صرف وحئ الٰہی اور واسطۂ نبوت سے جانا جاسکتا ہے اس کے بغیر کسی اور صورت سے نہیں۔ لہٰذا فرشتوں کے وجود اور ماہیت یا ایسی ہی دیگر عالمِ امر کی حقیقتوں کے بارے میں صاحبِ نبوت کا قول سند ہو سکتا ہے، کسی اور محقق، فلسفی یا سائنسدان کا نہیں۔

Marfat.com

باب پنجم

ایمان بالقدر

Marfat.com

Marfat.com

○

ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم ترین موضوع "ایمان بالقدر"[1] ہے۔ جو اجزائے ایمان میں سے آخری، مگر انتہائی مہتم بالشان جزو ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی مسئلہ کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات اور اوہام ووساوس پائے جاتے ہیں، نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موضوع پر کرید کرید کر گفتگو سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ شیطان تم میں سے

---

[1] "القدر" قدر یقدر (قدیراً) سے مصدر ہے، جس کے لفظی معنی اندازہ لگانے، پیدا کرنے، لکھنے یا توانا ہونے کے ہیں، لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد خداوند تعالیٰ کا وہ ذاتی ارادہ ہے، جو مختلف حقائق کائنات کے تعلق میں اپنے اپنے مقررہ اوقات پر ظاہر ہوتا ہے۔ (دستور العلماء، ۳: ۴۲، مطبوعہ حیدرآباد دکن)

خداوند تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کے بے پناہ خزانے ہیں، مگر ان خزانوں کو ایک خاص اندازے سے نازل کیا جاتا ہے، ارشاد باری ہے:

وَ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر، ۱۵: ۲۱)

ہر چیز کے ہمارے پاس بے شمار خزانے ہیں، مگر ہم انہیں ایک مقررہ اندازے سے ہی نازل کرتے ہیں۔

اسی مسئلے کا نام مسئلہ تقدیر یا مسئلہ قضا و قدر ہے۔

Marfat.com

کسی ایک کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا، فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا، یہاں تک کہ وہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا، آپؐ نے فرمایا کہ بس یہاں رک جاؤ، شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو۔ اس سے آگے نہ سوچو۔ [1] مقصد یہ تھا کہ لوگ اس پیچیدہ اور نازک مسئلے میں خوامخواہ الجھ کر اپنی عاقبت نہ خراب کر بیٹھیں۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّمہ ہے کہ انسانی عقل و دانش اس نازک مسئلے کے حقیقی مضمرات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اس موضوع پر بحث و تمحیص میں حد سے آگے بڑھنے کا نتیجہ گمراہی ہی ہو سکتا ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ "انسان کے مجبور یا مختار" ہونے کا مسئلہ صرف مذہبی فلسفے کا ہی موضوع بحث نہیں رہا، بلکہ یہ دنیا بھر کے فلاسفہ، مفکرین اور علماء کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ نفسیات، جرمیات، عمرانیات اور دیگر مختلف فلسفوں میں اس مسئلے پر سیر حاصل مباحث ملتے ہیں۔ جنہیں مسلم اور غیر مسلم مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے اپنے فکر اور اپنے اپنے علم سے فروغ بخشا ہے۔ پھر یہ ہر زبان کے ادب اور شاعری کا بھی موضوع رہا ہے، اس بنا پر اس مسئلے میں قسم قسم کی آراء ملتی ہیں، اسی لیے اس کے اثرات خواص سے لے کر عوام تک کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار انجام دیتے ہیں۔

(الف) خلق عمل اور کسب عمل میں فرق

اس سلسلے میں قرآن کریم تقدیر کے جس کلیے پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اور اس کے جملہ اعمال کو اللہ تعالیٰ نے

---

[1] بخاری و مسلم، نیز مشکوٰۃ شریف، ۱ : ۳۰۔

Marfat.com

تخلیق کیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے :

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ [1] — حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو خدا نے ہی پیدا کیا ہے۔

اس آیت میں انسان اور اس کے اعمال دونوں کی تخلیق کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر یاد رہے کہ تخلیق اور کسب دو مختلف المعانی اور مختلف المقاصد الفاظ ہیں، کسب (اسی سے اکتساب بروزن افتعال ہے) کے معنی کرنے یا کمانے کے ہیں۔ جبکہ خلق اور تخلیق کے معنی کوئی چیز پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے ہیں۔ انسان اپنے افعال کا مکتسب (یعنی کمانے اور کرنے والا) ہے، مگر ان کا خالق اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ انسان اور اس کی تمامتر اشیا و اعمال مخلوقِ محض ہیں، جبکہ خداوند تعالیٰ دنیا کی ہر چیز کے خالق و باری ہیں۔ اس طرح اس کائنات میں فقط دو تصوّرات رہ جاتے ہیں، اول خداوند تعالیٰ کے خالق ہونے کا تصوّر اور دوم انسان اور اس کے جملہ افعال کے مخلوق ہونے کا تصور، خالق ہر فعل میں خالق ہے اور مخلوق اپنی ہر صفت میں مخلوق۔

خدا اور اس کی ذات و صفات کے سوا چونکہ کائنات کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ چیز مخلوق ہے، اس لیے کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے اعمال و افعال بھی مخلوق ہیں، جن کی من حیث المخلوق، تخلیق تو باری تعالیٰ نے کی ہے، مگر کسب و ارتکاب انسان اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے۔ اس لیے اب اس سوال کا جواب کہ انسان کی اپنے افعال کی طرف کیا نسبت ہوگی۔ قرآن کریم یہ واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں، بلکہ کاسب، مکتسب اور مرتکب ہے۔ ارشاد

---

[1] الصّٰفّٰت (۳۷ : ۹۶)

Marfat.com

فرمایا گیا:

بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّاَحَاطَتْ بِہٖ خَطِیْٓئَتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ [1]

ہاں جو بُرے کام کرے اور اس کے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔

لَہَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْہَا مَا اکْتَسَبَتْ [2]

اگر اس نے نیک کام کیے (یعنی اعمال کمائے) تو اسی کو فائدہ پہنچے گا اور اگر بُرے کام کیے (یعنی اعمال کمائے) تو اسی کو اس کا نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

جس طرح کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ بڑی ہے یا چھوٹی، انسان ہے یا حیوان، جن ہے یا فرشتہ، سیارہ ہے ستارہ، زمین ہے یا کوئی اور خطہ، سمندر ہے یا خشکی جمادات میں سے ہے یا حیوانات سے، مادہ ہے یا توانائی، کوئی خارجی وجود ہے یا ذہنی تصوّر، کوئی عملی حقیقت ہے یا فکری تخلیق، ہر چیز اپنے وجود میں خدا تعالیٰ کی صفت خلّاقیت و صنّاعی کی آئینہ دار اور اپنے ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی محتاج ہے اور اس کا خالق صرف اللہ ہے، اسی طرح انسان جو بھی عمل کرتا ہے، مثلاً اس کا گفتگو کرنا، اس کا آرام کرنا، اس کا کھیلنا کودنا، اس کا حوائج ضروریہ کی تکمیل کرنا، اس کا اُٹھنا بیٹھنا، اس کا چلنا پھرنا، آنا جانا، اس کا ہر کام اپنے وجود میں ایک فعل اور عمل ہے۔ اور ہر فعل ایک وجود ہونے کے

---

[1] البقرہ (۲: ۸۱)

[2] البقرہ (۲: ۲۸۶)

Marfat.com

اعتبار سے خدائی مخلوق ہے۔ کیونکہ فعل بھی انسان ہی کی طرح انفس و آفاق پر مشتمل اسی کائنات کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اکتساب کی ذمہ داری کے اعتبار سے اس فعل کو انسان کا فعل کہیں گے خدا کا نہیں۔ چنانچہ اس کی نسبت بہر حال انسان کی طرف ہی ہوگی، جیسے کہ مذکورہ بالا آیت میں الفاظ "وَمَا تَعْمَلُوْنَ" (اور جو تم عمل کرتے ہو) میں فعل کے انجام دینے کی ذمہ داری انسان پر عاید کی گئی ہے۔ گویا عمل ایک ہے، مگر اس کے پہلو دو ہیں، ایک پہلو کے اعتبار سے وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور دوسرے کے اعتبار سے انسان کا مکسوب۔ اس تصور کو سمجھنے کے لیے بچے کے تخلیق کے عمل ہی کو لیجئے: ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ محض مرد و عورت کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کی پیدائش کے لیے "امر ایزدی" کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے، کتنے ہی جوڑے ایسے ہیں کہ برسہا برس گزر جانے کے باوجود ان کے دامن بچوں کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کی تخلیق میں بنیادی عمل دخل "رشتۂ ازدواج" کا ہی ہوتا ہے۔ گویا کسبًا تو بچے کو وجود والدین کے دم قدم سے ملا، لیکن خلقًا یہ خدا تعالیٰ کی عطا کا رہین منت ہے۔ [1]

---

[1] اسی لیے قرآن کریم میں ایسے "جوڑوں" کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے کہ جو اولاد کی نعمت کو اپنی طرف یا کسی اور سفلی ذریعے کی طرف منسوب کرتے ہیں، ارشاد ہے:

فَلَمَّا آتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ	پس جب خدا تعالیٰ نے ان کو صحیح و سالم بچہ عطا کر دیا تو وہ اس کے خلق میں شریک ٹھہرانے لگے، حالانکہ اللہ تعالیٰ شریک کیے
(الاعراف، ۷: ۱۹۰)	جانے سے بلند و بالا ہے۔

حالانکہ اولاد کی نعمت عطا کرنا، یا اس سے محروم رکھنا اور اسی طرح دیگر انسانی حاجات کی تکمیل کرنا خالصتًہ اللہ رب العزت کا فعل ہے۔

Marfat.com

اسی طرح ہر انسانی عمل اپنے کسب میں انسانی ہاتھوں کا محتاج ہے، مگر اپنے وجود اور اپنی ہستی میں خدا تعالیٰ کے حکم "کن" کا دست نگر ہے۔

کیا مخلوق ہونے کے لیے دیکھا جانا ضروری ہے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسانی عمل دیکھنے میں تو انسان ہی کی تخلیق محسوس ہوتا ہے اسے انسانی کسب سے الگ ایک مخلوق کس طرح مان لیا جائے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر مخلوق کے لیے الگ طور قابلِ دید ہونا بھی ضروری ہے؟ یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق، بحیثیت ایک مخلوق کے، ہر ایک کے لیے مرئی نہیں ہوا کرتی۔ قرآنِ کریم میں قسم کھا کر یہ کہا گیا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ [1]

قسم ہے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور جن کو تم نہیں دیکھ سکتے۔

سائنس بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ دنیا میں بہت سی اشیاء موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آسکتیں، مثلاً اس کمرے میں ٹنوں کے حساب سے ہوا موجود ہے۔ مگر یہ ہوا انسانی آنکھ یا خوردبین کے ذریعے نہیں دیکھی جاسکتی۔ اسی طرح انسانی آواز مخلوق ہے، اگر تھوڑی دیر کے لیے کان بند کر لیے جائیں تو آنکھوں اور دوسرے حواس کی مدد سے اس کا ادراک نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی چیز کا مرئی ہونا (یعنی دکھائی دینا) اس وقت ضروری ہے، جبکہ اس کا طبعی وجود کثیف ہو اور دوم یہ کہ اس کو محسوس اور معلوم کرنے والی خاص حس اپنی صحیح حالت میں ہو۔ جو اشیاء غیر حسی ہوں یا ان کو محسوس کرنے والے حواس میں نقص ہو تو ایسی صورت میں کوئی چیز خارج میں پائے جانے کے باوجود محسوس نہیں کی جاسکتی۔

خود انسان حسی اور کثیف وجود رکھتا ہے اس لیے اس کا موجود ہونا آنکھوں سے

Marfat.com

دیکھا جا سکتا ہے، مگر اس کا عمل بذاتِ خود ایک لطیف وجود ہے، لہذا اس کے اثرات ونتائج کا تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب میں استعمال ہونے والے اعضاء کو تو ہم دیکھ سکتے ہیں مگر ان اعضاء و جوارح اور اثرات و نتائج سے قطع نظر فی نفسہٖ عمل کے وجود کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ رحم اور محبت حقیقت میں اپنا اپنا وجود تو رکھتے ہیں۔ لیکن جب تک انہیں آپ ماں کی ماتتا، باپ کی شفقت اور دوست کے اخلاص کے روپ میں نہ دیکھیں، ان کا وجود از خود دکھائی نہیں دے سکتا۔ یعنی اُنہیں دیکھنے کے لیے کسی رحم دل شخص کے عمل اور کسی محبت کرنے والے کے التفات کا سامنے ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ انسانی یا حیوانی ظرف نہ ہوں تو رحم، غصہ، محبت، نفرت، بخل، حرص اور تکبر وغیرہ جیسے اوصاف دکھائی نہیں دے سکتے۔ گویا اوصاف کے وجود کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان کے ظہور کے لیے کسی مظہر کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے پائے جانے کا انکار ممکن نہیں مگر انہیں سمجھنے کے لیے کوئی ذریعہ چاہیے۔ جو شے خود ایک لطیف یا غیر حسی وجود رکھتی ہو اسے معلوم کرنے کے لیے اس کا اتصال کسی حسی اور کثیف حقیقت سے ہونا ضروری ہے۔ جیسے جان جسم کے بغیر دکھائی نہیں دیتی، اسی طرح عمل کسی عامل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔ لہذا عامل کو، عمل کا خالق نہیں بلکہ اس کا کاسب تصوّر کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے عمل کو فی نفسہٖ پیدا نہیں کیا بلکہ اسے کر کے دکھایا ہے۔

جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے

قرآن کریم یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح کر دیتا ہے کہ اگرچہ ہر انسانی عمل تخلیق کے اعتبار سے تو مخلوقِ خدا ہے، لیکن صدور اور ظہور کے اعتبار سے انسان کا کسب ہے اور کسب و ارتکاب چونکہ آزادانہ ہے

Marfat.com

اس لیے وہی اپنے عمل کے انجام کا ذمہ دار ہے کیونکہ جزا و سزا کا تعلق کسب اعمال سے ہوتا ہے نہ کہ خلق اعمال سے۔ اسی بنا پر سورۃ الملک میں انسانی تخلیق کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا [1]

اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔

موت و حیات بھی اپنی تخلیق کے اعتبار سے، خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں، مگر اپنے واقع ہونے کی مناسبت سے، ان کا وجود کسی نہ کسی سبب کا رہینِ منت ہے۔ اسی طرح اعمال بھی تخلیق کے اعتبار سے مخلوقِ باری تعالیٰ ہیں، لیکن ان کا وجود میں آنا انسان کا رہینِ منت ہے۔ زندگی، اعمال کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور موت عالم آخرت میں ان کے نتائج کے مشاہدے کا۔ دنیا میں موت و حیات کی تخلیق کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ یہ دیکھا جا سکے کہ کون اچھے اعمال اپناتا ہے اور کون برے۔ اسی تصور کو قرآن کریم دوسری جگہ واضح کرتا ہے:

وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ [2]

اور جو مصیبت تم پر نازل ہوتی ہے سو وہ تمہارے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

---

[1] الملک (۶۷: ۲)

[2] الشوریٰ (۴۲: ۳۰)

ایک دوسری جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

(باقی آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

یعنی انسان دنیا میں جن نقصانات، مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے وہ سب اس کے اپنے اعمال کے نتائج و ثمرات ہیں۔

یہ تو انفرادی شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی مصیبتوں کا ذکر تھا، دوسری جگہ اجتماعی زندگی کی مشکلات کو بھی لوگوں کے اپنے اعمال کے نتائج قرار دیا گیا۔ ارشاد فرمایا گیا:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا[۱]

خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے اعمال کے سبب سے فساد پھیل گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا بدلہ چکھائے۔

اس دنیا میں نیکی یا بدی کا خلقی وجود گو من جانب اللہ ہے، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے کسب کی ذمہ داری ان کے خالق پر عائد نہیں ہوتی

(از صفحۂ گزشتہ)

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ

تمہیں جو اچھائی پہنچتی ہے وہ خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔

(النساء، ۴: ۷۹)

گویا نعمت کے حصول میں تو خدا تعالیٰ کا لطف و کرم شامل ہوتا ہے، مگر مصیبت کے وقوع میں خالصۃً انسان کی اپنی غلطیوں کا عمل دخل ہوتا ہے، اگرچہ ہر اچھائی اور برائی کی خلقت ہوتی من جانب اللہ ہے۔ لیکن ادب بندگی یہی ہے جس کی اوپر تعلیم دی جا رہی ہے۔

[۱] الروم (۳۰: ۴۱)

Marfat.com

اس لیے کہ اللہ کا فعل مطلقاً خلق ہے نہ کہ کسب وارتکاب۔ خلق کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کا شعور اور اختیار بخشا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان عمل کے کس پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ پھر ہر عمل کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہدایت ربانی کے ذریعے اس عمل کے نتائج وعواقب سے بھی انسان کو باخبر کر دیا جاتا ہے ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے فتنہ وشر اور بدی کا راستہ اختیار کرے تو وہ اپنے اعمال کی جزا و سزا کا ذمہ دار کیوں نہ ٹھہرایا جائے؟۔

ایک غلط فہمی اور اس کا جواب

اس تفصیل سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انسان سے اگر مؤاخذہ ہوتا ہے تو اس لیے کہ وہ بقائمی ہوش وحواس، اپنی مرضی اور اپنے ارادہ واختیار سے کسی عمل کا ارتکاب کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے سود ہے کہ جب ہر عمل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو انسان کو کیوں لائق تعزیر گردانا جاتا ہے؟ انسان کو بلا وجہ نہیں پکڑا جاتا، اس کی گرفت اس کے سبب واختیار کا نتیجہ ہوتی ہے۔[۱]

---

[۱] یہی غلط فہمی مشرکین مکہ میں بھی موجود تھی، چنانچہ وہ کہا کرتے تھے:

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (الانعام۔ ۶: ۱۴۸)

اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے اور کسی چیز کو اپنی مرضی سے حرام نہ ٹھہرا سکتے۔

مگر اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ محض برائی کا وجود اس کے جائز ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا، برائی اور اچھائی تو ازل سے موجود ہے۔ اور اسی غرض کے لیے ہے کہ اکتساب کے حوالے سے لوگوں میں اچھے اور برے کا امتیاز پیدا ہو سکے۔

Marfat.com

خدائی فعل "خلق" کی حقیقت تو فقط اتنی ہے کہ اس نے اپنی دوسری بہت سی مخلوقات کی طرح انسانی اعمال کو بھی تخلیق کیا اور انسان کو بھی پیدا کر کے اسے اختیار دے دیا کہ وہ جس قسم کے اعمال چاہے اپنے لیے منتخب کرے۔ اس لیے انسان اپنے اختیار سے اعمال کا جو چناؤ کرے گا اور جس قسم کے اعمال کو اپنے کسب و ارتکاب کے لیے مختص کرے گا وہ اسی طرح کی جزا یا سزا کا مستوجب ہوگا۔ اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ذمہ داریوں کا نظام بھی کسب پر ہی چل رہا ہے نہ کہ خلق پر۔

خدا تعالیٰ نے ہر چیز کی ضد پیدا کی ہے، دن کے ساتھ رات۔ آرام کے ساتھ بے آرامی، راحت کے ساتھ تکلیف، خیر کے ساتھ شر، حق کے ساتھ باطل، صدق کے ساتھ کذب، رحم کے ساتھ ظلم، نیکی کے ساتھ بدی اور جنت کے ساتھ دوزخ۔ اب محض ایک چیز کا موجود ہونا اس کے اپنانے کی ذمہ داری سے برأت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا تعالیٰ نے سائے کے ساتھ دھوپ کو پیدا کیا تو اس لیے نہیں کہ کوئی سخت گرمی میں دھوپ میں جا بیٹھے اور کسی تکلیف کے واقع ہو جانے کے بعد، وہ یہ کہے کہ میری تکلیف کا باعث خدا تعالیٰ کا دھوپ کو پیدا کرنا ہے؟ اس صورت میں اس کے اس قول پر کون شخص یقین کرے گا؟ اُلٹا ہر کوئی اسی کو کہے گا کہ خدا تعالیٰ نے دھوپ اور سائے کی تخلیق تو اس لیے فرمائی تھی کہ انسان کو گرمیوں میں سائے اور سردیوں میں دھوپ دونوں کی راحت میسّر آسکے۔ دھوپ کی تخلیق کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کوئی شخص بلا مقصد برہنہ سر یا برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں چلے پھرے اور خواہ مخواہ کسی تکلیف سے دوچار ہو جائے اگر خود انسان نے اس کا استعمال غلط طریقے پر کیا تو اس سے تخلیق کا کیا قصور ثابت ہوا۔

Marfat.com

(ب) انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ

مسئلہ تقدیر کے ضمن میں ایک مسئلہ انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا بھی ہے کہ آیا انسان کو مکمل طور پر مختار سمجھا جائے یا مجبور محض۔ لہ

اس ضمن میں حقیقت بالکل واضح ہے کہ انسان نہ تو کلیتہً ایسا مختار ہے کہ اس پر کوئی قدغن ہی نہ ہو اور نہ ہی ایسا مجبور کہ وہ خود کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے سکے۔ انسان کی حقیقی حیثیت "بین القدر والجبر" ہے جو ایک معتدل کیفیت سے عبارت ہے۔ فی الواقع اسے اختیار وارادے کی مکمل آزادی ہے لیکن اس کی آزادی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے اس مسئلے کی بابت استفسار کیا تو آپ نے سائل سے فرمایا کہ اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤ، اس نے اٹھالی، پھر فرمایا کہ اب دوسری بھی اٹھاؤ، اس نے عرض کیا: یہ تو ناممکن ہے، فرمایا کہ پہلی حد انسان کے اختیار کی تھی اور دوسری حد اس کی مجبوری کی ہے۔ یعنی اس کا اپنا توازن اسے اختیار کی ایک خاص حد سے آگے گزرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

لہ تاریخ اسلام میں ایسے متعدد فرقوں کا ذکر ملتا ہے، جن میں سے بعض کا یہ خیال تھا کہ انسان مکمل طور پر مجبور ہے، اور وہ ایک تنکے کو بھی اپنی مرضی سے ہلانے کا اختیار نہیں رکھتا، جب کہ ان کے بالمقابل بعض ایسے لوگ بھی تھے جو انسان کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار قرار دیتے تھے۔ حالانکہ قرآن وسنت کی روشنی میں جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ "بین القدر والجبر" ہے۔

Marfat.com

بین القدر والجبر کا مفہوم

بین القدر والجبر کے تصور کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان مراحل کو سمجھا جائے جن سے گزر کر کوئی عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

۱۔ فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ

سب سے پہلے انسان کے دل میں کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ایک کش مکش پیدا ہوتی ہے یعنی اسکا فرض اور اسکی آرزو بیک وقت اس کے سامنے آتے ہیں اور پھر وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ یہ احساس صرف شعوری اور اختیاری اعمال سے متعلق ہوتا ہے۔ جو اعمال غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پہ صادر ہوتے ہیں۔ اور جنہیں اضطراری اعمال کہا جاتا ہے، ان کا ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ایسے افعال پہ گرفت ہوتی ہے۔ عملاً اس کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر کوئی شخص آپ کی آنکھ میں سوئی چبھونا چاہے اور اس کے خوف سے آپ کی پلکیں اضطراری طور پہ بند ہو جائیں۔ تو یہ ایک اضطراری فعل ہے اور ایسا فعل قابل مواخذہ نہیں، لیکن اگر یہی پلکیں بدنیتی سے کسی فعل ناحق کے لیے حرکت کریں، تو یہ اختیاری اور ارادی فعل ہوگا اور اس پہ گرفت ہوگی۔ حرکت ایک ہی ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔

بہر حال اولاً ذہن میں ایک کشمکش سی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کا مال دیکھ کر اسے ناجائز طور پہ ہتھیانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور دوسری طرف خدا کے حکم نہی کا بھی خیال آگیا۔ نتیجۃً دونوں خیالات ابھرے اور ذہن میں ایک کشمکش سی شروع ہو گئی۔ اسی لیے اس ابتدائی سوچ کے مرحلے کو "کشمکش کا مرحلہ" کہا

Marfat.com

گیا ہے۔

۲۔ غور و خوض کا مرحلہ

اس کے بعد غور و خوض کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، ذہن دونوں چیزوں کے ممکنہ نتائج یعنی فوائد و نقصانات کا جائزہ لیتا ہے، وہ خلائی حکم پر بھی نظر ڈالتا ہے اور دنیوی منافع پر بھی اس طرح فعل کا ذہنی وجود کش مکش کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر غور و خوض کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ کشمکش اور غور و خوض کے دونوں مراحل پر انسانی ذہن کسی قسم کی مجبوری یا پابندی (COERSION & COMPULSION) کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں عمل ذہن اور شعور کی سطح پر آزادانہ طریقے سے واقع ہوتے ہیں۔

۳۔ انتخاب نیت کا مرحلہ

اس کے بعد اگلا مرحلہ ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے یہاں پہنچ کر انسان دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ اور پوری سوچ بچار کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اچھائی کا مرتکب ہو یا برائی کا، صحیح راستے پر گامزن ہو یا غلط پر اور فرض کی پیروی کرے یا خواہش نفس کی، اسی ذہنی فیصلے کو "انتخاب نیت" کہتے ہیں۔ یہاں تک انسان اپنے ذہنی عمل سے گزرتا ہے، آپ ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتائیے کہ کیا ان تینوں مرحلوں میں کسی اعلیٰ قوت نے انسان کو مجبور کیا ؟ اسے خواہش کو اختیار کرنے یا فرض پورا کرنے کے درمیان غور و خوض پر کسی طرف سے خارجی دباؤ پڑا ؟ ہرگز نہیں، یہ تو خالصتاً ذہنی قلبی اور داخلی عمل تھا۔ آپ نے مسئلے کے ہر پہلو کو اچھی طرح سے دیکھا اور پرکھا، ایک کش مکش اور ذہنی تصادم کے مرحلے سے گزر کر سوچ بچار کے نتیجے میں ذہنی فیصلے کے مرحلے تک پہنچے۔ یہاں تک عمل مکمل طور پر آزاد ہے۔

Marfat.com

۴۔ عزم و ارادے کا مرحلہ

اس کے بعد عزم و ارادے کا مرحلہ آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر آپ اپنے ذہنی فیصلے یعنی نیت کو واقعہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ذہنی طور پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں یہاں نیت اور ارادے میں فرق پیشِ نظر رہے کہ نیت، ذہنی سطح پر کسی چیز کو منتخب کرنے اور ارادہ اس نیت کی تکمیل پر ذہن کے کمربستہ ہو جانے کا نام ہے۔ گویا ارادہ، نیت کے انتخاب سے جنم لیتا ہے، نیت مقدم ہوتی ہے اور ارادہ موٴخر، لہذا ارادہ ہمیشہ نیت کے تابع ہوتا ہے۔

۵۔ تعمیل کا مرحلہ

اس کے بعد پانچواں مرحلہ ارادے کی تعمیل کا آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان عملی قدم اُٹھاتا ہے۔ عملی تدبیر کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ نے بالفرض کسی دشمن کو مارنے کا ارادہ کر لیا ہے تو آپ کے عمل کا پانچواں مرحلہ کسی ہتھیار کے ساتھ اس پر حملہ کرنا ہوگا۔ لہذا تعمیل ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتی ہے۔

۶۔ نتیجۂ عمل کا مرحلہ

جب ارادے کی تکمیل ہو چکی تو اب اس عمل کے نتیجے کے برآمد ہونے کا مرحلہ آتا ہے۔ مثلاً ہتھیار استعمال کرنے سے وہ شخص مر جائے یا زخمی ہو جائے گا۔ یہ نتیجہ آپ کے مرحلۂ تعمیل کے تابع ہے جبکہ مرحلۂ تعمیل خود عزم و ارادے کے تابع ہے۔ اور انتخابِ نیت کا مرحلہ خود کسی شے کے تابع نہیں، کیونکہ وہ محض غور و خوض کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

یہ ہیں چھ مراحل جن سے کوئی عمل گزر کر اپنے نتیجے کے مرحلے تک پہنچتا ہے' بتائیے ان مراحل میں سے وہ کون سا مرحلہ ہے جہاں آپ پر کوئی خارجی دباؤ موجود تھا؟ ذہنی کش مکش سے لے کر نتیجۂ عمل تک آپ خود بخود آگے بڑھتے چلے گئے

Marfat.com

اسی اقدام کا نام "کسبِ عمل" ہے۔

بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل کے چھ مرحلے دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ ذہنی کش مکش سے شروع ہو کر انتخابِ نیت کا تھا، جبکہ دوسرا ارادے سے شروع ہو کر نتیجۂ عمل تک محیط تھا۔ ان میں سے پہلے حصے میں آدمی خود مختار اور آزاد ہوتا ہے، لیکن دوسرے حصے میں خود اپنے انتخابِ نیت کا پابند، لیکن یہ مجبوری کیسی؟ خود اپنی سوچ اور نیت کی مجبوری۔ اسی لیے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انما الاعمال بالنیات[1] — اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔

مزید فرمایا:

ان اللّٰہ لا ینظر الیٰ صورکم و اموالکم ولکن ینظر الیٰ قلوبکم و اعمالکم[2] — بلاشبہ خدا تعالیٰ تمہاری شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے اعمال اور دلوں کو دیکھتے ہیں۔

گویا خدا تعالیٰ کے ہاں عمل کی ذمہ داری کا فیصلہ انسان کی نیت اور اس کے بجائے ارادے کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسی نیت ہو گی ویسی ہی جزا اُسے عمل ہو گی، اسی بنا پر قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ — اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی نیت سے اپنے گھر بار سے ہجرت کیلئے نکلے، پھر راستے میں اسے موت آ لے

---

[1] البخاری، حدیث اول۔

[2] المسلم جلد ۲، ص ۳۱۷۔

Marfat.com

الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَى اللّٰهِ [1] تو اللہ تعالیٰ پر اس کا اجر ثابت ہو گیا۔ (یعنی اسے پورے عمل کی جزا عطا کی جائے گی)

کیونکہ خدا کی ذات یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا یہ عمل اپنے انجام تک پہنچا یا نہیں؟ بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اکتسابِ عمل میں اس کی نیت کیا تھی۔

قرآن و حدیث میں اسی بنا پر نیت کے اخلاص اور اس کی درستگی پر زور دیا گیا ہے اور اسی پر ہی تمام فوائد و ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیت سے ہی ایک شخص مخلص مسلمان اور نیت سے ہی ایک شخص منافق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ زبان اور ظاہر کی حد تک قول دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ انسان اچھائی یا برائی کے ارتکاب کے لیے جب اپنی نیت کا انتخاب کرتا ہے اس وقت وہ مکمل طور پر باشعور اور با اختیار ہوتا ہے۔ اسے دونوں راستوں میں سے کسی بھی راہ کو اپنانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مرحلہ خالصتاً اس کے اپنے ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ اسی آزادی کی بنا پر وہ "شخص" "با اختیار" تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اسی اختیار کے باعث اس سے جواب طلبی اور مؤاخذہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بقیہ تمام مراحلِ عمل اس کی آزادانہ منتخب شدہ نیت کے تابع ہوتے ہیں۔ رہا خارجی مجبوریوں اور حالات کی پریشانیوں کا دباؤ، تو اس کا اثر نیت کے مرحلے پر نہیں بلکہ عزم و ارادے کے مرحلے (چوتھے مرحلے) پر ہوتا ہے۔ کیونکہ عزم و ارادہ اصولی طور پر تو انتخابِ نیت کے تابع ہوتا ہے لیکن کسی مجبوری کے باعث یہ ارادہ، نیت (ذہنی طلب اور قلبی فیصلے) کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی دل تو کچھ اور چاہتا ہو لیکن کسی مجبوری کے تحت ارادہ کسی اور کام

---

[1] النساء (۴: ۱۰۰)

Marfat.com

کا کرنا پڑے۔ گویا ذہن کسی کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو۔ اگر ایسی صورتِ حال ہو تو یہ فعل "جبر و اکراہ" کہلاتا ہے۔ اور جبر و اکراہ حالتِ اضطرار (EXTREME NECESSITY) تک پہنچ جائے تو انسان سے اخلاقی و قانونی ذمہ داری اور جوابدہی مرتفع ہو جاتی ہے۔ خدا کی ذات صحیح معنوں میں مجبور شخص کو سزا نہیں دیتی۔ لہذا یہ حالت "استثنیٰ" (EXCEMPTION) کی ہو گئی مگر اصول و کلیہ وہی رہا کہ ہر شخص اپنے آزادانہ انتخاب نیت کے باعث پابند جزا و سزا ہے۔

اس موضوع پر عقائدِ اسلامی کی کتاب شرح "عقائد النسفی" میں بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس بحث کے چند ضروری مقامات حسب ذیل ہیں علامہ تفتازانی فرماتے ہیں:

وللعباد افعال اختیاریۃ یثابون بھا ان کانت طاعۃ ویعاقبون علیھا ان کانت معصیۃ لا کما زعمت الجبریۃ انہ لا فعل للعبد اصلاً وان حرکاتہ بمنزلۃ حرکات الجمادات لا قدرۃ علیھا ولا قصد ولا اختیار و ھذا باطل لانا نفرق بالضرورۃ بین حرکۃ	اور بندوں کو اپنے افعال کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ افعال طاعت پر مبنی ہوں تو ان کا ثواب ملتا ہے اور اگر معصیت ہوں تو ان پر عذاب دیا جاتا ہے۔ فرقہ جبریہ کا یہ کہنا غلط ہے کہ بندے کو اپنے افعال کا کچھ اختیار ہی نہیں اس کی حرکات و سکنات تو محض جمادات کی حرکات کے مشابہ ہیں، جنہیں اپنے افعال پر نہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ قصد و اختیار، جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بندے کو اپنے افعال کا اختیار ہی نہیں تو اس کا

Marfat.com

البطش وحركة الارتعاش
ونعلم ان الاول باختياره
دون الثاني ولانه لو لم
يكن للعبد فعل اصلاً
لما صح تكليفه، ولا
يترتب استحقاق الثواب
والعقاب على افعاله ولا
اسناد الافعال التي تقتضي
سابقية القصد والاختيار
اليه على سبيل الحقيقة
مثل صلّى وكتب وصام
بخلاف مثل طال الغلام و
اسود لونه - ان الله
خالق والعبد كاسب و
تحقيقه ان صرف العبد
قدرته وارادته الى
الفعل كسب وايجاد الله
تعالى الفعل عقيب ذالك
خلق والمقدور الواحد
داخل تحت القدرتين
لكن بجهتين مختلفتين

احکامِ الٰہی کا مکلف ٹھہرایا جانا اور اس کا
ثواب و عذاب کا مستحق ہونا، نیز افعال کا
اس کی طرف منسوب ہونا کس طرح درست
ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان افعال میں حرکت سے
پہلے قصد اور اختیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ
کہا جاتا ہے کہ اس نے نماز پڑھی، اس نے
لکھا جو اشیاء اس کی قدرت سے باہر ہیں
ان کے متعلق انداز مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً
کہا جاتا ہے کہ اس نے روزہ رکھا جبکہ
لڑکا بڑا ہو گیا یا اس کا چہرہ سیاہ پڑ
گیا، افعال کی نسبت بندے کی
طرف نہیں کی جاتی۔ بلاشبہ حق تعالیٰ
خالق ہیں اور بندہ اعمال کا کاسب ہے
اور تحقیق اس کی اس طرح ہے کہ بندہ
اس کام میں اپنی قدرت اور صلاحیت
صرف کرتا ہے، لہٰذا یہ کسب ہے اور
خدا تعالیٰ اس کی کوشش کے بعد اس فعل
کو موجود کر دیتا ہے یہ خلق ہے، ایک
ہی فعل دو قدرتوں سے وجود میں آتا ہے
لیکن دو مختلف جہتوں سے فعل اپنے وجود
کے اعتبار سے خدا کا فعل ہے۔ مگر

Marfat.com

فالفعل مقدور اللہ تعالیٰ بجهة الایجاد و مقدور العبد بجهة الکسب کا لارض تکون ملکا للہ تعالیٰ بجهة التخلیق وللعباد بجهة ثبوت التصرف [1]

اپنے کسب کے اعتبار سے بندے کا۔ جس طرح زمین تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور ثبوتِ تصرف کے اعتبار سے بندے اس کے مالک ہیں۔

علامہ تفتازانی کی اس بحث سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اگرچہ ہر چیز خدا تعالیٰ کے فعل خلق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ لیکن عملی طور پر بندہ اپنے افعال میں کسب کا اختیار رکھتا ہے اور اسی اختیار کی بنیاد پر اپنے ہر عمل کا ذمہ دار اور اس پر جزا و سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] شرح عقائد النسفی، ص ۶۴ — ۶۶ مطبع علیمی لاہور

Marfat.com

باب ششم

جبر و قدر اور تصوّرِ عدل

Marfat.com

Marfat.com

○

انسان کے مجبور یا مختار ہونے، نیز انسان کے "اپنے افعال کے کاسب ہونے" پر گذشتہ باب میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے، اس تمام بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے۔ مگر خالق خداوند تعالیٰ کی ذات ہے۔ نیز یہ کہ انسان کو کسبِ اعمال میں اختیار اور ارادے کی آزادی بھی حاصل ہے۔

اس بحث سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ ربّ العزّت کی طرف سے اختیار کی جو دولت عطا کی گئی ہے، اس کا پس منظر اور سبب کیا ہے۔ انسان کو آخر مختار کیوں بنایا گیا؟ قرآن مجید میں اس سلسلے میں ایک جامع ارشاد ہے:۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ[1]	تم جو چاہو کرتے رہو، وہ (اللہ) تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اس آیۂ مبارکہ کے تین الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو مسئلۂ تقدیر کے تمام ممکنہ پہلو سامنے آجاتے ہیں، اور اس بارے میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اِعْمَلُوْا: تم عمل کرو: لفظ اِعْمَلُوْا میں عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں

---

[1] حٰم السجدہ (۴۱: ۴۰)

Marfat.com

نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے افعال کے کسب میں مختار ہے۔ اچھے یا بُرے عمل کرنے کی آزادی رکھتا ہے۔ وہ جس قسم کے اعمال چاہے کرے اور جس قسم کے اعمال سے چاہے، احتراز کرے۔ اِس پر قدرت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔

۲۔ مَاشِئْتُمْ : (جو تم چاہو) "اِعْمَلُوْا" کے لفظ سے عملی آزادی اور خود مختاری کا اظہار ہوتا ہے جب کہ مَاشِئْتُمْ سے فکری، ذہنی اور قلبی آزادی کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی پسند اور نیت کے انتخاب میں بھی جس قسم کی روش چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ نہ سوچ میں پابند اور مقیّد ہے اور نہ عمل و کردار میں۔

۳۔ اِنَّہٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ : اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جملہ اعمال و افعال کو ذاتِ باری دیکھ رہی ہے تاکہ اِسے جزا و سزا بھی دی جا سکے۔ اِسے اگرچہ نظری، فکری اور عملی اعتبار سے آزادی اور خود مختاری دی گئی ہے، مگر اس آزادی کے عطا کیے جانے کا مقصد اسے شترِ بے مہار کر دینا نہیں، بلکہ اِسے یہ احساس دلانا ہے کہ ہر عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا جائے گا اور اُسے اپنی صوابدید کے مطابق کیے ہوئے اعمال پر بارگاہِ ایزدی میں جواب دِہ ہونا ہوگا۔ قرآنِ حکیم کے مطالعے کی روشنی میں انسان کو آزادی دیئے جانے کے ۱۲ مقاصد بیان کیے جا سکتے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کا تصوّرِ عدل

خداوند تعالیٰ کسی معاملے میں بھی اپنی کسی مخلوق پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کا ہر فعل عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے اس کارخانۂ قدرت کو قانونِ عدل ہی پر قائم رکھا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف خود عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے بلکہ اپنے بندوں کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کریں۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں ارشاد ہے:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ — اور بعض لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات

Marfat.com

قَوۡمٍ عَلٰۤی اَنۡ لَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۟ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ۫ [1]	پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ (ان سے بھی) انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَ اِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ ؕ [2]	اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

عدل کی تعریف علماءِ لغت نے اِن الفاظ میں کی ہے:

وَضۡعُ الشَّیۡئِ عَلٰی مَحَلِّهٖ ۔ [3]	کسی چیز کو اس کے صحیح ٹھکانے پر رکھنا۔

دوسرے لفظوں میں حقدار کو حق دینا مستحق کو اس کا جائز مقام دینا، عدل ہے، جب کہ اس کے برعکس روش اختیار کرنا ظلم و جور ہے۔ قرآنِ کریم ہر حال اور ہر صورت میں عدل کرنے کی تعلیم دیتا ہے، خواہ معاملہ اپنے کسی قریب ترین عزیز ہستی کہ ماں باپ کا ہو۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَ لَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ۚ اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰی بِهِمَا ۟ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰۤی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ [4]	اے اہلِ ایمان! انصاف پر قائم رہو، اور خدا کے لیے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ کوئی امیر ہے یا فقیر، خدا ان کا خیر خواہ ہے۔ تو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کے عدل کو نہ چھوڑ دو۔

---

[1] المائدہ (۵ : ۸)

[2] النساء (۴ : ۵۸)

[3] امام راغب الاصفہانی: مفردات القرآن، بذیل مادہ عدل۔

[4] النساء (۴ : ۱۳۵)

Marfat.com

دوسرے مقام پر عدل و انصاف کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی[1] — خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔

عدل کا مقام رفیع — احسان

آیۂ کریمہ میں عدل کے ساتھ ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عدل کا مفہوم تو سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے جب کہ احسان کا مقام عدل کے مقام سے بھی بلند ہے۔ حق دار کو اس کا حق دینا عدل ہے۔ اپنا حق کم لینا اور دوسرے کا حق زیادہ دینا احسان ہے۔ گویا احسان جود و فضل اور لطف و کرم کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس طرح نیکی کی زندگی کے دو مدارج بیان کیے گئے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو۔ نہ کسی کا حق کھاؤ، نہ کسی کو اپنا حق کھانے دو — لیکن یہ درجہ بے حد احتیاط کا متقاضی ہے۔ اگر اس درجے سے ذرا بھی قدم لڑکھڑا جائے، یعنی معمولی سا بھی افراط و تفریط ہو جائے تو انسان درجۂ ظلم پر پہنچ جاتا ہے، اس لیے نیکی اور تقویٰ کے نقطۂ نظر سے ایک بلند تر درجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان خدا تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے:

ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ[2] — بیشک خدا احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

"یہ مقامِ احسان" ہے، اس لیے فرمایا: کہ اگر ہو سکے تو عدل کے اونچے درجے پر فائز ہو۔

---

[1] النحل (۱۶: ۹۰)

[2] البقرۃ (۲: ۱۹۵)

Marfat.com

حق دار کو اس کے حق سے بھی زیادہ دو۔ اور دوسروں کی خاطر اپنا حق لینا چھوڑ دو تاکہ اگر کبھی مقامِ احسان سے اُترنا بھی چاہو تو مقامِ عدل پر تو فائز رہ سکو۔

جو ذات اپنے بندوں کو ہر حال نظامِ عدل و احسان اپنانے کی تلقین کرے، جس کا اپنے بندوں سے مطالبہ یہ ہو کہ جب بھی اپنے یا کسی دوسرے کے متعلق فیصلے کا موقع آئے، تو عدل و انصاف کے اُصولوں کے مطابق فیصلہ کرو۔ وہ ذات جب خود مسند عدالت پر متمکن ہوگی تو کیا اپنے بندوں کے متعلق عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھے گی؟ وہ ذات تو سراسر عدل و انصاف ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اللہ رب العزت کے انصاف کا ذکر کیا گیا ہے، سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ[1]

اور ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو قائم کریں گے؛ تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو اس کو لا حاضر کریں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ[2]

اور ہر نفس اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر "روزِ محشر" کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق فردِ عمل دی جائے گی۔ مجرمین کو بائیں ہاتھ میں اور نیکوکاروں کو سیدھے ہاتھ میں۔

اِس موقع پر ارشاد ہوگا:

---

[1] الانبیاء (۲۱: ۴۷)

[2] آلِ عمران (۳: ۲۵)

Marfat.com

ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ[1]

(اے سرکش) یہ اس (کفر) کی سزا ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا اور خدا اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

خداوند تعالیٰ کی احسان پسندی

اور یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کے بجائے جہاں تک ہو سکے گا، لطف و کرم اور فضل و احسان کا برتاؤ فرمائے گا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ[2]

جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا، اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا، اس کو ویسی سزا ملے گی اور اس پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر اس احسان پسندی کا یوں ذکر کیا گیا:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ[3]

جو شخص نیکی لے کر آئے گا، اس کے لیے اُس جیسی دس نیکیاں ہیں، اور جو برائی لائے گا تو جن لوگوں نے برے کام کیے، ان کو بدلہ بھی اُسی طرح ملے گا جس طرح کے وہ کام کرتے تھے۔

جس خدا کا اپنے بندوں سے سلوک اور مہربانی کا یہ عالم ہو، اس کے متعلق بھلا یہ کیونکر

---

[1] الحج (۲۲ : ۱۰)

[2] الانعام (۶ : ۱۶۰)

[3] القصص (۲۸ : ۸۴)

Marfat.com

کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انسان کی اچھی یا بُری تقدیر لکھ کر اُسے مجبور کر دیا ہے۔ نیز اگر اس کے حق میں کوئی بُرائی لکھی جا چکی ہے تو اس کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

خدا تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا

قرآن کریم اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ انسان کو مجبور کرنا چاہے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ اور اگر ایسا کیا جاتا تو اس مجبور دُنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً[1]

اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا۔

نیز فرمایا:

لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ أَجْمَعِيْنَ[2]

اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا۔

مگر ایسی صورت میں جزا و سزا کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا اور انسان کو کسی جگہ بھی اپنی مرضی چلانے کا اختیار باقی نہ رہتا۔ اس کے برعکس خداوند تعالیٰ نے انسان کو عملی آزادی مرحمت فرمائی اور فرمایا:

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ۔

جو چاہو، عمل کرو۔

یہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان کے آزاد اور مختار ہونے کی عقلی دلیل ہے۔

جزا و سزا اور نظامِ عدل

یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے کسی بندے پر ادنیٰ درجے کا ظلم بھی گوارا نہیں کرتا۔

---

[1] النحل (۱۶: ۹۳)

[2] الانعام (۶: ۱۵۰)

Marfat.com

اسی سے نظامِ عدل کے ساتھ جزا و سزا کا تعلق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔[1] — تمہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے تھے۔

دوسرے مقام پر مزید واضح کیا گیا:

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔[2] — اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے، جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر اعلان ہوا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ۔[3] — بندہ اچھے کام کرے گا، تو اُسے اس کا فائدہ ملے گا، بُرے کام کرے گا تو اُسی کو نقصان پہنچے گا۔

جزا و سزا اور اتمامِ حجت

جزا اور سزا کے لیے اللہ ربّ العزت کا ایک اٹل اصول ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا جب تک اتمامِ حجت نہ کر لے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔[4] — اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔

---

[1] التحریم (۶۶ : ۷)

[2] النجم (۵۳ : ۳۹)

[3] البقرہ (۲ : ۲۸۶)

[4] بنی اسرائیل (۱۷ : ۱۵)

Marfat.com

اِس سلسلے کا دوسرا اُصول یہ ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔[1] اور کوئی اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔

اسی بنا پر قیامت کے روز ہر شخص خود اپنی فکر میں مبتلا ہوگا۔ چنانچہ سورۂ عبس میں ارشاد فرمایا:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۙ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۙ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ۔[2] اس دن بھائی اپنے بھائی سے دُور بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے نفور ہوگا۔ ہر شخص اس روز اپنی فکر میں ہوگا۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہوگا کہ اس کی جگہ اس کے تمام متوسلین اور مقربین کو پکڑ لیا جائے اور اس کی جان بخشی ہو جائے۔ چنانچہ سورۂ المعارج میں ارشاد فرمایا:

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۙ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۙ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ۔[3] عذاب کے بدلے میں (سب کچھ) دے دے (یعنی) اپنے بیٹے اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا اور زمین پر جتنے بھی آدمی ہیں، سب کچھ دے دے، اور اپنے تئیں عذاب سے چھڑا لے۔

---

[1] فاطر (۳۵: ۱۸)

[2] عبس (۸۰: ۳۴-۳۷)

[3] المعارج (۷۰: ۱۱ تا ۱۴)

Marfat.com

البتہ نیکوکار اور پرہیزگار لوگ اس کلیے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی لیے فرمایا:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ[1] (جو آپس میں دوست ہیں، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار کہ باہم دوست ہی رہیں گے)

بالفاظِ دیگر اس روز سبھی پریشان اور متفکر ہوں گے۔ مگر خدا تعالےٰ کے وہ بزرگ و برتر بندے جو دُنیا میں بھی دوسروں کی فکر میں غلطاں رہتے تھے، اس دن بھی اپنے بجائے دوسروں کی فکر میں مبتلا ہوں گے۔ اور اپنے اپنے درجے اور رُتبے کے مطابق خدا تعالےٰ کی بارگاہ سے منصبِ شفاعت پر سرفراز ہوں گے، مگر اُن کی شفاعت، شفاعتِ صغریٰ ہو گی، جب کہ سب سے بڑی شفاعت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہو گی۔

بہر حال جب تک اتمامِ حجت نہ کر دیا جائے اقوام و ملل مبتلائے عذاب نہیں ہوتیں، چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشادِ باری ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا[2] (اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (خواہش پر) مامور کر دیا، وہ نافرمانیاں کرتے رہے، پھر اس پر عذاب کا حکم ثابت ہو گیا، اور ہم نے اُسے ہلاک کر ڈالا۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کے ہاں کسی ضابطے اور کسی قانون

---

[1] الزخرف (۴۳ : ۶۷)

[2] بنی اسرائیل (۱۷ : ۱۶)

Marfat.com

کے بغیر کسی قوم کو ہلاک اور برباد کرنے کا اصول کارفرما نہیں، بلکہ جس بستی اور جس قوم کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے، خداوند تعالیٰ اس بستی اور اس قوم کی قیادت کی طرف (خواہ مذہبی قیادت ہو، یا سیاسی یا اقتصادی) حکم نازل کیا جاتا ہے، اُنھیں اطاعت اور فرمانبرداری کی ترغیب دی جاتی ہے لیکن جب یہ وڈیرے نما لوگ خدا تعالےٰ کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور خدا تعالےٰ کی طرف سے مقرر کردہ آخری حد کو بھی عبور کر جاتے ہیں، تو پھر اُن پر عذابِ خداوندی قہر بن کر ٹوٹ پڑتا ہے اور اُن کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو قوم خود اپنی حالت بدلنا نہ چاہے، خدا تعالیٰ اُس کی حالت کو نہیں بدلتا۔ اِسی لیے سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔[1]

خدا اس (نعمت کو) جو کسی قوم کو (حاصل) ہے، نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔

اتمامِ حجّت کا مفہوم

اتمامِ حجّت کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ لوگوں کے سامنے اپنے احکام کی اطاعت یا خلاف ورزی کے انجام و عواقب کو واضح فرما دیتا ہے۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ اطاعت کی صورت میں کیا صلہ اور خلاف ورزی کی صورت میں کیا سزا دی جائے گی۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کوئی قوم راہِ راست پر نہیں آتی تو پھر اُس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے حجّت تمام ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔ اِسی لیے فرمایا:

لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ۔[2]

تاکہ رسولوں کی بعثت کے بعد خدا تعالیٰ پر لوگوں کی کوئی حجّت نہ رہ جائے۔

---

[1] الرعد (۱۳: ۱۱)

[2] النساء (۴: ۱۶۵)

Marfat.com

ذاتِ خداوندی انسان کی اس قدر سچی خیر خواہ ہے کہ اس پر عذاب نازل کرنے سے پہلے اس کو بار بار فہمائش کرتی ہے، محبت، پیار اور پھر ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ سے اس کے گمراہی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکنے کی سعی کرتی ہے۔ اُس ذات کا ارشادِ گرامی ہے کہ :

وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ[1]

اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذابِ دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے شاید (ہماری طرف) لوٹ آئیں۔

اُس ذات کے متعلق بھلا یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ اس نے انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی ازلی تقدیر کے شکنجے میں جکڑ کر مجبور اور بے بس بنا دیا ہے۔

اخلاقی جدوجہد

اللہ ربّ العزت کی طرف سے انسان کو تیسرا تصوّر اخلاقی جدوجہد کا دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ ملک میں ہے:

اَلَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا[2]

اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔

یعنی اچھے اور بُرے عمل جانچنے کے لیے کائنات کا یہ سٹیج سجایا گیا، دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ پھر (رفتہ رفتہ) اس کی

---

[1] السجدہ (۳۲ : ۲۱)

[2] الملک (۶۷ : ۲)

Marfat.com

اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ[1]

حالت کو بدل کر پست کر دیا۔ مگر جو لوگ ایمان اور نیک عمل کرتے رہے، اُن کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

ایک اور مقام پر ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۙ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۙ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ؕ[2]

اور (قسم ہے) انسان کی اور اس کی جس نے اس کے (اعضاء) کو برابر کیا، پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (کرنے کی) سمجھ دی جس نے اپنے نفس (روح) کو پاک رکھا، وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اُسے خاک میں ملایا، وہ خسارے میں رہا۔

ایک اور جگہ اس نکتے کی وضاحت یُوں فرمائی:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ؕ[3]

جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں، کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اُن کو اُن لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوگی۔ جو یہ دعوے کرتے ہیں، بُرے ہیں۔

اِن تمام آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ انسان کو

---

[1] التین (۹۵: ۴-۶)

[2] الشمس (۹۱: ۷-۱۰)

[3] الجاثیہ (۴۵: ۲۱)

۴۹۴

Marfat.com

اخلاقی جد و جہد اپنانے کی تلقین فرماتا ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ انسان کو آزاد اور خود مختار گمان کیا جائے اور اگر خداوند تعالیٰ انسان کو پیدائشی طور پر اپنی قدرت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دے کہ وہ بیچارہ اپنی مرضی سے نہ نیکی کر سکے، نہ بدی۔ تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کی صورت میں اس سے جو کوئی نیکی صادر ہوتی ہے یا برائی سرزد ہوتی ہے، تو ایسی نیکی کو نیکی اور ایسی بدی کو بدی ہرگز نہ کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ مجبور آدمی کی نہ نیکی اپنی ہوتی ہے اور نہ بدی۔

اِس کی مثال اِس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر آپ کسی شخص کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیں اور اس کو پوری طرح بے بس اور بے دست و پا کرنے کے بعد اُسے کہیں کہ وہ آپ کی کسی سابقہ غلطی کو معاف کر دے تو اس حالت میں کیا دنیا کی کوئی عدالت عفو و درگذر کو کوئی اہمیت دے سکتی ہے۔؟ عفو تو وہی معتبر ہے کہ متعلقہ شخص اِنتقام لینے یا معاف کرنے پر قادر ہو اور انتقام نہ لے، معاف کر دے۔

گویا مجبوری کی حالت کو "اضطرار" تو کہہ سکتے ہیں، نیکی و بدی نہیں قرار دے سکتے۔

چنانچہ جب ہمارے دنیوی قوانین میں مجبوری اور اختیار میں اتنا فرق کیا جاتا ہے، اور جبر و اکراہ کی حالت میں کیا ہوا کوئی قول اور ارتکاب کیا ہوا کوئی جرم معتبر نہیں سمجھا جاتا، تو اللہ تعالیٰ جس نے فرمانِ نبوی ص کے مطابق تخلیقِ کائنات کے وقت سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ:

ان رحمتی سبقت غضبی [1] میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔

اِس سے کیونکر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ انسان کی اس بے بسی اور بے چارگی و

---

[1] مشکوٰۃ شریف (۱۹۹)

Marfat.com

مجبوری سے غلط فائدہ اُٹھائے گا۔ حاشا وکلا۔

حالتِ اضطرار اور قانونِ اسلامی

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ حالتِ اضطرار میں شریعتِ اسلامیہ حلال اور حرام کی تفریق اُٹھالیتی ہے اور جان بچانے کی غرض سے میتہ اور خنزیر تک کے گوشت کو کھانے کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں ہے:

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔[1]

اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور خون اور سؤر کا گوشت اور جس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، حرام کر دیا ہے۔ ہاں جو ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے آگے نہ بڑھے، اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک خدا بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

خداتعالیٰ نے کتنا آفاقی، کائناتی اور عالمگیر تصوّر دیا ہے کہ حالتِ اضطرار میں حرام تک کو مباح قرار دے دیا، دوسرے مقام پر فرمایا:

وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ۔[2]

حالانکہ جو چیزیں اس نے تمہارے لیے حرام ٹھہرا دی ہیں، وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں، مگر اس صورت میں کہ ان کے کھانے کے لیے ناچار ہو جاؤ۔

---

[1] البقرہ (۲ : ۱۷۳)

[2] الانعام (۶ : ۱۱۹)

Marfat.com

نیز فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ، اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ[1]

ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) گناہ کی طرف، تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

انہی وجوہ واسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ[2]

اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا[3]

خدا تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

اور حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا:

بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ[4]

مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے۔

اور اسلام سے قبل کی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کریم بیان کرتا ہے:

وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ[5]

اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان کے سر پر اور گلے میں تھے، اتارتے ہیں۔

---

[1] المائدہ (۵ : ۳)

[2] الحج (۲۲ : ۷۸)

[3] البقرۃ (۲ : ۲۸۶)

[4] مشکوٰۃ شریف، ۲۳۶

[5] الاعراف (۷ : ۱۵۷)

Marfat.com

یہ "اغلال" و "اصر" کیا ہے ؟ یہ غلط عقاید و تصورات کی زنجیریں اور توہمات کی بیڑیاں تھیں، جن میں انسانیت کا بند بند جکڑا ہوا تھا، حضورؐ کی بعثت کا ایک مقصد انسانیت کو ان زنجیروں اور بندھنوں سے نجات دلانا بھی تھا، اسی بنا پر ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ [1] — اور آپ کیا جانیں کہ گھاٹی کیا ہے، وہ کسی کی گردن چھڑانا ہے۔

بہرحال قرآن نے انسان کو مجبوریوں سے نجات کی راہ دکھائی، اس کے لیے سہولتوں کا اعلان کیا۔ جن میں سے ایک حالت اضطرار اور حالت اختیار کا نمایاں فرق بھی ہے۔

سیدنا فاروقِ اعظم کا ارشاد

خلافت فاروقی کے زمانے میں حجاز مقدس میں سخت قحط پڑا۔ اناج مفقود ہوگیا، اس حالت میں حضرت عمر فاروق نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر عمل درآمد روک دیا۔ اور فرمایا جب تک حکومت ہر شخص کو ضروریاتِ زندگی مہیا نہیں کرسکتی، وہ قطع ید کی حد نافذ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔[2]

سلطنتِ اسلامیہ کا فرض

سیدنا فاروقِ اعظم کے اس فرمان اور عمل سے قرآن و حدیث کے بیان کردہ اصول کی پوری طرح وضاحت ہوجاتی ہے، اور یہ قرار پاتا ہے کہ سلطنتِ اسلامیہ کا فرض صرف حدود و تعزیرات کا نفاذ ہی نہیں بلکہ اس کا اصل فرض برائی اور جرم کے مبادیات اور اسباب کا قلع قمع کرنا بھی ہے یعنی چوری ڈکیتی اور دیگر بیماریوں کے اصلی محرکات کا کھوج لگانا اور پھر اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اسلامی حکومت کا اولین فرض ہے۔

---

[1] البلد (۹۰ : ۱۲-۱۳)

[2] کتاب الخراج، امام ابویوسف، صفحہ ۱۴، مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ۔

Marfat.com

آج کے دور میں اسلامی حدود کو سخت بتایا جاتا ہے، مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان حدود کے عملی نفاذ سے پہلے مملکتِ اسلامیہ میں زندگی گذارنے کے بہتر حالات پیدا کرنے کی ضمانت ملتی ہے۔ اگر تمام ممکنہ سہولتوں کے باوجود کوئی شخص بدی کی طرف جھکتا ہے، تو وہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔

سیّدنا فاروق اعظمؓ کے زمانے میں ایک مقدمہ

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چوری کا ایک مقدمہ

سماعت کے لیے پیش ہوا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ کچھ ملازموں کو اپنے سرداروں کے اونٹ چرانے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا تھا۔ جب مقدمہ چلا تو ان پر چوری پوری طرح ثابت ہو گئی۔ ابھی چوری کی سزا پر عمل درآمد نہ ہوا تھا کہ حضرت عمر فاروق کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ انھوں نے ان سرداروں کو بلا بھیجا جن کے پاس وہ لوگ ملازم تھے۔ وہ حاضر ہوئے تو فاروق اعظمؓ نے ان سے پوچھا کہ تم نے کتنی مدّت سے اپنے ان ملازمین کو تنخواہیں نہیں دیں۔ پتا چلا کہ کافی عرصہ سے ان ملازمین کو تنخواہ نہیں مل رہی ہے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فیصلہ دیا کہ ان سرداروں سے اونٹوں کی دوگنا قیمت بطور تاوان وصول کی جائے۔[1]

ان واقعات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں مجبوری اور حالت اختیار میں نمایاں طور پر فرق کیا گیا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ حرام بھی حالتِ اضطرار میں حلال ہو جاتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے دین کے لیے بھی اکراہ و جبر گوارا نہیں:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ[2]

دین اسلام میں زبردستی نہیں (ہدایت صاف طور پر ظاہر اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

---

[1] الموطا۔ امام مالک۔ جلد ۲۔ صفحہ ۷۴۸۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۱ء

[2] البقرہ (۲ : ۲۵۶)

Marfat.com

خداوند تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جس میں کوئی چیز دوسری چیز سے التباس نہیں رکھتی۔ خیر کو شر سے اور شر کو خیر سے، نیکی کو بدی سے اور بدی کو نیکی سے نیز حالتِ اختیاری کو حالتِ اضطراری سے ممیّز کر دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر جب حج جیسے مقدس فریضے کا حکم نازل ہوا تو اس کے ساتھ بھی حالتِ مجبوری کا لحاظ رکھا گیا، ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا[1]

اور لوگوں پر خدا کا حق (یعنی فرض ہے) کہ جو اس گھر میں جانے کا مقدور رکھے، وہ اس کا حج کرے۔

ایک صحابی کا سوال اور حضورؐ کا جواب

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم نازل ہوا تو ایک صحابی نے سوال کیا:

أَفِي كُلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللّٰهِ۔

یا رسول اللہ! کیا یہ حج ہر سال فرض ہے۔

آپ خاموش رہے، اس نے سوال دہرایا مگر آپ ساکت رہے، اس نے تیسری مرتبہ اپنے سوال کا اعادہ کیا پھر بھی آپ خاموش رہے۔ مگر جب سائل کا شوق سوال دیکھا تو فرمایا:

لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ[2]

اگر میں ہاں کروں تو تم پر ہر سال حج فرض ہو جائے، جو ظاہر ہے تمہاری استطاعت سے باہر ہے۔ پھر فرمایا جہاں میں خاموش رہوں وہاں تم بھی خاموش رہو۔ کیونکہ تم میں سے پہلی اُمتیں کثرتِ سوال سے ہلاک ہوئی ہیں۔

---

[1] آلِ عمران (۳: ۹۷)

[2] بخاری و مسلم، کتاب الحج، مشکوٰۃ شریف، کتاب الحج، ۱: ۵۵۴، حدیث ۲۳۹۱۔

Marfat.com

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ انسانوں کو آسانیاں اور سہولتیں دینے کے لیے ہے، یہ انسانیت کو تمام بندھنوں اور زنجیروں سے نجات دلانے آیا ہے۔ یہ دین انسان کے جسم سے جبر و اکراہ کا بوجھ اُتارتا ہے، اختیار اور اضطرار میں فرق کرتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے سراسر رحمت و رأفت اور شفقت و احسان ہے۔ اس سے یہ توقع بھلا کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو اس کے عمل اور اس کے ہر فعل میں مقید قرار دے گا۔

"اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اختیارات امورِ خیر میں صرف کرنے کی توفیق بخشے۔"

(آمین)

Marfat.com

باب ہفتم

قضا و قدر

کا

انسانی زندگی میں کردار

Marfat.com

Marfat.com

○

انسان کے مجبور یا مختار ہونے اور اپنے اعمال کے کاسب ہونے کے مسائل پر بحث مکمل کر لینے کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ اصل میں مسئلہ تقدیر کیا ہے، اور قضاء و قدر میں باہمی فرق کیا ہے؟

(الف) قدر کا مفہوم

"قدر" کا لغوی مفہوم اندازہ کرنا، وزن کرنا، طے کرنا اور مقرر کرنا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ارشادِ باری ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ [1] — اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن یعنی لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۝ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ [2] — (یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے، لوح محفوظ میں لکھا ہوا۔

---

[1] یٰسین (۳۶ : ۱۲)
[2] البروج (۸۵ : ۲۲)

Marfat.com

نیز فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ [1]

خدا جس کو چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے (اور جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔

ان تمام آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات بشمول بنی نوع انسان کے احوال و کوائف کا علم خدا تعالیٰ کے پاس ازل سے موجود ہے، جسے اس نے "اُم الکتاب" یا "لوحِ محفوظ" میں حفاظت سے لکھا ہوا ہے۔ اور "کل شئ" کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ذرّہ بھی اس کلیے سے ماوراء نہیں۔

بہت سی احادیث میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كتب الله المقادير الخلائق قبل ان يخلق السموات والارض بخمسين الف سنة قال وكان عرشه على الماء [2]

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل مخلوقات کی تقدیر لکھ دی تھیں، جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔

---

[1] الرعد (۱۳: ۳۹)

لوح محفوظ یا اُم الکتاب سے مراد خداوند تعالیٰ کا وہ علم ہے جس میں سب چیزوں کے احوال موجود ہیں۔

[2] مسلم شریف، کتاب الایمان، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، ۱: ۳۴، حدیث ۷۲۔

Marfat.com

ایک دوسری روایت میں ہے:

ان اول ما خلق اللہ القلم فقال لہ اکتب فقال ما اکتب؟ قال اکتب القدر فکتب ما کان وما ھو کائن الی الابد [1]

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو تخلیق فرمایا اور اسے حکم دیا کہ لکھ۔ اس نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ فرمایا: مخلوقات کی تقدیریں لکھو چنانچہ اس نے جو چیز ہو چکی تھی اور جو چیز ہونے والی تھی، سب لکھ دیں۔

اسی طرح ایک موقع پر بعض صحابہؓ نے آپؐ سے بوجوہ ترک لذات کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا:

جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ [2]

تجھے جو کچھ ملنا ہے، اسے قلم لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔

اس موضوع پر بے شمار احادیث اور روایات مروی ہیں، جن سے مسئلہ تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایات مختلف محدثین نے ثقہ راویوں سے نقل کی ہیں۔ لہٰذا ان روایات کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

عوامی غلط فہمی اور اس کا ازالہ

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس قسم کی آیات اور احادیث کا جو مفہوم عوام میں

---

[1] الترمذی، مشکوٰۃ شریف، ۱:۲۷، حدیث ۸۷۔

[2] البخاری، کتاب النکاح، مشکوٰۃ، ۱:۲۵، حدیث ۸۱۔

Marfat.com

لیا جاتا ہے، وہ قرآن و حدیث کی مراد کے قطعاً منافی بلکہ متضاد ہوتا ہے۔ عوام کے بعض حلقوں نے ان آثار و روایات سے یہ تأثر لیا ہے کہ مسئلہ تقدیر کا مفہوم نوشتۂ تقدیر کے سامنے تمام مخلوق بالخصوص انسانوں کی بے بسی اور مکمل مجبوری ہے۔ عوام کے خیال میں مسئلہ تقدیر کے ذریعے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مجبور اور مقید کر دیا ہے، وہ اس سے سرِ مو بھی انحراف نہیں کر سکتے۔

(ب) قضا اور قدر کی دو اصطلاحیں اور ان کا مفہوم

ان دو مختلف اسلامی اصطلاحات میں خلطِ مبحث کے نتیجے کے طور پر عوام الناس اس مسئلے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر ان دونوں اصطلاحوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو بڑی حد تک اس غلط فہمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

قضا و قدر کے دو مفہوم ہیں، ان میں سے ایک آفاقی اور کائناتی سطح کے اعتبار سے اور دوسرا انسان کے شخصی و انفرادی احوال کے لحاظ سے ہے۔

قضا و قدر آفاقی و کائناتی اعتبار سے

آفاقی اور کائناتی اعتبار سے قضا و قدر کا مفہوم یہ ہے کہ قضا کا مفہوم تخلیق اور قدر کا مفہوم اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں، زمین اور کائنات کے ساتوں طبقات پیدا کیے اور ان میں موجود لطیف و کثیف مخلوق کی تخلیق فرمائی، یہ خداوند تعالیٰ کی قضا ہے، اسی بنا پر سورۂ حٰم السجدہ میں ارشاد فرمایا گیا:

فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِىْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِىْ كُلِّ سَمَآءٍ

پھر دو دن میں سات آسمان بنائے اور ہر آسمان میں اس (کے کام) کا حکم بھیجا۔

Marfat.com

آمرٌ ھَا [1]

یہاں قضا کا لفظ خلق یعنی پیدائش کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے جبکہ قدر، قدرت اور تقدیر و قدیر کے الفاظ جو قرآنِ حکیم میں کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں، ان کا مفہوم "اختیار" و اختبار (چننا) ہے۔ اس طرح "قضا و قدر" کے دو لفظوں میں تخلیقِ کائنات اور اس کی بقا و سالمیت کا راز پنہاں ہے۔ ان دو الفاظ میں قانونِ تخلیق کی وہ بنیادی شق بیان کی گئی ہے جس کی بنیاد پر قدرت کا یہ عظیم اور پُرہیبت کارخانۂ تخلیق کیا گیا اور اس کے ایک ایک ذرے کو ادراک و شعور بخشا گیا ہے۔

انسانی زندگی میں قدر کا مفہوم

انسان کی انفرادی اور شخصی سطح پر قدر کے معنی اندازہ اور قضا کے معنی اجراء کے ہیں (مفردات راغب الاصفہانی)

خداوند تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کے لیے اچھائی اور برائی تخلیق کر کے اسے اس میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے اور اپنے عمل کے لیے مخصوص کر لینے کا اختیار یعنی قدرت عطا فرمائی ہے۔ وہ چاہے تو نیکی کو اختیار کرے اور چاہے تو بدی کو اپنا وطیرہ بنا لے۔ چنانچہ سورۃ البلد میں ہے:

أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ [2]

بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے) (یہ چیزیں بھی دیں) اور اس کو (خیر و شر) کے دونوں راستے بھی دکھا دیے۔

---

[1] حٰمٓ السجدہ (۴۱ : ۱۲)

[2] البلد (۹۰ : ۸ تا ۱۰)

Marfat.com

بالفاظِ دیگر خداوند تعالیٰ نے انسان کو جس قدر ظاہری اور باطنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، ان سب کا ایک واضح مقصد یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی صلاحیتوں کو راہِ خیر میں صرف کر کے مراتب کمال سے ہمکنار ہو جائے اور چاہے تو اپنی ان قوتوں کو بدی کے بیج بونے اور کاٹنے کے لیے وقف کر دے۔ خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ؕ[1]

دینِ اسلام میں زبردستی نہیں ہے، ہدایت صاف طور پر ظاہر اور گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

نیز فرمایا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ؕ[2]

اور کہہ دو، یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے۔ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے اصول کی تبلیغ کی وضاحت کرنے کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ[3]

پیغمبر کے ذمے تو خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے۔

انبیاءِ کرام علیہ السلام بھی اپنی قوموں کو تذکیر و موعظت کے بعد فرماتے تھے:

---

[1] البقرہ (۲: ۲۵۶)

[2] الکہف (۱۸: ۲۹)

[3] المائدہ (۵: ۹۹)

Marfat.com

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ [1] اور ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے اور بس۔

مقصد یہ تھا کہ پیغمبروں کا کام ایصال الی المطلوب نہیں، بلکہ محض خدا کے پیغام کا پہنچانا تھا۔ خدائی حکم کے پہنچ جانے کے بعد اب یہ کام متعلقہ فرد کا ہے کہ وہ چاہے تو انبیا کی باتوں پر کان دھرے اور چاہے تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لے۔ اسی بنا پر سورۂ کافرون میں اتمام حجت کرتے ہوئے فرمایا:

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ [2] تم اپنے دین پر، میں اپنے دین پر۔

قضا کا مفہوم

"قدر" کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی۔ قضا سے مراد وہ اصول اور وہ قوانین فطرت ہیں جن کے تحت یہ کارخانۂ قدرت اپنے اپنے وقت پر، اپنے مخصوص خصائص و مصالح کے ساتھ معرض تخلیق میں لایا گیا ہے اور جن کے تحت اس کائنات کے نظام کی بقا کو علت و معلول، سبب اور مسبب نیز عمل اور ردِ عمل کے نظام کے تحت منضبط کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص نیکی کرے گا تو اس کے نتائج بھی نیک نکلیں گے اور برائی کے ثمرات بھی ویسے ہی برے ہوں گے۔ انسان جو کچھ کرے گا، اس کا بدلہ پائے گا۔ جس مقصد کے لیے تگ و دو اور جد و جہد کرے گا اس کے حصول میں کامیاب و کامران ہو گا۔ اس تمام نظام قدرت کا نام قضائے الٰہی ہے۔ اس کا ذکر سورۂ البقرہ میں یوں کیا گیا ہے:

---

[1] یٰسین (۳۶ : ۱۷)

[2] الکافرون (۱۰۹ : ۶)

Marfat.com

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱

جو لوگ کافر ہیں، انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو، ان کے لیے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

بالفاظ دیگر جس شخص نے ہدایت کے آفتاب عالمتاب کی تمام ترجگمگاہٹوں کے باوجود کفر کے اندھیرے اور پُرخطر راستے ہی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا، اس کے ہدایت سے محروم رہنے کا فیصلہ قدرت کی طرف سے صادر کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ہدایت سے محروم رہنا خود اس کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ایسے لوگوں کی قلبی حالت کی ترجمانی کرتے ہوئے ارشاد ہوا،

کَلَّا بَلۡ ۜ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ۝۲

دیکھو یہ جو (اعمالِ بد) کرتے ہیں، ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد

اس مقامِ ضلالت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ،

" جب کوئی شخص نیک کام کرتا ہے تو اس کے دل پر نُور کا ایک نکتہ ثبت ہو جاتا ہے اور اگر وہ نیکیاں کرتا چلا جائے تو اس کا دل بُقعۂ نور بن جاتا ہے۔ پھر

---

۱ البقرہ (۲:۶)

۲ المطففین (۸۳:۱۴)

Marfat.com

اس کی نیکی کا اثر اس کے چہرے پر بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص برائی کرتا ہے اور اس پر خدا کے سامنے توبہ نہیں کرتا تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے۔ اب اگر وہ شخص توبہ کر لے تو وہ نکتہ محو ہو جاتا ہے۔ توبہ نہ کرے بلکہ دوسرا گناہ کر لے۔ پھر تیسرا اور اسی طرح گناہ پہ گناہ کرتا چلا جائے تو ہر گناہ کے بدلے اس کے دل پر ایک ایک نکتہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تاوقتیکہ اس کے دل کی دنیا سیاہ بادلوں کی طرح ظلمت کدہ بن کر رہ جاتی ہے اور اس میں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہی وہ ران (زنگ) ہے جس کا سورۃ المطففین میں یوں ذکر کیا گیا ہے: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ [1]

یہاں پہنچ کر بندے میں قبولِ حق کا جذبہ مکمل طور پر مر جاتا ہے اور وہ مجسمۂ شیطنت اور سرچشمۂ شر بن جاتا ہے۔

یہاں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے دل کا تاریک کر دیا جانا نیز ان کے قلوب و اذہان پر مہرِ خداوندی کا ثبت ہو جانا ان پر کوئی ظلم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خود ان کے اعمال و کسب کا نتیجہ اور ثمرہ ہے نیز اُن کے اپنے افعالِ شنیعہ کا ردِ عمل ہے۔ اُنھوں نے جو کچھ چاہا تھا، اُس کا انجام انہیں دکھا دیا گیا۔

حق کی پکار جاری رہتی ہے

(اُصولِ قضا کے تحت) یہ سب کچھ ہوتا اور بار بار دہرایا جاتا ہے، مگر قانونِ قدر کے تحت نافرمان بندوں کو قبولِ حق کے اختیار کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف

---

[1] ابنِ جریر الطبری - جامع القرآن فی تفسیر القرآن، مطبوعہ قاہرہ، ۱: ۸۶، تفسیر سورۃ البقرہ آیت ۶-۷۔

Marfat.com

سے حق کی دعوت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان کے کانوں اور آنکھوں کے بند دریچوں کو کھولنے اور ان کے مسخ شدہ قلوب واذہان کو مائل بہ حق کرنے کی کوشش جاری رکھی جاتی ہے۔ مزید برآں ان پر توبہ و استغفار کے دروازے بھی کھلے رکھے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ حکم قدر کے تحت ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر "ءَاَنذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ" کا حکم نازل ہونے اور کفار و معاندین کے قلوب کے مسخ شدہ ہونے کی خبر زبانِ رسالت سے نشر کیے جانے کے باوجود بھی پیغمبرِ اسلام کی طرف سے ان کو ہدایت و تبلیغ جاری رہی اور ان کی ہلاکت سے پہلے کسی موقع پر بھی یہ فیصلہ نہیں کر لیا گیا کہ اب پیغامِ ہدایت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

بیمار شخص کے لیے مرغن خوراک

عملی زندگی میں اس کی مثال اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص بے احتیاطی کر کے اور خراب اور ناقص غذائیں کھا کر اپنا معدہ مکمل طور پر خراب کر لے۔ جب جسمانی کمزوری اور ضعف حد سے بڑھنے لگے تو اپنی بیماری کا صحیح طریقے سے علاج کر لینے کے بجائے از خود مرغن اور قوت بخش غذاؤں کا استعمال شروع کر دے تو نتیجہ کیا ہو گا؟ ظاہر ہے کہ ایسی طاقت ور غذائیں اس شخص کو مزید بیمار اور مضمحل کر دیں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خوراک میں کچھ کمی ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس کے معدے میں اسے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ اب اگر مذکورہ شخص یہ شکایت کرنے بیٹھ جائے کہ لوگ یہی غذائیں کھاتے ہیں اور طاقت ور ہو جاتے ہیں اور میں روز بروز مزید کمزور ہوتا جا رہا ہوں تو ایسے شخص کو ہمیشہ ایک ہی جواب ملے گا کہ اس میں نہ کسی دوسرے کا قصور ہے، نہ غذا کا۔ یہ تو صرف اور صرف اسکا

Marfat.com

اپنا قصور ہے کہ اس نے پہلے اپنا معدہ خراب کیا، پھر اسی کیفیت میں مرغن غذائیں کھانی شروع کر دیں۔

اسی طرح ایک شخص برائی کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ پھر اسی راستے پر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اب اگر قلب کے متعفن اور مردہ ہو جانے کی وجہ سے اس میں قبول حق کی صلاحیت نہیں رہی اور اس پر کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ نصیحت بھی کارگر نہیں ہوتی تو اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس سوچ کا کوئی جواز ہے کہ "میرا مقدر ہی خراب تھا" اسے چاہیے کہ وہ پہلے اپنے باطن کی اصلاح کرے۔ جہاں سے اصل بگاڑ اور فساد شروع ہوا ہے۔ جس بگاڑ کے ہوتے ہوئے اس پر تمام وعظ و نصیحت بے اثر ہو جاتی ہے اور پھر وعظ و نصیحت کی طرف دھیان دے۔

قدر مقدم — قضا مؤخر

بہرحال انفرادی اور شخصی سطح پر قضا و قدر کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے اول الذکر یعنی قدر کا تعلق بندے کے اختیار اور فعل سے ہے جبکہ مؤخر الذکر یعنی قضا کا تعلق خداوند تعالیٰ کے حکم کے نفاذ سے ہے۔ ان میں ترتیب یہ ہے کہ قدر ہمیشہ مقدم اور قضا ہمیشہ مؤخر ہوتی ہے۔

لفظی اعتبار سے قدر کا مفہوم اندازہ کرنا، کسی چیز کو ناپنا، تولنا ہے۔ انگریزی میں اس کا مفہوم (ASSESSMENT) (EVALUATION) وغیرہ ہے۔ جو علم اس اندازے کی بنا پر واقع ہو اسے بھی قدر کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ — ہم نے ہر چیز اندازۂ مقرر کے ساتھ

Marfat.com

بِقَدَرٍ [1]

پیدا کی ہے۔

اُردو میں "قدر" کا لفظ اندازے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم یہ کہتے ہیں کہ "یہ چیز اس قدر کافی ہے" یا ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بات "اس قدر درست ہے اور اس قدر غلط" پس قدر سے مراد اُردو میں ایک خاص اندازہ اور مقدار ہوتی ہے جبکہ قضا کا مفہوم اظہار اور بیان ہے۔

قدرت نے اپنے عالم الغیب والشہادہ ہونے کی بنا پر تخلیق کائنات سے پہلے اپنے بندوں کو اختیارات اور آزادی دینے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس کا نام قدر ہے اور اس اندازے پر مبنی علم کے اظہار کا نام قضا ہے جیسے کوئی انتہائی قابل اور تجربہ کار اُستاد اپنے شاگردوں میں سے کسی ایک کے متعلق کہہ دے کہ فلاں طالب علم ضرور فیل ہوگا۔ اور ایک سال کے بعد وہ طالب علم فیل ہو جائے۔ تو کیا اُستاد کا ایک سال پہلے اس کے فیل ہونے کی پیشینگوئی کرنا اس کے فیل ہونے کا باعث ہوا یا اس کا اپنا عمل۔ ظاہر ہے کہ اُستاد کا اعلان بچے کے مستقبل (FUTURE) کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اُستاد کے اس قول نے مذکورہ طالب علم کے فیل ہونے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ وہ محض اور محض اپنی نالائقی اور بے توجہی کی وجہ سے فیل ہوا ہے۔ اگر وہ محنت کرتا تو اسے یہ روزِ بد دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوتا۔ البتہ اُستاد کا ایک سال قبل بتا دینا اُس کے کمالِ علمی اور مہارتِ تامّہ کی دلیل ہے۔

موسمی حالات کی پیشین گوئی

اسی طرح محکمہ موسمیات کی طرف سے روزانہ موسمی حالات کی پیشینگوئی کی جاتی

[1] القدر (۵۴:۴۹)

Marfat.com

ہے جس میں کسی علاقے میں بارش کا ہونا اور کسی علاقے میں بارش کا نہ ہونا بھی شامل ہوتا ہے۔ اب اگر پیشینگوئی کے بعد اگلے روز بارش ہو جاتی ہے یا موسم خشک رہتا ہے تو ساری دنیا جانتی ہے کہ نہ بارش برسانے میں محکمہ موسمیات کو دخل ہے، نہ موسم کی خشکی میں۔ یہ تو محض حالاتِ سابقہ کے مختلف مخصوص نشانات اور علامات کی بنیاد پر مفوضہ معلومات کا اظہار تھا۔ بارش کا ہونا یا نہ ہونا تو نظامِ قدرت کا ایک حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ پیشینگوئیاں غلط بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ماہرینِ فلکیات چاند یا سورج کے گرہن کی پیشینگوئی کرتے ہیں اور اس کے مطابق چاند اور سورج کو گرہن لگ بھی جاتا ہے۔ لیکن یہ گرہن اس پیشینگوئی کی وجہ سے تو نہیں لگتا۔

پیشینگوئیوں کا پس منظر

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگوں کو وقت سے پہلے آنے والے حوادث و واقعات کا پتا کیونکر چل جاتا ہے؟ وہ کیسے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کائنات کا ہر وجود ایک معین و مقرر سمت کی جانب محوِ سفر ہے۔ اس کے سفر کے دوران میں پیش آنے والے ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی علت اور غایت ضرور ہوتی ہے۔ خالقِ کائنات نے ہر علت کے ساتھ معلول اور ہر سبب کے ساتھ مسبّب کو مشروط و ملزوم کر دیا ہے۔ تو جو لوگ اس کائنات کے کسی حصے یا کسی نظام کے علت و معلول یا سبب اور مسبّب کو جان جاتے ہیں، ان کے لیے واقعات کی رفتار کا رخ متعین کرنا اور ان کے وقوع کی ٹھیک ٹھیک گھڑیوں کا جان لینا دشوار نہیں رہتا۔ اس نوع کی تمام پیشینگوئیاں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ یہ لوگ واقعات

Marfat.com

کے خارجی وقوع سے پہلے محض علت یا سبب کو جان کر اس کے معلول یا مسبب کا کھوج لگا لیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ماہرینِ فلکیات ہوں یا ماہرینِ موسمیات، وہ اپنی پیشینگوئی کے ذریعے نظامِ کائنات کی سمت اور جہت تبدیل نہیں کرتے اور ایسا کر بھی نہیں سکتے۔ یہ جہت اور سمت تو خلاقِ عالم نے ان کو ابتداءِ آفرینش سے عطا کر رکھی ہے۔ یہ لوگ تو فقط علامات کو جان کر آنے والی ایک طے شدہ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور بس۔

زمانہ کے تین روپ ہیں، ماضی، حال، مستقبل۔ ماضی تو ہم پر عیاں ہے کہ اس کے تمام واقعات لوحِ دہر پر مرقوم ہو کر سب کی نگاہوں میں آ چکے۔ ایک طرح سے حال بھی ہمارے علم اور ادراک کے دائرے میں ہے۔ البتہ مستقبل (FUTURE) زمانے کا وہ حصّہ ہے جو مکمل طور پر ہماری نگاہوں سے اوجھل اور مخفی ہے۔ اس کی ایک ایک کڑی پردۂ غیب میں مستور ہے۔ اسی بنا پر سورۂ لقمان میں خمس مغیبات (پانچ خفیہ اُمور) میں سے ایک امر یہ بھی ہے:

وَمَا تَدْرِیْ مَا ذَا تَكْسِبُ غَدًا [1] — اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا۔

لیکن مستقبل ہر ایک کے لیے مخفی نہیں ہے۔ کوئی آنکھ ایسی بھی ہے جس کے سامنے مستقبل کا ہر واقعہ اپنی تمام جزئیات سمیت روزِ روشن کی طرح ظاہر و بیّن ہے۔ یہ ہستی خود ذات جل و علا کی ہے جس کے سامنے کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل کھلی کتاب کی طرح روشن ہیں۔ اپنے وسیع علم اور غیر محدود ادراک کی بنیاد پر وہ یہ

---

[1] لقمان (۳۱ : ۳۴)

Marfat.com

جانتا ہے کہ آئندہ زمانے میں کیا ہو گا اور کیا نہیں ہو گا۔ اس کی قدرتوں اور قوتوں کی طرح اس کا علم بھی بے پایاں ہے۔ لیکن جس طرح کسی واقعہ کا علم اس کے وقوع کی مجبوری اور قید نہیں بن سکتا، اسی طرح یہ بے پایاں خدائی علم کسی انسان کی مجبوری نہیں ہو سکتا۔[1]

---

[1] مولانا روم نے اس موضوع پر دو بڑی نفیس حکایات پیش کی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک چور کو شاہی پیادے پکڑ کر کوتوال کے پاس لائے اور بتایا "کہ اس شخص کو ہم نے چوری کرتے ہوئے موقع پر گرفتار کیا ہے۔ کوتوال نے چور سے پوچھا، تو نے چوری کی ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں، لیکن میں نے جو کچھ کیا خدا کے حکم سے کیا۔ تو جانتا ہے کہ کائنات کا ایک ذرہ بھی خدا کے حکم سے باہر نہیں ہے۔ یہ سن کر کوتوال نے پیادوں سے کہا کہ اسے درخت سے اُلٹا لٹکا کر اتنا مارو کہ کھایا پیا سب بھول جائے۔ یہ حکم سن کر چور نے گڑگڑانا اور رونا شروع کر دیا تو کوتوال نے کہا، اب کیوں روتا ہے؟ یہ کام میں بھی خدا کے حکم ہی سے کر رہا ہوں۔

اسی طرح ایک شخص بغیر کسی اجازت کے باغ میں جا گھسا اور درخت پر چڑھ کر پھل توڑنے لگا۔ اتنے میں باغ کا مالک ادھر آنکلا اور اس شخص کو پھل توڑتے دیکھ کر بولا۔ ارے او بے حیا! یہ کیا حرکت ہے؟ پھل توڑنے والے نے جواب دیا اگر اللہ کے باغ سے اللہ کا بندہ اللہ کی پیدا کی ہوئی کھجور توڑ کر کھائے تو اس میں بے حیائی کی کون سی بات ہے؟ خدائے بے نیاز کی لازوال نعمتوں پر سانپ بن کر بیٹھنے والا تو کون ہے؟ یہ سن کر باغ کے مالک نے اپنے نوکر سے کہا: ذرا مضبوط سی رسی اور کوڑا لے آؤ تاکہ میں اللہ کے اس بندے

Marfat.com

خدا تعالیٰ نے اپنی نسبت ارشاد فرمایا:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ[1] — اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

"مفاتح الغیب" کہتے ہیں مخفی حقائق کو۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کے حقائق مخفیہ غیبیہ کا علم خدا کے پاس ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات آفرینش کائنات سے پہلے موجود تھی۔ اس نے انسانوں اور دوسری کائنات کو پیدا کیا اور پھر انسانوں کو اپنے عمل کا مکمل اختیار عطا فرما دیا۔ انسانوں نے اپنے اس اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف اچھے اور بُرے کام کیے۔ کسی نے قتل کیا، کسی نے لوٹ مار مچائی، کسی نے بھلائی کی، کسی نے عدل وانصاف کے تقاضے پورے کیے۔ لڑائیاں لڑیں، ملک فتح کیے، زمین کو سنوارا، شہر آباد کیے، چھوٹی بڑی بستیاں آباد کیں۔ ان اعمال کے وقوع پذیر ہونے سے مختلف نتائج پیدا ہوئے۔ خداوند تعالیٰ چونکہ مفاتیح الغیب کا مالک ہے، اس لیے انسانوں کو متوقع آزادی دیے جانے کے جو نتائج وقوع پذیر ہونے تھے، وہ اسے پہلے سے معلوم

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

کو جواب دوں۔ غلام دوڑا دوڑا گیا اور دونوں چیزیں پیش کر دیں۔ باغ کے مالک نے چور کو اسی درخت سے باندھا اور اس کی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ چور نے کہا: ارے بھائی کچھ تو خدا کا خوف کرو کیوں مجھے مار ڈالے گا۔ اس نے جواب دیا جنجو مت: اللہ کی پیدا کی ہوئی لکڑی سے اللہ کا ایک بندہ اللہ کے دوسرے بندے کو مار رہا ہے۔ آخر اس چور نے اپنے عقیدے سے توبہ کی اور اقرار کیا کہ بے شک انسان کو قوت اختیار یہ حاصل ہے (حکایاتِ رومی، ص ۱۷۰-۱۷۱)

[1] الانعام (۶: ۵۹)

Marfat.com

تھے۔ لیکن خداوند تعالیٰ کا یہ علم کسی شخص کو مجبور نہیں کرتا۔

فی الجملہ کسی امر کا پہلے سے جان لینا، اس کے وقوع کا اندازہ لگا لینا "قدر" ہے اور تخلیق کائنات کا ایک حصّہ ہے۔ جبکہ اس کے علم کے اظہار اور اسے بیان کر دینے کا نام "قضا" ہے۔ "قدر" انسانی آزادی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کے مختار اور آزاد ہونے پر روشنی پڑتی ہے، انسان اور اس کے اعمال و کوائف سے متعلق خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ اندازوں کا اظہار ہوتا ہے

قضا مُعلّق اور قضا مُبرم

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ گو خدا تعالیٰ نے انسان کے کسب و عمل کی نسبت پہلے سے اندازہ مقرر فرمایا ہے اور "قضا" کی صورت میں اس کا اظہار بھی فرما دیا ہے لیکن انسان کا تکمیلِ کار کی آخری گھڑی تک اپنے اس کام کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنی نیت کو بدل سکتا ہے، اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتا ہے۔ اور خدا کی طرف سے بھی یہ وعدہ ہے کہ اگر کوئی بندہ بدلنا چاہے تو ہم اس کے بدلنے والے ارادے اور نیت کے ساتھ ہی اس کی تقدیر بھی بدل دیں گے۔ سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ [1]

خدا جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے۔ اور لوحِ محفوظ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

---

[1] الرعد (۱۳: ۳۹)

Marfat.com

ام الکتاب سے مراد "لوحِ محفوظ" ہے۔ جہاں ما کان وما یکون کے احوال اور کیفیات کا اندراج ہوتا ہے جو بقولِ بعض علم الٰہی ہی کا نام ہے۔ لہٰذا اس آیۂ مبارکہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ خداوندِ تعالیٰ اپنے اندازے میں تبدیلی کرتا رہتا ہے اور موقع بہ موقع اس میں ردوبدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ عام طور پر "قضائے معلق" کی صورت میں ہوتا ہے۔ گویا اگر انسان خود کو بدلے یا بدلنا چاہے تو خداوند تعالیٰ اس کی خاطر اپنے اندازے اور اپنی مقرر کردہ تقدیر میں تبدیلی فرما دیتا ہے۔

معاذ اللہ خدا کا علم انسان کے اعمال کی نسبت غلط نہیں ہو سکتا۔ تو پھر لکھی ہوئی تقدیر کو مٹانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اور اگر تقدیر لکھی ہوئی نہ ہو تو اس کو لکھنا کیوں ضروری ہوا؟ بہر حال لکھی ہوئی کو مٹانا اور نہ لکھی ہوئی کا لکھا جانا، یہ دونوں امر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تقدیر قطعاً ایسے مسئلے کا نام نہیں جس میں تبدیلی نہ ہو سکے۔ وہ تو محض انسانی اچھائی یا برائی کا ایسا علم ہے جس میں موقع و محل کی نسبت سے تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس تبدیلی پر مائل ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ملکِ شام میں طاعون کی وبا پھیلی۔ اس زمانے میں حضرت عمر بھی شام گئے ہوئے تھے۔ وبا کی وجہ سے انہوں نے وہاں سے نکلنے میں جلدی کی۔ تو حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا:

افر من قضاء اللہ — کیا آپ اللہ کی قضا سے بھاگتے ہیں؟

فرمایا:

افر من قضاء اللہ — میں اللہ کی قضا سے اس کی قدر

Marfat.com

الیٰ قدر اللہ [1] — کی طرف بھاگتا ہوں

مطلب یہ ہے کہ قضا تو فیصلے کا صرف اعلان ہے۔ اگر طاعون جیسا مہلک مرض کسی علاقے میں وبا کی صورت میں پھیل جائے اور ہیں کسی دوسرے علاقے میں پہنچ کر اس مرض سے بچ جاؤں تو میرا بچ جانا یقیناً خدا کی تقدیر یعنی علم میں ہو گا۔ اس لیے فرمایا کہ طاعون کے فیصلے سے ہٹ کر میں خدا کے علم کی طرف جا رہا ہوں۔ کیونکہ قضا ایک امر الٰہی ہے مگر تقدیر پر انسان کا اختیار ہے۔ [2]

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

ایک مرتبہ صحابہ کے ذہنوں میں مسئلہ تقدیر کی نسبت کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے انہی سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور خیال کرتے ہوئے کہ جو کچھ طے ہو چکا ہے وہ بدل نہیں سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔

اَفَلَا نَتَوَکَّلُ — کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسا نہ کرلیں۔

اس پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جفّ القلم بما انت لاق [3] — جو کچھ تمہیں ملنے والا ہے اُسے قلم لکھ کر خشک ہو چکے ہیں۔

---

[1] المفردات، الراغب الاصفہانی

[2] تفسیر المفاتیح العلوم للرازی، ۶ : ۵۲۷، مطبوعہ قاہرہ بذیل الاحزاب (سورہ ۳۳ آیت ۳۷، ۳۸) نے یہ الفاظ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب

(بقیہ آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

آپ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ خدائی علم اور نوشتۂ تقدیر نے انسان کو مجبور نہیں کر دیا بلکہ انسان کو تگ و دو اور سعی و جد و جہد کے ساتھ اپنے مقدر کو تلاش کرنے کی آزادی دی ہے، اسے عمل کا اختیار دیا ہے، اسے کسبِ خیر کی تلقین فرمائی ہے۔

ابتدائے خطبہ میں ایک حدیث کا تذکرہ کیا گیا تھا جس میں ارشاد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور اسے حکم دیا کہ جو کچھ ہو چکا ہے (ما کان) اور جو کچھ ہونے والا ہے (ما یکون) سب کچھ لکھ دے۔ یہاں غور فرمائیے، صرف زمانۂ مستقبل کے کوائف قلمبند کرنے کا حکم نہیں دیا جا رہا، بلکہ ماضی کے واقعات بھی قلمبند کرنے کا امر فرمایا۔ اب اگر یہ تقدیری نوشتہ اپنے سے پہلے (ما کان) کے واقعات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تو مستقبل کے حالات (ما یکون) کو کیونکر متاثر کر سکتا ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو ایک طویل خطبہ دیا جس کے متعلق حضرت ابو حذیفہ فرمایا کرتے تھے:

قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما ما ترک شیئا	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ لمبا خطبہ دیا جس میں آپ نے اپنے وقت سے لے کر قیامت تک جو کچھ ہونے

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

کیے ہیں اور یہ واقعہ لکھا ہے کہ آپ ایک پہاڑ پر سے گزر رہے تھے تو وہاں کچھ ایسے پتھر پڑے تھے جو گرنے کو تھے۔ آپ وہاں سے تیزی کے ساتھ گزر گئے۔ اس موقع پر مندرجہ بالا سوال و جواب ہوئے۔ عین ممکن ہے، یہ دونوں ہی واقعات پیش آئے ہوں حضرت عمرؓ کو ارشادِ نبوی یاد ہو اور انہوں نے اس موقع پر یہی الفاظ دہرا دیے ہوں۔

۳ھ البخاری ومسلم۔

Marfat.com

يكون في مقامه ذالك الى قيام الساعة الا حدث به حفظه من حفظه ونسيه من نسيه [1]

والا تھا، سب کا ذکر کیا۔جس نے یاد رکھا اُس کو یاد رہ گیا اور جس نے بھلا دیا، وہ بھول گیا۔

اس قسم کی بہت سی روایات اور احادیث کتبِ صحاحِ ستہ میں مروی ہیں، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے زمانۂ مستقبل کی پیشینگوئیاں اور آئندہ زمانے کے واقعات وحالات کا ٹھیک ٹھیک بیان مذکور ہے۔بعض روایات میں ہے کہ آپ نے لوگوں کے جنت میں داخل ہونے تک کے تمام وقائع بیان فرمادیے تھے۔

آپؐ نے اس خطبہ میں قیامت تک کے احوال کو بیان فرمایا ازل میں قلم نے بھی کائنات کے جملہ حقائق کو لوحِ محفوظ پر رقم کیا تھا۔اب اگر حضورِ اکرمؐ کا بیان انسانی زندگی کے لیے جبر نہیں ہے، تو نوشتۂ تقدیر انسان کو کیسے مجبور کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کی نیکی اور بدی کی ذمہ داری خود اس کے اپنے کندھوں پر ڈالی ہے تاکہ نیکی کی صورت میں جزا کا اور بدی کی صورت میں سزا کا مستحق ہو سکے۔ اسی مضمون کو علامہ اقبال نے کس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

---

[1] بخاری ومسلم۔نیز مشکوٰۃ شریف، ۱:۳، حدیث ۵۱۴۴۔

Marfat.com

نیز فرمایا :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

گویا بندے کے لیے خدا کی طرف سے اعلان ہے کہ :

اے انسان ! تو اس کائنات میں تصرف کرنے والی واحد مخلوق تھا، کائنات کا ایک ایک ذرہ ہم نے تیری غلامی میں دیا تھا تو اگر میری اطاعت اختیار کیے رہتا تو کائنات کا ہر وجود میرے سامنے سرنگوں اور سربسجود رہتا۔ اے انسان ! تو اس کائنات میں خدا تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے ذریعے اس کا مقبول بندہ بننے آیا تھا لیکن تجھے کس نے گمراہ کردیا۔ تو نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ میرے تقدیری فیصلوں نے تجھے مجبور اور پابند بنا دیا ہے؟ تجھے قرآن و حدیث کی صورت میں ٹھیک ٹھیک کھلی اور روشن ہدایات دی گئی تھیں۔ تجھے بتا دیا گیا تھا کہ تو اپنے افعال میں مجبور اور مقید نہیں ہے۔ بلکہ اپنے افعال اور اپنے اعمال پر پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔ اسی اختیار کی بنیاد پہ تجھے تیری نیکی کا صلہ ملے گا اور برائی کی سزا دی جائے گی لیکن دنیا اور اس کی اندھی ہوس نے تیری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور تو اپنی خواہش کا غلام بن کر رہ گیا۔ تو اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے مسئلہ تقدیر پر ڈالتا رہا۔ قیامت کے روز تیرا کوئی عذر مسموع نہ ہوگا۔ اور تجھے اپنے کیے کی پوری پوری سزا مل کر رہے گی۔

ذخیرہ
محمد جمیل احمد شرقپوری نقشبندی مجددی
لاہور پاکستان

Marfat.com

Marfat.com

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی چند معرکۃ الآراء

تصانیف

تفسیر منہاج القرآن زیر تالیف

خطبات ... سیرت ... و دروس ... تصوف ... ترتیب و تدوین

(۱) تسمیۃ القرآن (تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم)
(۲) سورۂ فاتحہ اور تعمیر شخصیت
(۳) اسلامی فلسفۂ زندگی
(۴) اجزائے ایمان (حصہ اول)
(۵) اجزائے ایمان (حصہ دوم)
(۶) اجزائے ایمان (مکمل مجلد)
(۷) ایمان اور اسلام
(۸) فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
(۹) مناہج العرفان فی لفظ القرآن
(۱۰) بلا سود بنکاری (عبوری خاکہ)
(۱۱) منافقت اور اس کی علامات
(۱۲) سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
(۱۳) معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
(۱۴) اجتہاد اور اس کا دائرہ کار
(۱۵) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفۂ خودی
(۱۶) تاریخ فقہ میں ہدایہ و صاحب ہدایہ کا مقام
(۱۷) معارف اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم
(۱۸) شہادت توحید
(۱۹) اسلام اور طب جدید
(۲۰) اقبال اور تصور عشق
(۲۱) اسلام اور سائنس
(۲۲) تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب
(۲۳) حکمت استعاذہ (تفسیر اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم)
(۲۴) فلسفۂ تسمیہ (تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم)
(۲۵) معارف اسم اللہ
(۲۶) صفت رحمت کا شان امتیاز
(۲۷) عصر حاضر اور فلسفۂ اجتہاد
(۲۸) حصول مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی
(۲۹) پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج
(۳۰) قرآنی فلسفۂ تبلیغ
(۳۱) فطرت کا قرآنی تصور
(۳۲) پیغمبر انقلاب اور صحیفۂ انقلاب
(۳۳) عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم (وقت کی [illegible])
(۳۴) علم۔ توجیہی یا تخلیقی
(۳۵) دینی اور لادینی علوم کے اصلاح [illegible]
(۳۶) مغربی اور اسلامی تصور قانون کا تقابلی جائزہ
(۳۷) قرآنی فلسفۂ عروج و زوال
(۳۸) نص اور تعبیر نص
(۳۹) حضور صلی [illegible]
(۴۰) ق [illegible]

...uidance
... Will
...re
... Theory
...odern World

۵۲ _ Islamic Philosophy of Human Life
۵۳ _ Islam and Christianity
۵۴ _ Islam and Modern Medicine
۵۵ _ Finality of the Prophethood
۵۶ _ What Islam is
۵۷ _ Islamic Concept of Benevolence
۵۸ _ Islam & Criminality
۵۹ _ Legal Character Of Islamic Punishments
۶۰ _ Classification Of Islamic Punishments
۶۱ _ Legal Structure Of Islamic Punishments

اسلام کے علمی و عملی فقہی و قانونی اور اخلاقی و روحانی موضوعات پر پروفیسر صاحب کے قریباً ۳۰۰ مسودات ترتیب و طباعت کے مراحل میں ہیں۔ ملنے کا پتہ: ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور۔ فون: ۶۳۳۶۴ ـ ای پوسٹ [illegible] بالمقابل ہائی کورٹ لاہور فون ۵۲۰۹۶، المالک پلازہ B/6 نزد جہانگیر پارک ایمپریس مارکیٹ کراچی صدر فون [illegible]

Marfat.com